



وہ شہر

از

آئینہ اقبال احمد



وہ شہر

آئمۂ اقبال احمد  
ایم۔ اے (انگریزی)

ماز کتاب گھر شاندار مارکیٹ بازار چلی قبر وری

اشاعت اول ..... ۱۹۸۷  
 کتابت ..... امان مرزا  
 مطبوعہ ..... جمال پریس دہلی  
 قیمت ..... تیس روپے = 32/-  
 ناشر ..... محمد انوار

اس ناول کے تمام کردار و واقعات فرضی ہیں  
 کسی واقعہ یا کردار کی مطابقت محض  
 اتفاقیہ امر ہوگی۔

انتساب !

اپنے

تمام

تاریخیں

کے

نام۔ !

۱۵



انہی نوں میں گمانوں میں کیا جاں سے بھگی نہ جواد  
وہ جو چارہ گر گمانیں نہا سے زخم کیوں دکھاؤ

(سحر فرات)

شہر کے رئیس سیٹھ حامد علی کی شان دار کوٹلی کے وسیع و عریض  
ہال میں گہما گہمی کا عالم تھا۔ علاقے کے طول و عرض سے چیدہ چیدہ لوگ  
مدعو تھے۔ اپنی اکلوتی بیٹی کی امریکہ سے تعلیم مکمل کر کے واپسی کی  
خوشی میں انھوں نے ڈنر دیا تھا۔

رنگداز کا سیلاب اُمڈ آیا تھا۔ کہیں دبی دبی سرگوشیاں تھیں  
تو کہیں جاندار تھپے۔ کہیں بزرگ ایک طرف بیٹھے زندگی کے سنجیدہ  
موضوع پر محو گفتگو تھے تو کہیں جوان طبقہ لڑکیوں میں ہٹا ہٹ کر فحشا  
سے بے نیاز ایک دوسرے سے ہنسی مذاق میں مصروف نظر آتا تھا۔  
ہرمان تقریباً سبھی آچکے تھے۔

مینا حامد علی سفید مٹکی پہنے، ترشے بالوں کا خوبصورت اسٹائل  
بنائے معزز مہمانوں کی تواضع میں مگن تھیں۔



جوان طبقے کی نظریں گماہے گماہے اس پر پڑ جاتیں۔  
 کوئی نکماہوں ہی نکماہوں میں سراپتا۔ کوئی رشک سے دیکھتا۔ تو  
 کوئی ایک آدمہ جملہ بھی کہہ دیتا اس سے متعلق —  
 اپنی چند بے تکلف دوستوں کے درمیان گھری وہ اُن کی پُر لطف  
 باتوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔  
 مگر۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ چہرے پر کچھ بے چینی کے اثرات  
 نظر آنے لگے تھے۔

نکماہیں بار بار ہال کے بڑے دروازے پر اٹھ جاتیں۔  
 ”کیوں۔ خیریت۔؟ اس کی بے تکلف دوست ریتا نے  
 معنی خیز انداز میں پوچھا۔ امدیٹا حامد علی ایک ادا سے مسکرا دی۔  
 ”کس کی شامت آئی ہے۔؟“ ریتا مزید پوچھی۔ امدیٹا حامد علی  
 مزید اعتماد سے مسکرا دی۔

تھلی یا وردی ملازم کی ہمراہی میں زلیشان اندر داخل ہوا۔  
 لمبا نڈ چوڑے شانے، پرکشش مصیبت۔  
 موسم کے لحاظ سے بہترین سوٹ زیب تن کیے ہوئے تھے قدم رکھتا۔  
 وہ آگے بڑھ آیا۔

سیٹھ حامد علی بہ نفس نفیس اُس کی پذیرائی کو آگے بڑھے۔ اور  
 یٹنا حامد علی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔  
 دوستوں کو چھوڑ چھاڑ وہ کھلی اُسی طرف بڑھی۔

”تو یہ بات تھی۔“ رینا بولی۔

”دال نہیں گلنے کی۔“ سرین نے بال بچھے جھٹکتے ہوئے برکتہ کہا۔ لہجے سے کچھ تلخی، کچھ طنز جھلکتا تھا۔

”خاصی ادنیٰ چیز ہے۔“ نائیلہ کے لب و لہجے سے بھی نخوت عیاں تھی۔

”PROUD کہیں کا۔“ فرحانہ کی بھی کوششیں شاید ناکام مگئی تھیں۔

”یہنا قابو کر لے شاید۔“ رینا پھر بولی۔

”یہنا میں کوئی خاص بات ہے کیا۔؟“ فرحانہ نے جمل کر پوچھا۔

”یہ بھی رئیس کی بیٹی ہے۔۔۔ یہ بھی اکلوتی ہے۔ دونوں ایک

جیسے ہیں۔ اور پھر یہنا کی ادائیں۔۔۔“ رینا کے لہجے میں خوشامد تھی۔

اور پاس ہی سے۔ ایک چھوٹا سا۔ ہلکا سا۔ ہتھمہ اکبر۔

لڑکیوں نے گھوم کر ناگواری سے اس طرف دیکھا۔ ندین اکتیس

اپنی طرف دیکھتے پا کر مزید سنسن دی۔ اور لڑکیوں نے مزید ناگواری

سے رخ واپس موڑ لیا۔

”بڑی ڈھیٹ ہو۔“ فرزانہ نے آہستہ سے زرین کو ڈانٹا۔

”PROUD ہے، رئیس ہے، اکلوتا ہے۔ کیا فضول لگی ہوئی تھیں؟“

وہ اب بھی سن رہی تھی۔

”تو کہنے دو۔ تمہیں کیا۔“ فرزانہ نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

”یہ میں کون ذات شریف۔؟“ زرین نے سامنے نظریں دوڑا

ہوئے لاپرواہی سے پوچھا۔



”کسی بڑے ہائیردار کا پوتا ہے۔ باپ بھی اکلوتا تھا۔ خود بھی اکلوتا ہے۔ اور پھر سچ پوچھو تو ہے بھی بہت شاندار۔ وہ رہا۔“  
 اُس نے دور ہال کے آخری سرے کی طرف اشارہ کیا۔  
 لمبا قد۔ سحر کن پر سنیلٹی۔ وہاں موجود سب لوگوں میں وضع طور نمایاں۔  
 زین نے دیکھا۔ سیٹھ حامد علی اُسے جیسے ٹینا سے متعلق ہی کچھ بتا رہے تھے۔ ٹینا بہت متاثر نظر آ رہی تھی۔

مگر۔ ذیشان۔ وہ واقعی سیاٹ چہرہ لئے ہوئے تھا۔  
 ”ہے تو ٹھیک ٹھاک۔۔۔ وہ اُس کی ڈسٹنگ پر سنیلٹی سے انکار کر سکی۔ مگر۔ اتنا براؤڈ ہونے کی سمجھ نہیں آتی۔“ واپس رخ پھیرتے ہوئے دھیرے نیاز کی سے بولی۔

”واقعی متعجب ہے۔ یہ تو مانی ہوئی بات ہے۔ یہ جو گروپ ہے، پیچھے لڑکیوں کا۔ یہ سب شہر کی دولت مند لڑکیاں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے ہر ممکن کوشش کی ہے، اسے متاثر کرنے کی۔ مگر۔“ وہ مسکرا دی۔ ”دال نہیں اگلی۔“

”ہوں۔“ زین دھیرے سے بولی۔ ”مگر ایک بات اب بھی سمجھ میں نہیں آتی۔“

”کیا۔۔۔؟“

”کہ ان لڑکیوں کو اتنی کوشش کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی۔“  
 ”اب یہ تم اپنی سے پوچھ لو۔“ فرزانہ جل کر بولی۔

پھر سیٹھ حامد علی آگے بڑھ گئے قدرے۔ دوسرے ہمانوں کی طرف۔ ٹینا اکیلی اُس کے پاس کھڑی ہو گئی تھی۔  
 تبھی لڑکیوں کا یہ گروپ بھی کشاں کشاں وہاں پہنچ گیا اور پھر بات بے بات آخری قہقہے گونجنے لگے۔

کھانا لگنے کا اعلان ہوا تو سب میز کی طرف سمت آئے۔  
 "یہ لیجئے۔ سٹریٹیشن۔" ٹینا نے اُسے پلیٹ پیش کی۔  
 "THANK YOU" پلیٹ ملے کر اُس نے سنجیدگی سے کہا اور۔  
 ایک قدم دائیں چل کر جا کھڑا ہوا۔

"اپنی جاگیر پر رہ رہ کر آپ کی عادتیں بھی جاگیر دارانہ ہو گئی ہیں۔"  
 ٹینا کو جیسے کوئی مقناطیسی کشش پھر وہاں لے گئی۔  
 "ایسا نہیں ہے۔" اُس کا چہرہ، اُس کا لہجہ اب بھی سپاٹ تھے۔  
 "YOU DON'T SMILE" جیسے آپ کو ڈر ہو کہ آپ یوں نہیں  
 رہیں گے۔" وہ پھر بولی۔

"یہ بھی نہیں ہے۔" کانٹے سے دوست کا پس منہ میں ڈالتے  
 ہوئے وہ پھر اُسی سنجیدگی سے بولا۔ اور ٹینا کو اُس کی یہ سنجیدگی  
 اپنی تو میں معلوم ہوئی۔

کیسا آدمی تھا۔؟ جب سے آیا تھا وہ ساتھ ساتھ تھی۔ مگر عجیب ہے  
 ٹھیک سے دیکھا بھی ہو ویسے نہ سہی کسی سہی کی بات پر سہی سہی۔ اگر اُس  
 کے چہرے پر سکرابٹ ابھری ہو۔ کرٹھی بھی کوئی چہرہ سوتی ہے آخر۔!



رات پاپا اُس کی تعریفوں میں زمین آسمان کے قلابے ملتا رہے  
تھے۔ جہاں تک دولت کا سوال ہے، وہ اُس کی آن بان سے ہی  
ظاہر تھا۔ پرسنیلٹی۔

اُس نے ایک بھر پور نظر اس پر ڈالی۔

جھوٹ سے نکلتا قد۔ چوڑے شانے۔ مضبوط جسم کھلتا گندنی  
رنگ۔ پرکشش نقوش۔ ڈارک براؤن گھنٹیاں بے حد خوبصورت بولتی  
آٹکھیں۔ بے نیازی سے سامنے جملے کوئی GREEK GOD جیسے  
زمین پر اتر آیا تھا۔

مگر۔ وہ تو یوں کھڑا تھا جیسے ٹینک کے وجود کا احساس ہی نہ ہو۔  
اپنے ہی وطن تو کیا اُس سے تو امریکن لڑکے بھی دتا ٹرتھے۔ نیکم اُس کا کلاس  
فیلو۔ آج ڈنر پر بھی مدعو تھا۔ وہ تو اس پر جان دیتا تھا۔  
”ہونہ۔“ کیا سمجھتا تھا اپنے آپ کو۔ اُس نے سر جھٹکا۔ ایک  
پل کو دل میں آیا۔ چلی جائے وہاں سے۔

مگر پھر۔ خیالی آیا۔ جب سے جہاز سے اُتر رہی تھی۔ اس وقت تک  
پاپا براہِ راست کاخ کی تعریفیں کئے جا رہے تھے۔ وہ سمجھتی تھی ایسا کیوں  
تھا۔ پاپا اُس کے لئے کسی اچھے МАТЧ کی فکر میں تھے۔

مگر۔ یہاں تو بات کا جواب ہی سوائے ”ہوں ہاں“ کے  
نہیں مل رہا تھا۔

”آپ بہت کم بولتے ہیں“ ٹینک نے کہا۔

"YES" اُس کی گھنی پلکوں کو جنبش ہوئی۔ "مجھ کو زیادہ

بولنے کا عادت نہیں ہے۔"

ٹینا چونکی۔ اُس کا لب و لہجہ بختونیت لئے تھا۔

اُس کی اسٹون گرے آنکھیں دل میں اُترتی تھیں۔ اور۔ اور

جس انداز میں اس نے اردو کے لفظ بمشکل جوڑ کر ادا کئے تھے۔ وہ انداز۔ قاتلانہ تھا۔

"YOU SPEAK PUSHTO"۔ ٹینا دلچسپی لیتے ہوئے بولی۔

"YES"۔ ہمارا مادری زبان پشتو ہے۔ ایک مختصر سی دلفریب

مسکراہٹ اُس کے پرکشش ہونٹوں کو چھو گئی۔

اور ٹینا کو اکھڑ سا، متورد سا یہ گریک گاڑ بہت اچھا لگا۔

"کل کلب میں ڈانس پارٹی ہے۔ آپ بھی آئیے۔" ٹینا نے

اُسے دعوت دی۔

"آئے ایم سوری۔ ہمارا پاس وقت نہیں ہے۔" اُس کی

سنجیدگی پھر ہیٹ آئی تھی۔

اور ٹینا کے چہرے پر مایوسی جھلک آئی تھی۔

"آپ بہت معروف آدمی لگتے ہیں۔"

"ہاں۔" اُس نے مختصراً کہا۔

"مجھے گاؤں دیکھنے کا بہت شوق ہے۔"

"I SEE"۔ اُس نے کہا۔ اور ٹینا کے چہرے پر تاریک سا سایہ بھرا۔



وہ اُسے گاؤں دکھانے کی پیش کش تو کر سکتا تھا۔  
 ”آپ دکھالائیے تاکسی دن۔“

”I'LL ASK MY FATHER“ وہ ضرور بندوبست کر دے گا۔ اُس کی سنجیدگی اب بھی برقرار تھی۔ اور ٹینا کو لگتا۔ وہ مزید یہاں نہ رُک سکے گی۔

”میں ذرا اپنی فرینڈ کے پاس ہواؤں۔“  
 ”SURY“ ذیشان نے کہا۔ اور پاس کھڑے عمران صاحب کی طرف رخ کر لیا۔

زرین اور فرزانه میز کے اُسی سرے پر کھڑیں کھانے میں مصروف تھیں۔

”دیکھا تم نے۔ ٹینا حامد علی بھی ماتا کھا گئی۔“ فرزانه نے آہستہ سے زرین کے کان کے پاس کہا۔

”اچھا ہوا۔ کیوں اتنا سر چڑھایا تھا۔ پتہ نہیں انہیں کیا نظر آیا ہے مجھے تو کوئی خاص بات نظر نہیں آئی اس میں۔“ اُس نے ایک سرسری نظر اُس پر ڈالتے ہوئے لاپرواہی سے کہا۔ اور عمران صاحب کے باتیں کرتے کرتے ذیشان کے کان کھڑے ہو گئے۔

”آہستہ بولو۔“ فرزانه نے ذیشان کو متوجہ دیکھ کر اُسے تنبیہ کی۔  
 ”کیا مصیبت ہے۔ تم سب اتنی IMPRESS کیوں ہو۔“

وہ الجھ کر بولی۔

زندگی میں شاید پہلی بار اپنے لئے اُس نے ایسے الفاظ سنے تھے۔  
 نہ چاہتے ہوئے بھی اُس نے نظریں اٹھا کر اُسے دیکھا۔  
 جو کلیٹ رنگ کے سادے سے لباس میں بلبوس۔ سترہ۔ اٹھارہ  
 سال کی نازک سی دہلی پتلی۔ گلابی شفاف رنگت پر بے حد خوبصورت  
 نقوش لئے ایک لڑکی اپنے ڈارک براؤن لمبے گھنے بال گردن پر سے  
 پیچھے جھٹکتے۔ پرکشش چہرے پر بیزاری اور تمسخر کے ملے جلے تاثرات  
 لئے اُسے دیکھ رہی تھی۔

اُس کے ساتھ والی لڑکی کی خشک جانی پہچانی سی تھی۔ مگر اس  
 آج پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

نظریں اپنی پلیٹ پر جم کر وہ دوبارہ عمران صاحب کی طرف  
 متوجہ ہوا۔ مگر کان اب بھی اسی طرف لگے ہوئے تھے۔  
 "پلین زرین۔" فرزانہ حقیف سی بولی۔

"کیا ہے۔۔۔؟"

"وہ دیکھ رہا تھا ابھی۔" فرزانہ کی سرگوشی بھی زلیشا کی

جیبی نہ رہی۔

"I DON'T CARE" زرین مزید لاپرواہی سے بولی

اور بڑے آرام سے میز کی طرف پٹھ کر کے ایک خاتون سے  
 باتوں میں لگ گئی۔

ایک پل کو ذیشان کو اپنا رنگ بدلتا ہوا محسوس ہوا۔



اپنی یادداشت میں آج پہلی بار اُس نے اپنے لئے یہ لہجہ اور  
انداز دیکھا تھا۔

کھانا کھایا جا چکا ہے۔

ذیشان حسبِ عادت سب سے پہلے جانے کے لئے اٹھ  
کھڑا ہوا۔

سیٹھ حامد علی کے ساتھ ساتھ ٹینا اُسے الاداع کہنے  
باہر تک آئی۔

ذہن پر بوجھ سائلے وہ پوریج تک آیا۔  
بادردی ڈرائیور نے اُس کے لئے سیاہ چمکتی مرسڈیز کا  
دروازہ کھولا۔

اُس نے سیٹھ حامد علی سے مصافحہ کیا۔

”بائے۔ بائے۔“ ٹینا نے پتلی نازک انگلیاں ہلائیں۔

”بائے۔“ اُس نے حسبِ عادت سنجیدگی سے کہا۔

اور پُرکشش چہرے پر تاریک سا سایہ لئے وہ گاڑی  
میں جا بیٹھا۔

دھوپ ڈھل چکی تھی۔ لال نارنجی رنگ بچھے سے جھانکتے  
 ہوئے شفاف سرمئی پہاڑ کو مزید سحر انگیز بنا رہا تھا۔ نیلگوں آسمان  
 پر ایک لاد تنہا بادل کا سہما سا ٹکڑا اپنا سہری دامن سمھلے مخالف  
 سمت لپک رہا تھا۔ ادنیٰ نیچی ناہموار پتھر ملی زمین پر اُگی خود رو  
 جھاڑیاں تیز سوراکی زد میں تھیں اور نالے کا پانی اپنے مخصوص  
 انداز میں رواں دواں تھا۔

ڈرائیور، ناظم اور کریم بابا اُس کے شکار کئے ہوئے ہرن جیب  
 میں رکھ رہے تھے۔

سامنے ہی ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھا وہ مگ میں سے گھونٹ  
 گھونٹ گرم اسٹرونگ کافی پی رہا تھا۔ اُس کے شکاری کتے اُس  
 کے آس پاس منڈلا رہے تھے۔

پرندوں کے غول اُس کے سر کے اوپر سے سرسراتے ہوئے اپنے



آشیانوں کی سمت بڑھے تو وہ چوسکا۔ سردی کافی ہو گئی تھی۔ مگ  
 خالی کر کے اُس نے پتھر پر رکھا۔ جیک بڑی دیر سے اُس کے پوٹ  
 چاٹ رہا تھا۔

"SO NICE OF YOU JACK, THANK YOU" اُس نے پیار سے  
 جیک کی مکر پر ہاتھ پھیرا۔ اور قریب ہی پیٹھے ساٹا کا سراپنے  
 پہلو سے لٹکالیا۔

"پتھر ہے؟" جانے کیسے اُسے کچھ سال ماضی کی گرل فرینڈ کے اُس  
 سے متعلق کہنے لگے۔ ریمارکس یاد آئے۔

"مغز رہے؟" اُسے بابا جان کی سکرٹری کی بات یاد آ گئی۔

"مجھے تو کوئی خاص بات نظر نہیں آتی اس میں؟" اُسے اچانک

رات ڈنروالی لڑکی کا لاپرواہی سے ادا کیا گیا جسدہ یاد آ گیا۔

"I DON'T CARE" اُسے مزید یاد آیا۔ ساتھ ہی ایک بیہوش

سی مسکراہٹ اُس کے لبوں کو چھو گئی۔

آہٹ پر اُس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

ناظم اس کہنے اور کوٹ لئے کھڑا تھا۔

"او۔ کے۔ فرینڈس؟" کتوں کو تھپکتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

ناظم نے آگے بڑھ کر شکاری لباس کے ادب پر اُسے اور کوٹ

پہنایا۔ پتھر جیسے ابھی تھوڑی دیر قبل اُس کا اتارا ہوا چمڑے کا

دستاویز سے کھلایا۔



"THANK YOU" درستانہ پہنتے ہوئے وہ آگے بڑھا۔  
 ڈرائیور اُس کے لئے جیب کا دروازہ کھلے کہ ٹرا تھلا وہ  
 اندر جا بیٹھا۔

تبھی باقی ملازم بچھے تیار کھڑی جیب میں جا کر بیٹھے۔ اُس کی  
 جیب چل پڑی تو دوسری بھی بچھے بچھے چل پڑی۔  
 ناہموار پتھر ملی سڑک پر سے ہوتے کافی دیر کے بعد جیب  
 پکٹی سڑک پر آئے۔

اب وہ اپنے گھاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ یہ دادا جان مرحوم  
 کی جاگیر تھی۔ اُس کا چھوٹا سا خاندان تھا۔ بابا جان، دادا جان  
 کے اکلوتے لڑکے تھے۔ خدانے بابا جان کو ایک بیٹی بھی دی تھی۔  
 بابا جان کی شادی اپنے عزیزوں میں ہی ہوئی تھی۔ مگر وہ  
 چھوٹا سا تھا کہ اتنی جان اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ وہ خود بھی اکلوتا  
 تھا۔ بابا جان نے دوسری شادی نہیں کی۔ ایک ماما کی مدد  
 سے ماں اور باپ دونوں بن کر اُسے پالا۔ پھر بچہ کی شادی  
 اُن کے کزن سے ہوئی تھی۔ ایک ہی بیٹا تھا۔ ناصر۔ ابھی سات  
 سال کا ہی ہوا تھا کہ پھر بھی اور پھر بابا جان کا رینکسڈنٹ  
 میں جاں بحق ہو گئے۔

چھوٹا سا ناصر دنیا میں اکیلا رہ گیا تو بابا جان اُسے اپنے  
 ساتھ گھاؤں لے آئے۔



ادریوں آٹھ سالہ ذیشان اور سات سالہ ناہرنے آٹھٹی  
پر وکس پائی۔

ذیشان نے سینئر کیمبرج کر لیا تو بابا جان نے اُسے ہائر اسٹیڈنر کے  
لئے لندن بھیج دیا۔ ناہر چند دن بہت اُداس رہا۔ مگر لاابالی طبیعت  
پائی تھی۔ چند دن میں بہل گیا۔ اور اگلے سال جب اُس کے سینئر  
کیمبرج کر لینے پر اُسے حبیب پروگرام لندن بھیجنا چاہا تو وہ صاف ٹکر  
گیا۔ اُس نے تو پائیلٹ بننا تھا۔ ایئر فورس جوائن کرنی تھی۔ بابا جان  
نے ادب نہ سمجھائی۔ ذیشان نے بڑے بڑے لاپنج خطوں میں دیئے۔  
مگر پائیلٹ بننے کا بھوت کچھ ایسا سر پر سوار تھا کہ ولایتی میموں  
کا لاپنج بھی اُسے نہ اتار سکا۔ لہذا ایف ایس سی کرنے کے بعد وہ تو  
سدھارا ایئر فورس اکیڈمی اور ذیشان لندن میں پڑھتا رہا۔  
دونوں میں بے حد پیار تھا۔ ایک ایک پل کی ہر ایک دوسرے کو  
یوں پہنچاتے جیسے ہزاروں میل دور نہیں، دس میل پر بیٹھے  
ہوں۔

وقت گزرتا رہا۔ ناہرنے کمیشن لی۔ پائیلٹ آفیسر ابھرا فلائنگ  
آفیسر بنا۔ ذیشان نے لندن یونیورسٹی سے ہنرس ایڈمنسٹریشن میں  
ماسٹرز کی ڈگری لی۔

ملک واپس پہنچا تو ایئر پورٹ پر بابا جان کے ساتھ ساتھ  
ناہر بھی تھا۔

اور۔ تبھی شاہان احمد نے محسوس کیا۔

جہاں ناصر اپنے بچپن کی طرح ایک پل نچلا نہیں بیٹھتا تھا۔  
وہاں ذیشان ایک سنجیدہ اور مدبر نوجوان میں ڈھل گیا تھا۔  
اگر شاہان احمد کے لئے کہا جاتا تھا کہ اپنے والد مرحوم خاقان احمد  
سے جاگیر دارانہ رعب اور سنجیدگی اُنھیں ورثے میں ملی ہے۔ تو  
ذیشان نے دادا اور باپ دونوں کا تہرہ اور سنجیدگی سمیٹ  
لئے تھے۔

اور پھر ذیشان نے جس سنجیدگی سے اتنی بڑی زمین داری اور  
وسیع کاروبار کو سنبھالا دیا۔ شاہان احمد کو محسوس ہوا اُن کی محنت  
بے جا نہیں گئی۔ اکلوتی اور بن ماں کے اولاد کو کئی سال تک ملک  
سے باہر رہنے دینے کے بعد بھی اُنھوں نے کچھ گھوٹا نہیں تھا۔ پایا تھا۔  
بلکہ اتنا کہ اب موت کا بلاوا آجاتا تو سکون سے بلیک کہہ سکتے۔

ناصر چھبیس سائیس کے لگ بھگ تھا۔ کچھ عرصہ قبل اصول پرست  
اور جاہر ماموں کے سامنے کچھ ایسا عرض حال سنایا کہ اُسے اُس کی  
پسند کی لڑکی سے شگنی کی اجازت مل ہی گئی۔ کچھ مصلحت بھی تھی کہ  
کسی طرح بے چین طبیعت کسی ایک تکتے پر ٹک جائے تو اچھا ہے۔  
لڑکی کا گھرانہ اچھا تھا۔ کل کلاں کو کسی غلط جگہ پھنس جاتا تو اُن کے  
دقار کو یقیناً ٹھیس پہنچتی۔

مگر ذیشان کے لئے ایسی کوئی رعایت نہ تھی۔ اُس کی دہن تو



انھوں نے سوچا تھا خود اپنی پسند سے لائیں گے۔ اور جہاں  
شاہانِ احمد کی خواہش تھی کہ خود اپنی زندگی میں اُس کا گھر بستا  
دیکھیں اور اسی کوشش میں ان دنوں سرگرمی سے کوشاں تھے۔  
وہاں تاہر بھی اُسے ہفتہ وار کسی نہ کسی لڑکی کو اپنا لینے کے مشورے  
ہر خط میں دیتا۔

مگر ذیشان۔

اُسے تو جیسے اس پہلو پر سوچنے کا وقت ہی نہ ملتا تھا۔ یا پھر  
کوئی لڑکی اُس کے معیار پر پوری نہ اُترتی تھی۔

لندن میں بھی اُسے لڑکیاں بہت پسند کرتی تھیں۔ وہ بھی  
اُن سے بہت اپنائیت سے ملتا۔ مگر بات صرف دوستی تک ہی  
تھی۔ آٹے نہ بڑھ سکی تھی۔ اُن لڑکیوں میں کئی خوبیاں تھیں۔  
جن کا اُسے اعتراف تھا۔ مگر کسی سے قلبی لگاؤ جانے کیوں اُسے نہ  
ہو سکا تھا۔

اپنے ملک میں اُسے لڑکیوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ سب  
اونچے گھرانوں کی لڑکیاں تھیں۔ شکلوں کی بھی بُری نہیں تھیں۔ وہ  
اُن سب کو اچھا بھی سمجھتا تھا۔ اُن میں کوئی ایسی بُرائی بھی نہ تھی۔  
بلکہ اُسے تو بعض اوقات افسوس بھی ہوتا، اُن کے معیار پر اپنے  
پورے نہ اُترنے کا۔

جیب پکی سڑک چھوڑ کر بائیں جانب شگل کی سڑک پر ہولی۔



تو وہ چڑکا۔

وہ لوگ گاؤں جانے والی سڑک پر پہلے تھے۔ دونوں طرف تا حد نظر لہلہاتے کھیت تھے، باغات تھے، یہ انکی ملکیت تھی۔ خدا تعالیٰ نے انھیں انسی نعمتوں سے نوازا تھا۔

دور سقید اونچی محل نما عمارت اُن کی حویلی تھی۔

وہ مزید آگے بڑھے۔

بائیں طرف گھوڑوں کا اصطبل تھا۔ ابھی ہفتہ بھر پہلے اس میں نئے عربی گھوڑے کا اضافہ ہوا تھا۔ کتنا مضبوط اور خوبصورت گھوڑا تھا۔ دائیں طرف بہت بڑے احاطہ میں گائے بھینس تھیں۔ دودھ کہیں بچھے سے ابھرتا پولٹری فارم تھا۔ پھر ٹینس کورٹ تھا۔ گولف کورس تھا۔ سرونٹ کوارٹرز تھے۔ اور اُن سے بھی پرے اُن کے مزارع چھوٹے بڑے کچے پکے گھسروں میں آباد تھے۔ کتنی خوبصورت کائنات تھی یہ اُن کی۔ کتنا پیارا تھا اسے اپنے گاؤں سے۔ کتنا سکون ہوتا تھا یہاں۔

حویلی کے گرد تفصیل نما اونچی دیوار میں بنے بہت بڑے آہنی گیٹ میں داخل ہو کر جیب نازنگی کے درختوں کے درویدہ قطار میں سے بحری کی سڑک پر چلتی حویلی کے آگے بنی بڑی سی پورچ میں آکر رُک گئی۔

”ہیلو شان“ جیب سے اُترتے ہی اُس کے کانوں میں



ناصر کی آواز پڑی۔

”ہیلو۔“ وہ خوشی سے سرشار ہو گیا۔ ”کب آیا۔؟“ اُسے گلے لگانے کو دونوں بازو پھیلائے وہ آگے بڑھے۔

”سوری۔ پہلے گردھباڑ لو۔ بن مانس نظر آرہے ہو۔“ سمجھے بیٹے ہوئے اُس نے گلے ملنے سے صاف انکار کر دیا۔

”مجھے زبردستی بھی ملنا آتی ہے۔ دو قدم آگے بڑھ کر شان زبردستی اس کے گلے جا لگا۔

”اب اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی ہنلاؤ۔“ ناصر اُس سے لپٹے ہوئے بولا۔

”ضرور۔ مگر اپنے اپنا دسل کو دیکھ لوں۔“ اس کو اپنی گھوڑی کا خیال راستے میں کئی بار آیا تھا۔ تم بھی آؤ۔“

”نا بابا۔ میں اندر چلا۔ تم دیکھ آنا۔ مگر پلیر بیٹھ مت جانا

رہیں۔“

”او۔ کے ڈیئر۔!“

اور شان لمبے لمبے ڈگ بھرتا اصرطبل کی طرف چل دیا۔

اصطبل میں داخل ہوتے ہی اُس نے دسل کر دسل دی چٹنگ  
 کردہ مڑی اور جواب میں سر ہلاتے ہوئے ہنہنادی۔  
 ”ہیلو ڈارلنگ کیسا طبیعت ہے“ آگے بڑھ کر اُس نے اُس کا  
 سر پیار سے گلے لگا لیا۔

پھر اس کی گردن تھپتھپائی۔ پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے اُس  
 کے گرد پورا چکر کاٹا۔ وہ بے حد خوش نظر آ رہا تھا۔  
 ”لڑکا چاہئے مائے لڑنمانہ نہیں۔ یاد رکھنا“ دوسری طرف  
 گھوم کر بازو اُس کی گردن میں ڈال کر اپنا حال اُس کے سر سے رگڑتے  
 ہوئے اُس نے اُس کے کانک پاس کہا۔ پھر اُس کی خوراک کا معائنہ  
 کیا۔ جگہ کی صفائی دیکھی۔

پھر وہ پاس بندھی سیاہ مائل براؤن چمکتی مڈنائٹ کے پاس گیا  
 کتے پر وقار لگ رہی تھی وہ۔ پھر وہ سنو اور ریو کے پاس گیا۔



بکھر تھنڈے پاس آیا۔ کتنا پُر جلال تھا۔ اُس کے پاس سے گھوم کر  
 وہ دوسری طرف بابا جان کے نئے غریبی گھوڑے کے پاس آیا۔ پھوٹے  
 ورن کا یہ سفید گھوڑا کتنا مضبوط تھا۔ اُس کی گردن کے لمبے لمبے بالوں  
 پر ہاتھ پھیرتا ایک نظر سب کی خوراک پر۔ اُس پاس ڈالتا۔ مطمئن  
 سا نظر آتا۔ وہ باہر نکل آیا۔

”ہو گئے فارغ۔“ اُسے بیڈ روم میں داخل ہوتے دیکھتے ہی  
 ناصر گویا ہوا۔

”یار دوسل کا بچہ ہونے والا ہے نا۔“ وہ معذرت کے انداز  
 میں بولا۔

”وہ تو ہو جائے گا۔ یہ بتاؤ خود کب بچہ دے رہے ہو۔“ صوفی پر  
 لمبا لیٹا جلتی آگ میں وہ ایک ادور لکڑی جھونکتا لاپرواہی سے بولا۔  
 ”ہنا کر آتا ہوں۔ پھر دے دے گا۔“

”ویسے بن مانس صاحب۔“ ناہرنے اُسے شکاری لباس میں ملبوس  
 سر سے لے کر پاؤں تک تو صفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس لباس  
 میں۔ اس قدر قامت کے ساتھ اچھے لگا رہتے ہو۔  
 ”ہمہارے نظر میں۔“

”میری ہی نظروں میں اور کیا۔ لڑکیوں کی نظروں میں تو بن مانس  
 ہی لگو گئے۔ ناہرنے کہا۔

”اس لئے تو ایسا ارادہ نہیں ہے۔“ اُس نے ہاتھ آگے بڑھا کر



ناہر نے اُسے کوٹ کی آستین اتارنے میں مدد دی۔ اُس نے دوسرا بازو بڑھایا۔ اُس نے وہ بھی کھینچ کر اتار دیا۔ ادویوں اور کوٹ وہیں چھوڑ کر وہ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا۔

ناہر تھوڑی دیر یوں ہی بے چین سا آگ تا پتار رہا۔ پھر کریم بابا گرم گرم کافی کے ساتھ دھیر سا راز رکے فروٹے آئے تو قدرے مطمئن ہوا۔

اور گرم پانی کا شاور لیتے لیتے شان دھیرے سے مسکرا دیا۔

یقیناً ناہر کو پتہ چل چکا تھا کہ بابا جان دس دن کے لئے باہر گئے ہیں بے پناہ گھبراتا تھا ناہر ان کا سامنا کرنے سے تھکے ہی اتنے بائیں اور با اصول قسم کے۔ ہر بات، ہر کام اپنی مرضی کے مطابق چاہتے تھے۔ زبان سے انکار تو ایک طرف، وہ لوگ تو دل میں بھی اُن کی مرضی کے خلاف کوئی خیال نہیں لاسکتے تھے۔ پچھلے دنوں ناہر کے یہاں آنکھوں بچے کی پیدائش پر اُس کی اچھی خبر اس لئے لی تھی کہ ساتویں پر اُسے باقاعدہ بلا کر آنکھوں نے آئندہ مزید بچے پیدا نہ کرنے کی تنبیہ کی تھی۔

خودشان کی بھی تو جان جاتی تھی سامنا کرتے وقت کہیں کوئی بات اُن کی مرضی، اُن کی طبیعت یا پھر اُن کے موڈ کے خلاف نہ کہہ جائے۔ باقاعدہ ڈانٹ پڑ جاتی تھی۔ اور جہاں شان اکثر اُن کا سامنا کامیابی سے کر جاتا وہاں ناہر اکثر و بیشتر بدحواسیاں کر بیٹھتا۔ کچھ اپنی طبیعت کے ہاتھوں۔ کچھ گھبراہٹ کے مارے اور یوں اکثر اُن کا سامنا کافی سے کراتا۔



بچپن بھی ایسا ہی گزرا تھا۔ ناصر بھی نچلانا بیٹھتا تھا۔ اُس کی طبیعت نے  
 سمجھی کوئی پابندی گوارا نہ کی تھی۔ اور تو اور۔ جہاں شان کو یا با جان کی  
 سخت ہدایات کے مطابق صبح کا لباس الگ نسبتاً ہلکے رنگ کا۔ شام کا  
 الگ گہرے رنگ کا اور رات کا الگ نائٹ سوٹ تبدیل کرایا جاتا۔ ناصر  
 وہاں بھی ڈاج دے جاتا۔ ناشتہ سے قبل صبح کی داک سے اُس کی روح  
 فنا ہوتی۔ ناشتہ، پنچ اند ڈنر کے مقررہ اوقات اس کی طبیعت پر بوجھ  
 تھے۔ کھانے کی میز پر کھانا شروع کرنے سے قبل بے را اُس کے گلے میں لپیرن  
 باندھتا تو وہ چڑ جاتا۔ مختلف کوڈس SERVE ہوتے تو اُس کو  
 گھٹن محسوس ہوتی۔

بات یہ نہیں تھی کہ پھوپا جان کے یہاں دھن دولت کی کمی تھی۔ فرق  
 صرف اتنا تھا کہ وہاں ”اصول“ نہیں تھے، پابندیاں نہیں تھیں۔  
 اور۔ پھر شان، ان اصولوں کا، ان پابندیوں کا غادی سرچکا تھا۔  
 صبح کی داک اُس کی طبیعت کا خاصہ بن چکی تھی۔ اور رات کو اگر اُسے نائٹ  
 سوٹ نہ بدلوا یا جاتا تو اُسے یقین نہ آتی۔ اُسے مقررہ اوقات پر کھانے کی  
 عادت تھی اور بے را اُسے SERVE نہ کرتا تو اُسے اکھیں ہرتی۔  
 بابا جان کا سامنا کم ہی ہوتا۔ رات ڈنر ٹیبل پر یا پھر رات سوتے  
 وقت۔ وہ بھی جب گاؤں میں موجود ہوتے۔ در نہ اکثر کاروبار کے  
 سلسلے میں باہر ہی رہتے۔

بات یہ نہیں تھی کہ وہ سخت طبیعت کے تھے۔ یا پھر سمجھی اکھیں

مارا پیٹا تھا۔ ایسا تو شاید کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔ انھیں شان سے بے حد پیار تھا۔ ناصر کو وہ اپنی اکلوتی بہن کی واحد نانی سمجھ کر سینے سے لٹکتے ہوئے تھے۔

بات تھی تو ان کی بار رعب طبیعت کی۔ مدبر شخصیت کی! انھیں اپنے اصول عزیز تھے۔ پرانی قدروں سے محبت تھی۔ باپ دادا کے وقار کو مقدم سمجھتے تھے۔ اپنی آن سے پیار تھا۔

انھیں شان سے بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔ ناصر کو بھی اتنا ہی COMPETENT دیکھنا چاہتے تھے اور ایسا تبھی ممکن تھا کہ وہ دونوں اُن کی طرزِ زندگی کو اپناتے۔ ان کے اصول پر چلتے۔

اور پھر۔ جہاں ناصر کبھی کسی پابندی کا پابند نہ رہا تھا۔ وہاں یہی پابندیاں شان کی عادتِ ثانیہ بن چکی تھیں۔

دونوں ہوٹل بھولے گئے۔ وہاں سے شان لندن گیا اور حسبِ مرضی ناصر ایئر فورس سببا جانے یہاں بھی اُسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ مگر سختی نہیں برتی تھی۔ ایئر فورس جوائن کرنا ان کے وقار کے منافی نہ تھا۔

مگر جب ناصر نے سینہ کے لئے بابا جان کو براہِ راست مخاطب کرتے ہوئے خط لکھا تو شان سمجھ گیا۔ ناصر دلدل کے ہاتھوں دیوالیہ ہو گیا ہے۔ درنہ ناہر اور ایسی جرات بابا جان کی خدمت میں؟ اور پھر اُسے اجازت بھی ملی تو صرف اس لئے کہ لڑکی کا خاندان اچھا تھا۔ ورنہ تو ایسا ممکن نہ تھا۔

دیے ایک بات ہر در تھی۔ ناصر کی ادٹ پٹانگ عادتوں کی وجہ سے



بابا جان تک کے اصولوں میں لچک پیدا ہو جاتی

اور شان اپنی سنجیدہ طبیعت سے بابا جان کے اصول اپنے لئے مزید سخت بنا گیا تھا۔ وہ نافر سے کم سنجیدہ اور شان سے سنجیدہ تر کاموں کے متوقع رہنے لگے تھے۔

اُس کے بیڈ روم میں شاید فون کی گھنٹی بجی تھی۔ وہ چونکا۔ اور پھر جلدی جلدی صابن اُتارنے لگا۔

ڈرلنگ روم میں آکر ڈھیلے ڈھالے گرم کپڑے پہنے۔ ڈھیلے سا ہی نرم سا سوانٹ پہنا۔ پاؤں میں گرم ادنی جرابیں پہنیں۔ سر ایک بار اور تولیے سے رگڑا۔ برش کیا اور سلیر پہنے ہوئے کمرے میں گھس آیا۔  
”کس کا فون تھا۔؟“ آگ کے پاس آتے ہوئے وہ نافر کے مقابل صوفے پر بیٹھ گیا۔

”میں نے نہیں اٹھایا۔“ وہ لاپرواہی ڈرائے فردٹ کھانے میں مصروف رہا۔

”اوہ۔ بابا جان کا ہوا پھر؟“ وہ پریشان ہو گیا۔

”اسی لئے تو نہیں اٹھایا نہ خوردار۔“ وہ مزید لاپرواہی سے بولا۔

”وہ پریشان ہو رہا ہو گا کہ میں کیوں موجود نہیں ہوں۔“

”تم ابھی شکار سے واپس نہیں آئے۔“ وہ تھیلی میں بادام اور کشمش

ہموزن ملائے ہوئے۔ تولتے ہوئے۔ منہ کی طرف اچھالتے ہوئے بولا۔

”جناب۔ پہلے باہر ناظم نے رسیو کیا ہو گا۔ اور جب اس نے بتلایا ہو گا



کہ میں شکار سے واپس آچکا ہوں، اُس کے بعد ہی بابا جان نے ناظم کو کہا ہر گھماکہ میرا فون ملا دے۔

”ہوں“ وہ بھی سوچ میں پڑ گیا۔ اور شان نے قریب ہی رکھے ہوئے فون پر بابا جان کے نمبر ڈائل کر دیئے۔

”جی۔ بابا جان۔ آپ کا طبیعت کیسا ہے۔ جی میں ہمارا ہاتھ WAS  
IN THE BATH ROOM۔ سوری بابا جان آپ کو زحمت ہوا۔ جی۔ جی۔  
جی نامر بھی آیا ہوا ہے۔ جی ہاں.....“

”میں باتھ روم میں ہوں۔“ اور نامر جھٹ اٹھ کر باتھ روم میں جا گھسا۔  
”یس بابا جان۔ جی وہ باتھ روم میں ہے۔ میں اس کو کہہ دے گا۔“

یس۔ IT WAS WONDERFUL۔ دوہرن لایا ہوں۔ آپ پندرہ  
دن بعد آئے گا۔ بے جاؤں گا۔ ٹھیک ہے۔ ذیشان کنٹریشنز پر اچھا  
ٹھیک ہے DON'T WORRY اور کے گڈ نائٹ“ اُس نے ریسور کرڈل پر  
رکھ دیا۔ اور نامر جب لگا کر صوفے پر براجمان ہو گیا۔

”کیسے ہیں ماموں جان۔؟“ وہ بھنی مونگ بھلی منہ میں ڈالتے ہوئے  
بے نیازی سے پوچھنے لگا۔

”ٹھیک ہے۔ تمہارا پوچھ رہے تھے۔“  
”کب آرہے ہیں۔؟“ نامر نے پوچھا۔  
”پندرہ دن بعد۔“ شان نے کہا۔

”گڈ۔“ اُس نے جیسے نجات کی سانس لی۔ اور شان خوبصورتی سے مسکرایا۔



کہ میں شکار سے واپس آچکا ہوں، اُس کے بعد ہی باباجان نے ناظم کو کہا ہر گھنٹہ میرا فون ملا دے۔

”ہوں“ وہ بھی سوچ میں پڑ گیا۔ اور شان نے قریب ہی رکھے ہوئے فون پر باباجان کے نمبر ڈائل کر دیئے۔

”جی۔ باباجان۔ آپ کا طبیعت کیسا ہے۔ جی میں ہمارا ہاتھ WAS IN THE BATH ROOM۔ سوری باباجان آپ کو زحمت ہوا۔ جی۔ جی۔ جی نامہ بھی آیا ہوا ہے۔ جی ہاں.....“

”میں باتھ روم میں ہوں۔“ اور نامہ جھٹ اٹھ کر باتھ روم میں جا گھسا۔

”یس باباجان۔ جی وہ باتھ روم میں ہے۔ میں اس کو کہہ دے گا۔“

یس۔ IT WAS WONDERFUL۔ دوہرن لایا ہوں۔ آپ پندرہ دن بعد آئے گا۔ بے جاؤں گا۔ ٹھیک ہے۔ ذیشان کنٹریشنز پر اچھا ٹھیک ہے DON'T WORRY اور کے گڈ نائٹ“ اُس نے ریسور کرڈل پر رکھ دیا۔ اور نامہ جپ لگا کر صوفے پر براجمان ہو گیا۔

”کیسے ہیں ماموں جان۔؟“ وہ بھنی مونگ بھلی منہ میں ڈالتے ہوئے بے نیازی سے پوچھنے لگا۔

”ٹھیک ہے۔ تمہارا پوچھ رہے تھے۔“

”کب آرہے ہیں۔؟“ نامہ نے پوچھا۔

”پندرہ دن بعد۔“ شان نے کہا۔

”گڈ۔“ اُس نے جیسے نجات کی سانس لی۔ اور شان خوبصورتی سے مسکرایا۔



اپنے کالج کی سٹی سے ملنے جاؤں گا۔ اُس کے بعد ناہید کے پاس  
جاؤں گا۔ میری گرل فرینڈ جس کا میں تمہیں اکثر لندن خط میں لکھا  
کرتا تھا۔ اور پھر۔۔۔۔۔“

”یہ دیکھو میرے ہاتھ۔“ شان نے اپنے باقاعدہ جوڑے ہوئے ہاتھ  
ناھر کو دکھائے۔ ”سنگی کے بعد تو کچھ آرام کر دو۔“  
”نائیں۔ نہیں۔ تو بہ کر دو۔“ اُس نے کان چھوئے۔ ”میں پابندیاں  
براثت نہیں کر سکتا۔“

”وہ تو میں نے تم کو سنگی کی خواب دیکھتے ہی سمجھایا تھا کہ باز  
آجاؤ۔ تم کسی ایک کا ہو کر نہیں رہ سکتا۔“

”شادی کے بعد رہ لوں گا۔ لیکن اب۔ یہ چند مہینے۔ سوال یہ  
پیدا نہیں ہوتا۔ میں بیمار ہو جاؤں گا۔“

”میں بھی نہیں چاہتا کہ تمہارا صوت خراب ہو۔ لیکن یہ چھٹیاں  
تم نے صرف میرے ساتھ گزارنا ہے۔“

”فرا کا نام لو۔ چھٹیاں اور تمہارے۔ سنجیدہ تم رہتے ہو۔  
NERVES پر لوچھ میرے پڑنے لگتا ہے۔ چپ تم رہتے ہو جبر طوں  
میں درد میرے ہونے لگتا ہے۔“

”سنو۔ میں اور تم پہاڑ پر جا رہے ہیں۔“

”مار دیا۔ کوئی کالپ واپس میز پر رکھتے ہوئے وہ صوفے پر  
لڑھک گیا۔ یہاں کیا کم سردی ہے۔ اور پھر پہاڑ پر نہ بندہ نہ



بندے کی ذات - نابابا -

"افوہ۔ پورا بات تو سنو۔ پہاڑ پر صرف دو دن رہیں گے۔ نیا شینری  
ریسورک کے پہنچانا ہے وہاں۔ کام ابھی نہیں ہے ادھر۔ اُس کے بعد وہاں  
نیچے شہر میں چلے جائیں گے۔ باقی دن وہاں گزار لیں گے۔ چنچ ہو جائے گا  
ذرا۔ تمہاری بندیاں بھی نظر آجائے گی۔

"ٹھیک ہے۔ مگر ریشیاں۔ سلمیٰ شاہید۔" ناصر نے کہا۔

"اُس کا واسطہ پھر کبھی چپٹی لے لینا۔"

"سوچ لوں گا۔" اُس نے واقعی سوچتے ہوئے کہا۔

جبکہ اُسے معلوم تھا۔ چالیس میل پرے اور وہ بھی پہاڑ کے  
اُس طرف نیچے اتر کر۔ رنگینی یقیناً متوقع تھی۔

"ٹھیک ہے۔ پھر کل چلے چلیں گے۔" ناصر نے مزید کہا۔

"کل نہیں۔" شان جلدی سے بولا۔

"کیوں۔ اب کونسا کام نکل آیا۔"

"دراصل وہیل کا کچھ بہتہ نہیں چلتا۔ شاید کل ہی بچہ ہو جائے۔ میرا

موجودگی بہت ضروری ہے۔" شان کا لہجہ تشویش ناک تھا۔

"میں کہتا ہوں تم یہ زچہ گیری کب چھوڑ دے۔" ناصر کو غصہ آ گیا۔

"تم کچھ بھی کہو۔ میں وہیل کو ایسا حالت میں اکیلا نہیں چھوڑ

سکتا۔" شان کا فیصلہ اٹل تھا۔

اُس کی گھوڑوں کے جب بھی بچے پیدا ہونے والے ہوتے۔ اُس



کے دن تشویش میں گزرتے اور پیدائش کے وقت آلودہ حتی الامکان  
گھر پر ہی رہنے کی کوشش کرتا۔ نوکروں پر اس معاملے میں وہ  
کبھی بھروسہ نہیں کرتا تھا۔

رات کا کھانا دونوں نے وہیں آگ کے پاس بیٹھ کر کھایا۔ پھر  
تھکے ہوئے تر تھے ہی۔ جلدی جلدی اپنے اپنے کمروں میں پڑ کر  
سو رہے۔

صبح کے چار بج رہے تھے۔ ناصر بے خبر سو رہا تھا۔

”ناصر۔ ناصر۔“ شان نے اُسے جھنجھوڑ ڈالا۔

”کیا ہے۔“ وہ ہڑبڑا کر جاگ اُٹھا۔

”وہ۔ وہ۔ دہیسل کا بچہ ہو گیا ہے۔ نہ رہے۔“

ناصر نے ایک خشکین نظر اُس پر ڈالی۔

ناٹ سوٹ پر سوئٹر پہنے۔ آستین اوپر چڑھائے۔ گندے

آلودہ ہاتھ۔ کپڑوں پر جگہ جگہ گھاس پھوس الٹی۔ پائینچے گیلے چہرے

پر ایک طرف کیچڑ لگی۔ ماتھے پر بال پریشان۔ مگر آنکھیں بے پناہ

خوشی کی صفا من تھیں۔

”مبارک ہو۔“ ناصر قدرے نرم پڑ گیا۔

”THANK YOU NASIR۔ آؤ۔ دیکھو نا۔“ وہ بچوں کی سی

خوشی سے بولا۔ اور ناصر ایک اور نظر اُس پر ڈال کر رہ گیا۔

”چلو“ اُدور کوٹ پہنتے ہوئے وہ شان کے ساتھ ہولیا۔



اصطبل میں تو دن بنا ہوا تھا۔ ایک طرف آگ جل رہی تھی۔  
 پاس ہی کریم بابا آگ تاپتے چائے پینے میں مصروف تھے۔ ناظم بچہ پڑے  
 کے پاس کھڑا تھا۔ پھر واقعی بہت پیارا تھا۔ مگر شان کے شوق  
 کے بھی کیا کہنے۔ کبھی وکیل کے آگے بچھے ہوتا، کبھی بچہ پڑے کو پیار کرتا۔  
 ماما کے شاید سر میں درد تھا۔ سیاہ پٹی ماتھے پر باندھے۔ شان  
 اور مے وہ وکیل کو کچھ کھلانے میں مصروف تھیں۔

اور پھر دوبارہ سونا کہاں؟

شان نے کپڑے بدلے۔ نماز پڑھی اور اس کے بعد دونوں  
 ہی ناشتہ کرنے لگے۔

”آج بہت صبح ناشتہ کروایا ہے“ نامہ نے کہا۔

”یار۔ تمہارا ہی حکم مانا ہے۔ یہاں پر نہیں جانا۔“

”ادہ۔ ونڈر فل۔ کس وقت نکلیں گے۔؟“

”اس وقت ساڑھے چھ ہے۔“ شان نے گھڑی دیکھی۔ ”آٹھ

تک نکل جانا چاہیے۔“

اور پھر۔ واقعی وہ لوگ ٹھیک آٹھ بجے ناظم اور کریم بابا کو

ساتھ لے کر چل پڑے۔

شان تم یقیناً مجھے یہاں مارنے لائے ہو۔“ دو سوائٹر کوٹا اور  
کوٹ، گرم ادنی ٹوپی اور ان سب کے اوپر کبل پیٹے جلتی لکڑیوں کی آگ میں  
گھٹے بیٹھے ناہرنے کہا۔

”حوصلہ کیجئے صاحب۔ یہی رات ہے۔ کل چلے ہی جائیں گے۔ کریم بابا  
بھی سردی سے بے حال تھے۔

اور۔ منیٹل پیس سے ٹیک لکڑے شان دھیرے سے مسکرا دیا۔

”بابا کل کا کیا پتہ دیکھتا بھی ہوں یا نہیں؟“

”فردرد دیکھیں گے صاحب۔ بُرا فال مُنہ سے نہ نکالئے۔“

”بابا بھائے۔“ ناہرنے سردی سے کانپ کر کہا۔

”اچھا صاحب۔ کریم بابا بمشکل اُٹھے۔ ابھی لاتا ہوں۔“ اور بابا  
کچن کی طرف چل دیے۔

”یہ تم کیا ایڈلنگ کر رہے ہو۔“ شان نے بابا کے جانے کے بعد کہا۔



”ایکلنگ کر رہا ہوں۔“ ناہرنے کہا۔

”اور کیا۔ سردی کیا مجھ کو نہیں لگتا۔“

”تمہیں۔؟ تم انسان ہو۔؟ تم تو جاؤ وکیل کے بچے پیدا کرو۔ ریٹا بھی منتظر ہے اس کے پلے بھی تمہاری عدم موجودگی میں اس دنیا میں قدم نہیں رکھیں گے۔ پھوٹی اس بد بخت کی قسمت جو تمہارے پلے بندھے گی۔ کبھی ایک آنکھ دبلے۔ ناہرنے واقعی ایک آنکھ میسر کی۔ کسی گن کی صفائی میں مصروف ہوگی۔ کبھی تمہارے کتے ہٹائے گی۔ اور کبھی اسٹبل میں ڈیرہ جائے گھوڑوں کے بچے پیدا کروارہی ہوگی۔ یار میں تو کہتا ہوں کھول ہی لو ایک ”مرکزِ حقہ و بچہ۔!“

اور شان اس کی آخری بات پر بے اختیار قہقہہ لگا اٹھا۔

”اب انسان لگا رہے ہو۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”وے بکے دادے لڑکیاں تمہارے دانتوں کے ہارے میں کیا کہتی ہیں؟“ وہ جیسے سرری بھول بھال گیا۔

”دیکھے ہی نہیں ہے۔“

”یہ کیوں نہیں کہتے دکھائے نہیں ہیں۔“

”بات ایک ہی ہوا۔“

”یعنی کسی نے تعریف نہیں کی اب تک۔“

”No۔“ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”دیکھو شان! مجھے مزید بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم کل زندوں کی

دنیا میں جا رہے ہیں۔ اُس کا اشارہ نیچے وادی کی طرف چالیں میں پر  
واقع چھوٹے سے خوبصورت شہر کی طرف تھا۔ اور تم نے مُردگی دکھائی تو۔ یاد  
رکھو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہو گا۔ بابا۔ شکر یہ بابا۔ "SO NICE OF  
YOU BABA" بابا کو دیکھتے ہی وہ پھر سردی میں مبتلا ہو گیا۔

اور شان نے بننا نہ رہ سکا۔

"لیجئے چھوٹے سرکار۔" ناصر کو چائے دینے کے بعد بابا نے شان کو کپ پکڑایا۔  
"شکر یہ بابا۔"

"بابا کھانے میں کتنی دیر ہے۔؟" ناصر نے گرم گرم چائے کا گھونٹ  
بھرتے ہی پوچھا۔

"بس تیار ہے سرکار۔" بابا نے کہا۔

"تو لائیے پھر۔ انتظار کس بات کا ہے۔"

"ابھی تو صرف چھ بج رہے ہیں۔" شان نے کہا۔

"انڈھیرا تو ہو چکا ہے نا۔" شان کی ہر کام میں باقاعدگی سے وہ

نالال ہی رہتا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ لے آئیں جیسا ناصر کہتا ہے۔" شان نے کہا۔

"جیسے ناصر کہتا ہے۔ تمہیں کیا بھوک نہیں ہے۔"

"کوئی خاص نہیں۔"

"تم خود خاص نہیں۔ بہتری بھوک کیا خاص ہوگی۔"

"مجھے تو کوئی خاص بات نظر نہیں آتی اس میں۔" شان پھر چونکا۔



اور دھیمی سی مدھر مسکراہٹ پھر اُس کے لبوں پر چھا گئی۔

”بابا آپ کہتے تھے جس رات شان پیدا ہوا تھا۔ سخت برف باری ہو رہی تھی۔“ ناصر دوسری پیالی بھرتے ہوئے بولا۔

شان بابا کی طرف دیکھنے لگا۔

”میں نے کہا تھا۔؟“ بابا بے چلے گڑ بڑا گئے۔

”ہاں۔“ ناصر آرام سے بولا۔ اور شان اپنے اوپر ناصر کی جوت سمجھ کر دھیرے سے مسکرا دیا۔

”سرکار! شان بیٹے کی پیدائش تو صبح پانچ بجے ہوئی تھی۔ بڑے صاحب فرماتے تھے کہ اُن کے یہاں سورج طلوع ہوا ہے اور اُس وقت بھی گرمی اس غضب کی پڑ رہی تھی کہ الامان۔“

”جی بھی اُس گرمی کی غضب ناکی اس میں بھی مھلکتی نظر آتی ہے۔“ ناصر بے حد اطمینان سے بولا۔

بابا مسکرانے لگے۔

”کھانا لاؤں صاحب۔؟“ بابا چلے کے خالی برتن سمیٹے ہوئے بولے

”ہاں بابا۔“ شان نے کہا۔ اور بابا بڑے ہاتھوں میں تھامے چل دے۔

”برف باری میں پیدائش سے تمہارا کیا مطلب تھا۔“ شان نے اُس کی ٹوپی اُچکتے ہوئے کہا۔ اور اُٹھتے ہوئے جھپٹ کر ناصر نے اپنی ٹوپی اُس سے واپس لے لی۔

”سنا ہے جو سردی میں پیدا ہوتا ہے۔ اُس کو سردی نہیں لگتی۔“

ٹوپی دوبارہ پہنتے ہوئے ناصر نے کہا۔

”تم یہ کیوں نہیں سوچتا کہ جو سخت گرمی میں پیدا ہوتا ہے۔ اُس کو ہر وقت گرمی لگتی ہے اور وہ صرف سردی میں ٹھیک رہتا ہے۔“

”اوہ۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ ویسے تم سنئے اتنی عقل کی امید نہیں تھی برخوردار۔“ ناصر نے ہاتھ ملانے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا اور شان نے اُس کا ہاتھ تھام کر زور سے جھٹکا۔

”بیٹا تمہارا اور ہمارا پیدائش کا مہینہ ایک ہے اور تم جس علاقے میں پیدا ہوا تھا۔ وہاں باہا جان بتاتے ہیں گرمیوں میں چکن روٹ کھانے کے لئے آگ کی ضرورت پیش نہیں آتا تھا۔“

”I SEE۔“ کچھ غور و فکر کے بعد ناصر نے کہا۔

کھانا دونوں نے خوش گوشت گوار باتوں کے دوران کھا لیا۔ ایک کپ امد گرم چائے پی لینے کے بعد ناصر تو بستر میں گھس گیا اور شان نے عادت نماز کی نیت باندھ لی۔

”یا اللہ! تو مجھے معاف کر۔ اس سردی میں مجھے باقاعدہ یاد نہ کر سکا۔“ ناصر کی بستر کے اندر سے آواز آئی۔

”گرمی آئے تو پھر ضرور یاد کر لینا۔“ نماز کے اختتام پر شان نے اُس کی نماز نہ پڑھنے کی عادت پر لطیف چوٹ کی۔

شان نے بھی رات کے کپڑے بدلے اور بستر میں لیٹ گیا۔



"شان - تم نے کپڑے بدلے۔؟" ناھر سرمنہ لپیٹے بستر کے اندر ہی سے بولا۔

"ہاں۔ شان نے جواب دیا۔

"مجھلی کے بچے کی کیا ضرورت تھی۔؟"

"نہیں نہیں آتا پھر۔"

"سوئیٹر تو پہنا ہے تا؟" اُس نے مزید پوچھا۔

"نہیں تو۔" شان نے کہا۔

"سچ کہتے ہو؟" اُس کا لہجہ گھبرا یا ہوا تھا۔ سراب بھی اندر ہی تھا۔

"کیوں؟" شان نے پوچھا۔

"شان - تمہیں تنگھا تصور کر کے ہی مجھے بخار ہو جائے گا۔ وہ مزید گھبرا کر بولا۔

شان نے ایک بھر پور قہقہہ لگایا۔

"تصور مت کرو۔ سو جاؤ اب۔ گڈ نائٹ۔ شان نے سر ہانے

رکھا لیمپ آف کر دیا۔

"گڈ... نا... ٹٹ۔" ناھر کی کانپتی آواز آئی۔

وائیں طرف سر بفلک پہاڑ، سدا بہار پائینتر۔ بائیں جانب ہری  
کھائی۔ سمی برف سے اٹے پڑے تھے۔ پتلی چکر دار سڑک دھند میں  
پٹی نظر آرہی تھی۔ اُس نے جیب کی ہیڈ لائٹس آن کر لی تھیں۔ اس  
کے باوجود راستہ بمشکل نظر آ رہا تھا۔

آج خلافِ عادت وہ خود جیب ڈرائیو کر رہا تھا۔ ناہر کے بار بار  
کہنے پر وہ ڈرائیو ناظم اور کریم بابا کو دس میں پہاڑ پر کوٹھی میں چھوڑ آیا تھا۔  
وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔

اُس نے اوپر نگاہ کی۔ گھنگھور گھٹائیں اب بھی پورے آسمان کو  
گھیرے میں لئے ہوئے تھیں۔

”سچ پوچھو ناہر تو I LOVE THIS SEASON“ شان نے اوڈر کوٹ  
کا کالرا اوپر چڑھاتے ہوئے مسخوڑ لہجے میں کہا۔ ادرا ناہر۔ ایک تہرا آلود نظر  
اس پر ڈال کر اپنے گرد لپٹی کبل میں ٹانگیں اوپر کر کے سیٹ پر اگڑوں بیٹھ گیا۔



"یوں تو خدا کا قدرت ہر جگہ، ہر چیز میں موجود ہے۔ مگر کیا یہاں آکر تم کو ایسا محسوس نہیں ہوتا۔۔۔"

"کہ خدا یہیں رہتا ہے۔" جیب کا ونڈا سکرین شاید ہل گیا تھا۔  
کھنچ کر اس نے مضبوط کرتے ہوئے شان کو لقمہ دیا۔

"تمہیں کوئی شک ہے؟" شان نے رخ پھیر کر اسے دیکھا۔

"مولوی کے بچے آگے دیکھ۔ اس TRIP سے زندہ واپس پہنچاؤ  
خیرات دوں گا۔"

اور شان احتیاط سے اترائی اترنے لگا۔

"ٹپ۔ ٹپ۔ ٹپ۔" اچانک جیب کی چھت زنج اٹھی۔

"لو جلتے رنگ بھی سن لو۔ یا اللہ! میں کس مصیبت میں پھنس گیا۔

شان کے بچے۔" بارش کے قطرے پڑتے سنتے ہی وہ دانت کٹکٹانے لگا۔  
شان نے دائیہ زچلا دیئے۔

"اس سے کچھ نہیں ہوگا" وہ اب بھی کانپتی آواز میں بولا۔

"پتہ تو تب چلے گا۔ جب ہوٹل میں رہے گا۔ بغیر ناظم اور کریم بابا  
کے۔" شان ہنستے ہوئے کہا۔

"وہ تو سروس میں رہ کر میں نے سیکھ لیا ہے۔ تمہیں البتہ زحمت

ہوگی۔ کریم بابا انڈر ویر پہنانے کو نہیں ہوں گے تو۔"

"تو تم نے جان بوجھ کر دونوں کا چھٹی کرا لیا ہے؟" مانا کہ اب بچپن

کی طرح بابا اس کو واقعی کپڑے تو نہیں پہناتے تھے۔ مگر پہننے میں مدد

فرد دیتے تھے۔ شان کو اس وقت لگا کہ یہ نامہ کی شرارت تھی۔  
 ”اُس وقت مجھے یہ تو خیال نہیں آیا کہ وہ نہیں ہوں گے تو تم  
 شنگے رہ جاؤ گے۔ بلکہ....“

”بلکہ کیا۔؟“

”مجھے اپنی فکر تھی۔“ شیخ نے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے، راستہ دیکھنے  
 کی کوشش کرتے ہوئے وہ لا پرواہی سے بولا۔  
 ”کیا۔؟“

”یار ان کے سامنے ہم کسی کو CHASE کر سکتے تھے۔ جیسے گردن  
 باہر ڈال کر پیچھے مڑ کر کسی کو دیکھ سکتے تھے۔ پھر اپنے کسی ہلکے ریمارک پر  
 ”بدتمیز۔ مکینہ۔ ذلیل۔“ وہ خالص زمانہ انداز میں بولنے لگا۔ سن سکتے  
 تھے۔ تم تو عجیب بے دماغ آدمی ہو۔“  
 ”ہم کا سمجھ نہیں آیا۔؟“

”ہم“ سے مراد ہے میں اور تم۔“

”میں ہاتھ جوڑتا ہے۔“ اس نے اسٹیزنگ چھوڑ چھاڑ دونوں ہاتھ  
 جوڑ دیئے۔ ”اور پھر یہ گردن مڑنا نہیں جانتا۔ سامنے دیکھنا جانتا  
 ہے۔“ نامہ کو چڑاتے چڑاتے بھی اُس کے آخری الفاظ میں جیسے ایک  
 عزم تھا۔ ایک استحکام تھا۔

”یہ کوئی اتنی حسین خرابی نہیں ہے۔“  
 ”خرابی ہے تو۔“ شان نے عزم سے کہا۔



” اتنی خاص نہیں۔ “ ناصر مزید لا پر دای سے بولا۔

اور۔ لفظ ” خاص “ اُسے جانے کیوں چڑکا دیتا تھا۔

زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی نے اُسے لفظ ” خاص “ سے پایاں قرار

دیا تھا۔ شاید اس لئے۔ دھیمی سی مسکراہٹ نامحسوس طریق پر اُس کے لبوں پر پھیل گئی۔

شہر کی آبادی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ آگے قدرے فاصلے پر عمارتیں

جانب بنی دو چار چھوٹی چھوٹی دکانیں زندگی کا پتہ دے رہی تھیں۔

” روکو۔ چائے کی دکان ہے۔ “ ناصر اچانک بے تابی سے اچھلا۔

شان نے دیکھا۔ واقعی کئی چھوٹی چھوٹی پیالیاں سامنے رکھی نظر

آ رہی تھیں۔ چائے کی کیتلی آگ پر رکھی تھی۔ اور اُس میں سے گرم گرم بھاپ

نکل نکھل کر زندگی کی حرارت بخش رہی تھی۔ چھوٹی سی دکان میں چند

لکڑی کی کرسیاں اور اُسی حساب سے میزیں بھی رکھی تھیں۔

” کچے گا کون جا کر۔؟ “ شان گاڑی روکتے ہوئے بولا۔

” معاف کرنا جاگیر دار صاحب۔ خود تشریف لے جانا پڑے گی۔ “ ناصر

اپنے آپ کو کبیل میں مزید لپیٹتے ہوئے بولا۔

” خود اپنا تشریف کے بارے میں کیا خیال ہے۔ “

” اپنی تشریف سردی سے جم گئی ہے۔ “

” چائے تم نے پیتا ہے۔ میں نے نہیں۔ “ شان نے کندھا چمکتے ہوئے

کہا۔ اور جیب میں چابی گھمادی۔

”اور کو بھی۔ بڑا آیا نہ پینے والا۔ ناصر بظاہر حواس درست کرتے ہوئے بولا۔“ جاتا ہوں۔“  
 پھر اُس نے آہستہ آہستہ کبل سے پاؤں باہر نکالے نیچے ٹسکائے۔ اور  
 تبھی ہوٹل کا چھوٹا سالار کا قریب آ گیا۔  
 ”صاحب! چلے لاؤں۔“ وہ بند کھڑکی میں زور سے بولا۔  
 ”اوجیو بیٹا“ ناصر نے دروازے کی دزد سے منہ لگا کر آواز لگائی۔  
 ”دودھ پتی۔ گرم گرم۔ چائے مگ بھر کے۔“  
 اور اُس نے پھر پاؤں اوپر اٹھا کر کبل سے ڈھک لئے۔  
 ”اچھا صاحب!“ بچہ خوش ہو کر پلٹا۔  
 اور۔ شان سراسٹیرنگ پر ٹیک کر بے اختیار سنس دیا۔  
 ناصر نے ایک خشمگین نظر اُس پر ڈالی۔  
 ”فدا یہ تھمس دینا۔“ قدرے توقف کے بعد شان نے ناصر کے  
 پاؤں کے پاس رکھے تھمس کی طرف اشارہ کیا۔  
 ”خود ہی لو۔“ ناصر گویا ناراض تھا کھڑکی کی طرف رخ کرتے ہوئے  
 بولا۔ اور شان نے ہاتھ نیچے جا کر تھمس خود ہی لے لیا۔ بھولا اور اسی  
 کے کپ میں اسٹردنگ کافی انڈیلی۔  
 ”پئے گا؟“ تھمس کا ڈھکن بند کرتے ہوئے اُس نے پوچھا۔  
 ”نہیں۔“ ناصر نے کہا۔  
 ”پچھتائے گا۔“ تیز خوشبو ادا بھاپ اٹھتی کافی کا کپ ناصر آنکھوں کے



سامنے ہراتے ہوئے شان نے کہا۔

اور چھوٹا سا لڑکا۔ واقعی چلے گئے بھر کر چلے اور دو پیالیاں  
چھوٹی سی ٹرے میں سجائے آئے۔

ناہرنے تھوڑا سا دروازہ داکیا۔ بمشکل ٹرے اندر کی اور جلدی سے  
دروازہ پھر بند کر دیا۔

”پیو گئے۔؟“ چھوٹی سی پیالی میں دودھ پتی گرم گرم چائے انڈلیتے  
ہوئے ناہرنے کہا۔

”NO“۔ شان نے اپنی کوئی کا ایک تیز کر ڈاگھونٹ پی کر  
مزہ لیتے ہوئے کہا۔

”پچھتاؤ گئے“ ناہرنے بادی رنگ کی گاڑھی سی چائے کا کپ  
شان کی نظروں کے سامنے ہرایا۔

اور شان کو بے اختیار ہنسی آگئی۔

”دیکھو بیٹا انٹرکونیٹنٹل کی چائے کا بھاری وزنی کپ، اس دودھ  
پتی چائے کی چھوٹی سی سیلی پیالی کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور پھر گرمیوں میں  
جب یہی چھوٹی چھوٹی لکڑی کی کرسیاں اور میز اسی دوکان کے آگے لگ  
جاتے ہیں اور لوگ یہاں بیٹھ کر اسی چھوٹی سی پیالی سے اسی چائے کی  
چسکیاں لیتے ہوئے، عام رومائس سے لے کر دنیا بھر پالنگس DISCUSS  
کرتے ہیں تو پیرس کی PAYMENT CAFES بھی ماند پر جاتی ہیں۔“  
”واقعی۔؟“ شان نے اپنا کپ آگے بڑھایا۔

”واقعی۔۔۔ ناہرنے اپنا کپ اس کے کپ سے ٹکرا دیا۔۔۔

“CHEERS TO MAMA BEGUM”

اور شان نے ایک جان مار تہقہ لگایا۔

ناہرنے برتن واپس کئے تو شان نے جیب اسٹالٹ کر دی۔ اور پھر  
آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

میل بھری فاصلہ طے کیا تھا کہ برفباری شروع ہو گئی۔  
”ونڈر فل۔۔۔ شان خوش ہو کر لولا۔ اور ناہرنے ناگواری سے منہ

دوسری طرف پھیر لیا۔

”بھے ایک چیز کی سمجھ نہیں آئی۔۔۔ ناہر لولا۔

”کس چیز کا۔۔۔؟“

”سرد سے سرد علاقے میں کوچ کرنے کی۔ یعنی بجائے اس کے کہ گاؤں  
میں سردی تھی۔ ہم جلتے کسی گرم علاقے کی طرف تو مزہ بھی آتا یہ کیا تک،  
کہ گاؤں کی سردی سے اٹھ کر ہم نقطہ انجماد پر آ کر جم رہے ہیں۔“

”اسی کر تو زندگی کہتے ہیں۔ اونچے پہاڑوں پر برف جما ہو۔ ہر طرف  
دھند چھایا ہو۔ بوٹا بوٹا بادل آیا ہو۔ اسٹرڈنگ کافی کا رنگ ہو۔ گھونٹ  
گھونٹ کر کے ہم کافی پی لے رہا ہو۔ مگ سے فیومنرا اٹھ رہا ہو۔ اور  
ہم کسی سوچ میں گم سرخ کوٹلوں کو تک رہا ہو۔

”کسی سوچ میں گم، اور تم۔۔۔ ہونہ۔۔۔ اپنی شاعری کا آخری حصہ  
چھتے مشروب کر کے تم پہلے حصہ پیا جاؤ۔ پہاڑ ہو، برف ہو۔ اور تم۔



یخ سرد۔ میں حیران ہوں کہ لڑکیوں کو تم میں کیا نظر آتا ہے۔ بجائے اس کے کہ تمہیں دیکھتے ہی انہیں سردی لگے اور بھائیں گرم کوٹ کی طرف۔ یعنی میری طرف۔ وہ SKIING کرتی تھا وہی طرف ہی بڑھتی ہیں۔

برف کی وجہ سے دائیں پر بھی ٹھیک کام نہیں کر رہا۔ ناظم اور کریم بابا کو خواہ مخواہ تمہارے ساتھ نہیں لایا۔ ایسے راستوں اور موسم میں کسی نہ کسی کا ہونا ضروری تھا۔ وہ بمشکل ڈرائیو کرتے ہوئے بولا۔

”چپ کرو۔ چپ کرو۔ ناظران سنی کرتے ہوئے دروازہ کھول کر پیچھے جھانکا۔ کیا غضب کی چیز تھی؟ دروازہ دو بارہ بند کر کے وہ مزید بولا۔

”چھتری سر پر لے چائینز موڈل لگ رہی تھی۔

شان زبر لب مسکرایا۔

”تم بھی کسی کو چھوڑتا نہیں ہے۔“

”توبہ کرو۔ میں تو تمہاری بیوی کو بھی آنکھ ماروں گا۔“

”اسی لئے تو میں شادی نہیں کرتا۔ کہ میں تجھ کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اور تم آنکھ

مارتا نہیں چھوڑ سکتا۔“ شان خوبصورتی سے ہنستے ہوئے بولا۔

ناظر نے ایک نظر ادا۔ چپ کا دروازہ کھول کر پیچھے ڈالی۔

”ویسے اس ٹرپ کے بعد واپس جا کر میں ایک لمبا خط تینہ بھابی کو

لکھوں گا۔ جس میں چائینز موڈل سے لے کر باقی کا سارا ہفتے کا ہر باریک

خبر موجود ہوگا۔ شان بولا۔

”خبردار۔ کہیں سچ بچ ایسا نہ کر دینا۔“ وہ اچانک گڑبڑایا۔

”یہ تو ہو گا“ شان نے کہا۔

”کبھی نہیں ہو گا۔ ویسے تم نے بہت بے وقت اس کی یاد دلادی۔

ہائے۔ ہائے۔“

”کیا واقعی۔۔؟“

”اور کیا۔ اچھی تو رہی لگتی ہے۔ یہ تو سب ویسے ہی پس ذرا دل خوش

کرنے کو۔ اوہ۔ اوہ۔ دیکھو۔ وہ۔ سامنے دائیں طرف“

وہ پھر کھول بھال گیا۔

اور شان نے دیکھا۔

دائیں طرف دو اور لڑکیاں چھتیاں سروں پر لئے ایک گیٹ کے

اندروں داخل ہو رہی تھیں۔

”جگہ اچھی ہے“ لڑکیاں قہمی آپ لٹریٹ لگ رہی ہیں“ ناہرنے

پاؤں کیبل سے نکال کر نیچے لٹکا دیئے۔ مہذب ہو کر بیٹھ گیا۔ اور شان

چپکے سے مسکرا دیا۔

قدرے آگے بڑھ کر شان نے چپ دائیں موڑ لی۔ اور فرلانگ پھر

چلنے کے بعد ایک شاندار ہوٹل کے گیٹ میں داخل ہو گیا۔

قصہ لکھ 5633

Hardayal Municipal Public Lib. Patna

Acc. No. 19845-1988



جھجک کے دریا بج رہے تھے۔ ٹاٹے سے قارخ ہو کر وہ دروڑوں  
تیار ہوئے۔ آج میوزیم دیکھنے کا پروگرام تھا۔ جیب میں بیٹھے اور  
دوئل سے باہر نکل گئے۔

پہاڑوں پر، ڈھلانوں پر، درختوں پر، جھاڑیوں پر ہر طرف برف  
ہی برف تھی نظر آرہی تھی۔ نیلگوں آسمان البتہ بالکل صاف تھا۔  
ہر طرف بھری برف، دریا کی سنہری گرتوں کو سنہری کر رہی تھی، سنہری  
شعبہ پتھر پر وہ جسموں کو حرارت بخشنے لگی تھی۔ ہر کوئی زندگی کے آثار  
خوش لینے لگے تھے۔ اندر در در کا کاروبار چل رہا تھا۔

میوزیم پہنچ کر جیب ایک طرف روک کر وہ آگے بڑھے۔  
گشت خرید سے اور وہ اندر داخل ہو گئے۔

گندہ داما آگے کے شاہکار پیشے کے شوکیڈوں میں تھیں سالہا سال  
پہرے نگاہ اور اس کی ہمدرد سے روشناس کر رہے تھے۔

یکے بعد دیگرے۔ اُن سے متعلق لکھی تاریخ پر نظریں دوڑاتے  
وہ آگے بڑھتے رہے۔

ناہر بیاں بھی اپنی عادت سے مجبور کسی نہ کسی چیز میں مذاق کا پہلو  
نکال کر خود بھی ہنس رہا تھا اور شان کو بھی ہنسانے کی کوشش کر رہا تھا۔  
شان البتہ سنجیدگی سے ہر ایٹھو، ہر اسٹوپا کو نظروں ہی نظروں میں  
سراہتا ہوا آہستہ آہستہ دائیں چارہا تھا۔

معاؤس کی نظر سامنے والے کمرے میں پڑی۔ کچھ اسلحہ، کچھ لباس اور  
کچھ زیورات نمائش کے لئے رکھے تھے۔

اسلحہ کا اُسے جنون تھا اپنے تلے قدم رکھتا وہ وہاں چلا آیا۔ کئی  
سال پرانی ہندو قیں، پستول، خنجر۔ وہ غور سے دیکھنے لگا۔

”انگوٹھی کتنی خوبصورت ہے۔“ ایک نازک سی نسوانی آواز ابھری۔

اسلحہ سے پھسل کر اُس کی نظریں پاس ہی سجے سالہا سال پرانے  
زیورات پر جا پڑیں۔

اور۔۔۔ پھر۔۔۔ گہرے سیر رنگ کے کپڑوں پر سفید کوٹ۔ سفید شوز  
درجے دار کراؤن بالوں پر سفید قرنی خوبصورت ڈیڑھی سجائے یہ  
شبہ وہی لڑکی تھی۔

سردی کی شدت سے چہرے کا گلابی رنگ مزید سرخ ہو رہا تھا۔  
خوبصورت شربتی آنکھوں پر نمی نہی گھنی پلکوں کا سایہ لئے۔ وہ  
بیت زیورات میں رکھی ایک انگوٹھی کو تنہی اپنی سا تنہی لڑکی سے مخاطب



تھی۔

اور پھر۔ شان کی نظروں کا اثر تھا یا ویسے ہی۔ اس نے خوبصورت پلکیں اوپر اٹھائیں۔

ایک پل کو نظریں شان کی نظروں سے ملیں۔ ایک لمحے کو پلکیں جھپکیں۔ جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

اور پھر ایک دم ہی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہو گئی۔ پہچاننے میں کامیاب ہو گئی تھی شاید وہ۔

مگر۔ لمحوں میں ہی وہ چمک معدوم ہو گئی۔ خوبصورت ماتھے پر شکنیں سے ابھرا آئیں۔ شفاف گلابی چہرہ ماند پڑ گیا۔

اور پھر۔ کچھ بیزاری، کچھ ناگواری کی ملی جلی کیفیت چہرے پر لے وہ رُخ پھیر کر دوبارہ زیورات دیکھنے لگی۔

شان۔ پھر اسلحہ دیکھنے لگا۔

مگر۔ جانے کیا بات تھی اس لڑکی کے رویے میں۔ اُس رات سیٹھ حامد علی سے یہاں ڈنر پر سے بھی وہ ذہن پر بوجھ نہالے گاؤں لوڑ

تھا۔ اور اس وقت بھی۔ اُسے وہی بھاری وزن ذہن پر پڑتا محسوس ہونے لگا۔

وہ اب بھی خالی خالی نظروں سے ایک بندوق کے ہتھ پیر

سنہری گلکاری کو دیکھ رہا تھا۔

بتھی آہٹ پر چونکا۔

ناصر تیز قدم اٹھاتا چلا آ رہا تھا۔

مگر۔ جوں ہی دروازے کے اندر داخل ہوا۔ سامنے کھڑی لڑکیوں کو دیکھ کر یکدم ہی ٹھٹھک کر رُک گیا۔ ایک نظر بغور دونوں کو دیکھا۔ اور پھر سیدھا ہشان کے پاس آ پہنچا۔

”پچھے دو لڑکیاں ہیں۔“ اُس نے بے تاب سے اطلاع دی۔

”ہاں۔“ نظریں بندوق پر ہی جمائے وہ دھیرے سے بولا۔

”ایک بہت خوبصورت ہے۔“ وہ پھر آہستہ سے بولا۔

”خلیدہ؟“ شان نے بے نیازی سے کہا۔

”جب میں اندر آ رہا تھا وہ تمہیں ہی دیکھ رہی تھی۔“

”ہوں۔“ اُس کی بے نیازی برقرار تھی۔

”تم بھی دیکھو۔“ ناصر نے مشورہ دیا۔

”NEVER“ شان جیسے بدگ گیا۔

”خفا ہو۔ اُس سے۔“ ناصر نے کہا۔

”STUPID“ وہ دوسری طرف بڑھا۔

ناصر بھی جا پہنچا۔

”تم نے مجھے STUPID کہا تو اُس نے پھر تمہیں مڑ کر دیکھا تھا؟“

لڑکی نے واقعی فرح محسوس طور پر رخ اُس کی طرف پھیرا تھا۔

”PLEASE NASIR I HATH SUCH NON SENSE“ اُس کے

ہجے میں بیزاری انتہا پر تھی۔



رہ آہستہ ہی بولا تھا۔ مگر اُس نے دیکھا لڑکی کے خوبصورت  
چہرے پر تار یکسے سائے لہراتے لگے تھے۔  
اور تھی۔ اپنے لہجے کی تلخی کا احساس ہوتے ہوئے بھی۔ اپنی بات  
کے غیر مہذب ہوتے ہوئے بھی۔ جلتے کیوں۔ اُسے سکوانا کا سا احساس  
ہوا۔ جیسے کسی خفیہ جذبے کی تسکین ہو گئی ہو۔  
”تم انسان تھوڑی ہو۔ جی چاہتا ہے ادھر ہی کسی شوکیں میں بند  
کر کے چلا جاؤں۔“

”پتیزیں دیکھو“ اب پھر اس کا لہجہ معمول پر آ رہا تھا۔  
”ادیکے۔“ ناصر دو قدم چل کر اُسی شوکیں کے پاس جا کھڑا ہوا۔  
جہاں دونوں لڑکیاں کھڑی تھیں۔  
شان نے رُخ پھر کر اُسے دیکھا۔  
اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی، اُسے ہنسی آ گئی۔  
زیورات کے شوکیں کے پاس اُس دوسری لڑکی کے بالکل قریب  
کھڑا ناصر ان سبابتوں پر اٹھائے ایک اسٹوپ کے نیچے لکھی اس  
کی ہسٹری اور اپنی آواز میں پڑھ رہا تھا۔  
رُخ پھر کر واپس۔ اُس نے جلدی جلدی باقی چیروں پر نظر  
دوڑائی۔ اور پھر ناصر کے پاس چلا آیا۔  
”ناصر جلدی کرو۔ دیر ہو رہا ہے۔“ شان نے گھڑی دیکھتے  
ہوئے کہا۔

کچھ دیر قبل کے ذہن پر بوجھ یا پھر تلخی اور بیزاری کا اب اس کے چہرے پر  
 پر شاہیہ تک نہ تھا سول کا بوجھ ہلکا کر چکا تھا۔ شاید اس لئے۔  
 "ایسے ہی عورتوں پر تو میں گھڑی دیکھنی یاد آجاتی ہے۔" ناصر  
 جھنجھایا سا بولا۔

اور شان سنس دیا۔ خوبصورتی سے۔  
 "ری۔" ناصر کے پاس والی لڑکی نے آہستہ سے کہا۔  
 ناصر چمڑک کر اٹھیں دیکھنے لگا۔  
 "ہوں۔" سفید نازک سی آنکلیوں سے چہرے پر گہرائی بالوں کی لٹ  
 دیکھتے دیکھتے ہرے وہ آہستہ سے بولی۔  
 "چلو۔ چلیں۔" عالم جان انتظار کر رہی ہوں گی۔" لڑکی  
 نے مزید کہا۔

"چلو۔" وہ آہستہ سے بولی۔  
 اور مرگے دروازے کی طرف ہولی۔  
 شان نے دیکھا۔ دھڑکنے والی صورت چہرے پر تاریک سے  
 سائے تھے۔ اب کے اُس کے ذہن پر بوجھ نہیں تھا۔ جانے کیوں اُسے  
 اطمینان سا ہوا۔

وہ لوگ غائب کی تھیں۔ ناصر کو جلیختے پردے آپا۔  
 "ملاؤ ہاتھ۔" اُس نے شان سے ہاتھ غلایا۔ "وہ ری ہے۔ تم  
 شان ہو۔ یعنی ذی شان۔"



”ہوں۔ اور شان نے آہستہ سے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ چہرہ

پھر سے سنجیدہ ہو گیا۔

”اُد۔ اب ہم بھی چلیں۔ ناصر کو اب وہاں رکنے سے کوئی دلچسپی

نہ رہی تھی۔

”ایک منٹ۔ یہ موڈل دیکھنے دو۔“ شان پھر مصروف ہو گیا۔

”نہیں۔ اُن کے گھر بھی تو معلوم کرنے ہیں۔ جلدی کرو۔ نکل جائیں گی۔“

ناصر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔

”مجھ کو کوئی ایسا شوق نہیں ہے۔“ شان کی نظر یہاں اب بھی موڈل

پر لگی تھیں۔

”تم نے ابھی 'ہوں' جو کی تھی۔“ ناصر بچوں کی سی معصومیت

سے بولا۔

”دہوں، کی تھی وہاں، نہیں کی تھی۔“

”میں نے اُس دوسری لڑکی کا گھر معلوم کرنا ہے۔ چلو۔“ اور شان کو

گھبراواؤں سے باہر کی طرف ہولیا۔

شام کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ کانپتا۔ ٹھٹھ سورج مغرب میں  
 پناہ لینے کے لئے سرگرداں تھا۔ اونچی برف پوش پہاڑیاں اُسے آغوش  
 میں لینے کو بازو داکٹے کھین۔ نیلے آسمان پر چھلنے بگھلنے سے سفید بادلوں  
 آوارہ آندھی سے برس برس پیکار تھے۔

اور دن بھر کی بھائی زوال پذیر تھی۔  
 جیب میں بیٹھے وہ دونوں بھلی دن بھر کے ٹھکے ہوئے ہوٹل کی طرف  
 جارہے تھے۔ بیدھا راستہ چھوڑ کر شان بازار کی طرف ہولیا۔ ناھر کو  
 مارچ کے لئے سیزن چاہئے تھے۔ اور خود اُسے۔ باقی کے دنوں کے لئے  
 ڈرائی فرسٹ۔

نامر حسب معمول سردی کی تہہ ہی کے باعث جیب میں ہی بیٹھا  
 رہا۔ شان نے سیر خریدے اور پھر ٹڈی سے آگے چل کر ڈرائے فرسٹ کی  
 دوکان پر جا کھڑا ہوا۔



دوکاندار دہرائے فروٹ لٹاؤں میں ڈال رہا تھا۔ اور شان یونی  
 بے خیالی میں اس ادبچے نیچے پہاڑی بانار کا جائزہ لے رہا تھا۔  
 تھی وہ چونکا۔ قدرے فاصلے پر وہی لڑکی۔ لائل بلو کیڑوں پر سفید  
 کورٹ، سر کے گرد کپڑوں کے ہمرنگ دوپٹہ لپیٹے، پاؤں میں سفید شوز پہنے۔  
 ہاتھوں میں شاپنگ کے تھیلے تھامے۔ اپنی اسی سا تھی لڑکی کے ساتھ سڑک  
 کی کنارے اسی کے سائیڈ پر چلی آرہی تھی۔ پھر چند قدم پر وہ رُک  
 گئی۔ لفافے دوسری لڑکی کو بکھڑائے۔

”عم پرکڑو میں، تھک گئی ہوں۔ وہ مسکراتی ہوئی لڑکی تو اس کے بے حد  
 خوبصورت موتیوں کے سے دانت ایسا جلوہ دکھا گئے۔

وہی لفافے اٹھانے سے اُس کی تھکن پر۔ غیر ارادی طور پر شان  
 کے لب بستم ہو گئے۔ مگر بھرا چانک ہی وہ بستم معدوم ہو گیا۔ ماتھے پر  
 سادھن سی ابھر آئیں۔

دونوں لڑکیاں قریب پہنچ گئی تھیں۔ پاس سے گزرتے گزرتے اچانک  
 ہی اس کی نظریں ادھر ساٹھیں۔ شان پر پڑیں۔

خوبصورت شری آٹھوں میں چمک سی لہرائی۔ معدوم ہوئی۔ شفا  
 گلابی رنگت سرخ ہوئی سناں پڑی۔ دیکھ کر چہرے پر رونق آئی۔  
 پھسکی پڑی۔ شان کے قریب سے گزرنے کے بجائے دوسری لڑکی سے  
 جگہ بدلی۔ ادھر یوں۔ کتر اگر آگے نکل گئی۔

ایک مبہوم سی مسکراہٹ پر شان کے لبوں پر بکھر گئی۔

چلے صاحب۔ میں جیب میں رکھ آتا ہوں۔ دوکاندار کی آواز پر وہ چونکا۔ اور جیب کی طرف ہولیا۔

بازار ختم ہو چکا تھا۔ سڑک سناں تھی۔ اکاڑ کا آدنی نظر آجاتا تھا اور بس۔ سوچوں میں دو بارہ ڈرائیو کر رہا تھا۔

کوئی فرلانگ بھر گئے ہوں گے۔ اُس نے دیکھا۔ اُس سے تقریباً بیس قدم آگے وہی لڑکیاں سڑک کے بائیں کنارے کچے راستے پر تیز قدم اٹھاتی چلی جا رہی تھیں۔ ان کے پیچھے پیچھے سڑک پر موٹر بائیک پر بیٹھے دو لڑکے تھے۔ شاہانہ کے دیکھتے ہی دیکھتے موٹر بائیک کچے میں اتری۔ لڑکیوں سے آگے بڑھی۔ ان کے سامنے سے گھوم کر دوبارہ پیچھے مڑی۔ اور واپس بازار کے رخ پر ہوئی۔

اُس کا دل اُچھل سا گیا۔ ایک لمحہ کو اُس کا پاؤں ہریک پر گیا۔ مگر پھر اُس نے دائیں نگے دیو مر میں سے دیکھا۔ موٹر بائیک کافی پیچھے چلی گئی تھی۔ اُس نے دیکھا۔ لڑکیاں ہونا۔ پتے راستے پر علی جا رہی تھیں۔ گوکہ قدم اپنے پیچھے سے کہیں تیز تھے۔

اُس کو اچانک ان پر غصہ آ گیا۔ ایسے وقت میں۔ ایسے موسم میں۔ دو لڑکیاں لڑکیاں۔ اکیلی۔

”وہ آہستہ آہستہ ڈرائیو کرتا ہوا۔ لڑکیوں سے قدرے آگے نکل آیا نظری اب بھی اپنے دیو مر پر تھیں۔

اور پھر۔ اُس کے اندازے کے عین مطابق۔ وہی موٹر بائیک اُسے



پچھلے آتی نظر آئی۔ اُس نے وہی رفتار رکھی۔ نظریا البتہ دیو مر پر جم کر رہ گئی تھیں۔ موٹر بائیک لڑکیوں کے بالکل پاس آ کر رُک گئی۔

اُس نے دیکھا۔ اُن میں سے ایک لڑکا اتر کر لڑکیوں سے بات کرنے لگا۔ دوسرا بائیک بالکل اُن کے سامنے لاتے ہوئے راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اور تھپی۔ شان بجلی کی کی تیزی سے پلٹا۔ چند قدم پر تو تھپی ہی۔ شان جیب روک کر اترنے لگا۔ تودہ دونوں لڑکیاں چھوڑ چھاڑ موٹر بائیک پر بیٹھ گئے۔ ابھی پیڈل پر ہی زور آزمائی تھی کہ شان نے گریبا نوں سے پکڑ کر دونوں کو اکٹھا ہی میچے گر ادیا۔

اور پھر۔ جہاں شان نے بائیک ڈرائیور کو گریبان سے پکڑا وہاں تاہر دوسرے کی مرمت گھونٹوں سے شروع ہو چکا تھا۔ اچھی طرح دونوں کی پٹائی کرنے کے بعد دونوں سے معافیاں منگوائیں۔ اُن کا ہنر نوٹ کیا اور واپس بھاگنے کے بعد۔ شان ہاتھ چھاڑتا لڑکیوں کی طرف بڑھ گیا۔ "دل چاہتا ہے آپ کو بھی ماروں اچھی طرح۔" وہ بے حد غصہ میں تھا۔

سہمی ہوئی زرین نے جھکی پلکیں اٹھا کر دیکھا۔ آج تو اس کا رنگ ہی کچھ اور تھا۔

اس سے قبل تک تو وہ اُسے سنجیدہ بے نیاز اور غریب سے اکڑا ہوا ہی دیکھتی آئی تھی۔ مگر اس وقت کا غیظ و غضب میں ڈوبا۔ پھنکارا مارتا۔ دھاڑتا زلیشاں تو اس کی سوچوں سے ہی بالاتر تھا

اس وقت مخاطب تو اس نے دونوں لڑکیوں کو کیا تھا۔ مگر نظریں اسی پر

مرکز تھیں۔ گویا عتاب کا شکار وہ ہی تھی۔

پتہ نہیں کیوں۔؟ اُسے اپنی غلطی کا احساس تھا۔ یا پھر اُس کے ادبچے،  
لمبے، گر جتے دھار تے وجود کی ہیبت گہرا کر اُس نے بلکیں چھکالیں۔ اس  
وقت۔ اس سے قبل کی طرح کوئی بیزاری، کوئی تیز نہ دکھا سکی۔

”میں پوچھتا ہوں آپ کو چین نہیں آتا۔ گھر نہیں بیٹھ سکتا۔ آرام

سے۔“ وہ مزید پھنکارا۔

سر جھکائے۔ بوٹکی ٹو سے زمین کریدتی۔ وہ اب بھی چپ کھڑی رہی۔

”بڑا بولڈ بنا پھرتی ہے۔“ وہ اُسی کو ہی گھورے جا رہا تھا۔ ”بڑا

CONFIDENT۔ خود کو کچھ سمجھتا ہے۔“

اور اُس کی چھکی بلکیں اُپر اُٹھیں۔ ایک دو بار جھپکیں گھوریدلیں  
کے اُس پار سے پانی کے قطرے جیسے چھلکنے کو تھے۔

شان ایک پل کو چپ سا ہو گیا۔

”نیچے اتریں زمین پر ذرا۔ اُس کو تو پُرانا بیر تھا۔ اس قدر جلد۔ یکدم ہی

قابو نہ پاسکا۔ اور دونوں لڑھک کر اُس کے خوبصورت گالوں پر آ رہے۔

شان گڑ بڑا گیا۔ ایک نظر دو قدم پر کھڑی دوسری لڑکی پر ڈالی۔ وہ

بھی پشیمان سی کھڑی تھی۔ دو بارہ اپنے شکار کو دیکھا۔

مگر اب وہ سکون پا چکا تھا۔ کئی دلفن کا جمع شدہ دل کا غبار بکل چکا

تھا۔ شاید اس لئے۔ اور پھر وہ قدم پر پڑ گیا۔ ایک قدم آگے بڑھا۔

”آپ لڑکیاں ہے۔ لڑکے نہیں ہے۔ اکیلے گھرنا آپ جیسے کے۔“ اُس نے اُسے



سوتے۔ لے کر پاؤں تک غور سے دیکھتے ہوئے کہا: بس کا کام نہیں ہے۔  
 اور نازک انگلیوں کی پوروں سے اُس نے اپنے گالوں پر سے آنسو  
 پونچھ لئے۔ سوں کر کے ناک کھینچی۔ اور چہرے پر گہرائی بالوں کی لمبی سی لٹ  
 جھٹک کر بچھے کر دی۔

”سوں! ایک بار پھر۔ انگلی ناک سے لگاتے ہوئے اُس نے ناک دہریچھی۔  
 اور نہ چاہتے ہوئے بھی شان کے لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ ابھرائی۔  
 ”جواب: ”شان نے جیب کی طرف اشارہ کیا۔  
 ”نہیں!“ اُس نے بچوں کی طرح سرفی میں ہلا دیا۔  
 اور شان نے ہنٹ بھینچتے ہوئے اپنی ہنسی روک لی۔  
 ”یہیں محترمہ! اُس نے دوسری لڑکی سے بھی کہا۔

ماہر اس دوران خلافِ عادت، خالوش کھڑا تمام کارروائی دیکھتا ہوا۔  
 شان کو جیب کی طرف آئے دیکھ کر چپ چاپ جیب میں جا بیٹھا۔  
 شان نے پچھلا دروازہ کھولا۔ اور ساکتی لڑکی کے اصرار پر ندین  
 کو سبکی بیٹھنا پڑ گیا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آیا  
 اور جیب اشارہ کر دی۔

پہلے فیسرین کا گھبراہٹا تھا۔ شان نے اس سے اتارا۔ چہرے پر اتنا سا ہنسی  
 کو تاثرات لئے شکر یہ ادا کرتی رہا کرتی تھی۔  
 تو یہ لڑکے لئے اسے مزید آگے جانا پڑا۔

عجب نزاکت کی پورٹ تھی۔ تب سے لے کر اب تک برابر روئے جاری تھی۔  
 اب تک نسرین اتاری نہیں تھی۔ اسے ہی چپ کر لینے کی کوشش میں لگی تھی۔  
 ندرین پلیر رو رہی تھیں۔ غنیمتوں نے سمجھیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا۔  
 چند ثانیے بعد وہ چپ ہو جاتی۔ مگر پھر۔

"نسرین۔ نسرین..." ساتھ ہی دوبارہ رونا شروع کر دیتی۔  
 اور پھر نسرین اپنے گھر پر اتارنے لگی۔ تو "نسرین مجھے اکیلے ڈر لگتا ہے تم  
 میں جاؤ۔" اس کی بھرائی ہوئی آواز شان اور ناہر صاف سن رہے تھے۔  
 ہر مخلوق عادت غاموش خاموش سا ہونے سے یاد ہو کر مسکرا دیا۔  
 "دیر ہو رہی ہے۔ درخت میں ہتھار رہے ساتھ جاتی۔ تم بھراؤ نہیں رہے یہ  
 شریف نورقائے پڑیں۔"

"ہاں۔ بگڑم شریف ہیں۔" ناہر بولیں پڑیں۔ مگر لہجہ بھاری بھاری سا تھا۔  
 "آپ لوگ مائینڈ مت کریں۔ یہ دیکھیں ہی جلد گھبرا جاتی ہے۔"  
 نسرین کا لہجہ محذرت لئے تھا۔

اور پھر وہ اپنے گھر پر اتار گئی۔  
 اب وہ آگے بڑھ رہے تھے۔ وقفے وقفے سے اب بھی اس کی  
 چٹکیاں صاف ستائی دے رہی تھیں۔

"نسرین ندرین۔ کیا آپ بتائے گئے پلیر کہ سا اپنے جولا ندرین سنگل رہے۔  
 اس کو اس طرف مڑنا ہے۔؟"

ندرین نے جلدی سے ہاتھوں کی آستینوں سے آنکھیں رگڑیں۔



”سوں“ کر کے لاکھ کھینچی۔ جلدی سے سامنے دیکھا۔ مہاجد پر گرنے پر پھر  
ڈانٹ پڑ جائے۔ ”لفٹ پر“ وہ رنڈھی ہوئی مرغوب کی آؤٹ میں بولی۔  
”DONT CARE“۔ شان کو اچانک اُس کی سیٹھ حامد علی کے یہاں  
ڈنر والی بے نیازی یاد آگئی۔ اور اس کا دل چاہا کہ وہ زور سے ایک  
قہقہہ لگائے۔

بائیں طرف مرنے کے بعد۔ چند مکانات کے سامنے سے گزرتے ہوئے۔ وہ قدر  
خالی جگہ پر آگئے۔ پھر آگے لائن میں چند اور مکانات نظر آئے۔  
”یہ ہیں ہے ہمارا گھر“۔ زرین سامنے دیکھتے ہوئے بولی۔  
وہ قریب پہنچ گیا۔ یہ چھوٹے چھوٹے سے چار مکان تھے۔ ”یہ ہے۔“  
شان پہلے مکان کے دروازے کے پاس جا کر رُک گیا۔  
”ہنیں۔ آگے“۔ وہ سر آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔  
اور ”زوں“ کر کے وہ آخری مکان پر آگیا۔

”بچھے“۔ وہ جلدی سے بولی۔ تیسرے نمبر والا مکان اس کا تھا۔  
”بچھے ہی سے تو آرہا ہے۔“ اٹا گیر لگاتے ہوئے وہ اچانک رخ  
اُس کی طرف کر کے تیزی سے بولا۔

اور وہ بوکھلا کر بچھے بہٹ گئی۔ ساتھ ہی سر پھر گھٹنوں پر پڑا گیا۔  
”لو بچھے آگیا۔“ اُس کے ررنے کا ارادہ بھاپتے ہوئے مذاق چھوڑ چھاڑ  
وہ نمبر دو مکان پر آتے ہوئے پھر نرمی سے بولا۔

بھگی آنکھیں لئے اس نے سامنے سے ہی دیکھا۔ یہ دوسرا مکان تھا

اُسے تیسرے پر اترنا تھا۔ مگر اب اس میں مزید آگے کہنے کی ہمت نہیں تھی۔  
 ”یہ پاس والا گھر ہے۔ میں خود ہی چلی جاؤں گی۔“ وہ اٹھنے لگی۔  
 ”آپ تشریف رکھئے۔ ہم آپ کو چھوڑ آتے ہیں۔“ اچانک ناصر لوں اٹھا۔  
 ادا خان نے جیب تیسرے مکان کے دروازے کی طرف بڑھا دی۔  
 زرین کی اتنی دروازہ داگئے پریشان سی کھڑی اندر سے ہی جیب کو  
 کھڑی ہوتے دیکھ رہی تھیں۔

”کہاں رہ گئی تھیں زرین بیٹے؟“ شام کے بڑھتے سائروں میں اُسے  
 غیر متوقع جیسے اترتے دیکھ کر اُن کا دل دھک سے رہ گیا۔  
 ناصر تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے زرین کے ساتھ ساتھ  
 ہی اُن کے دروازے کی طرف بڑھا۔ ہر سواندھیرا چھا گیا تھا۔ مکان کے  
 دائیں بائیں ایک دوسرے سے بالکل جڑے ہوئے چند مکان اور کھلی تھے۔  
 جوان لڑکی کا ایسے وقت کسی اجنبی گاڑی سے اُتکھڑے اندر گھسنا۔ ماں  
 کی پوچھ گچھ۔ پریشانی۔ شکی دنیا کے لئے کوئی نہ کوئی موضوع ہیا کرنے کو کافی تھا  
 اور پھر معلوم نہیں۔ کیا بات تھی۔

کچھ دیر قبل موٹر بائیک کا واقعہ۔ زرین کی پریشانی۔ اُس پر  
 عجیب سا اثر تھا اس واقعہ کا۔ زرین کی پریشانی جیسے اس کے دل  
 کو جھجھوڑے جا رہی تھی۔

”یہ۔ کون ہے۔؟“ وہ ناصر کو قریب آتے دیکھ کر مزید بولیں۔

”یہ۔ اتنی یہ.....“



اور اُس پورے واقعہ کے بعد۔ اب وہ ماں کی ہمدردی  
پاکر پھر رو پڑی۔

”میرا نام ناھر ہے۔ بہن ناحق گھبرا گئی ہیں۔ ایسی کوئی بات  
نہیں ہوئی....“

ماں کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

”اندر چلو۔“ اکھنیں بھی شاید دنیا کا خوف تھا۔ آہستہ سے زرین  
سے مخاطب ہوئیں۔ ”تم بھی آؤ بیٹیا۔“ اُنہوں نے اُسے بھی کہا۔ شاید پوری  
بات سن کر اپنی تسلی کرنا چاہتی تھیں۔

اور ریشان کچھ لمے چین سا۔ اندھیرے میں جیب میں بیٹھا اُس کا  
انتظار کرتا رہا۔

مگر جلد ہی اُسے ناھر غیبے لمحے ڈٹک پھرتا آنا دکھائی دیا۔  
اُس کے پیچھے ہی ریشان نے خاموشی سے جیب اسٹارٹ کر دی۔

رات کا کھانا اکھنوں نے کمرے میں ہی منگو الیا تھا۔ دونوں کھانے  
 میں مصروف تھے۔ مگر خلاف معمول دونوں ہی چپ چاپ تھے۔  
 ”ناصر کیا بات ہے۔ چپ چپ سا ہے“ شان نے ابتدا کی۔  
 ”کوئی خاص بات نہیں۔ بس پتہ نہیں۔ اس سارے واقعے نے کیوں  
 پریشان کر دیا۔“ ناصر جیسے زبردستی مسکرایا۔  
 ”ہوتا رہتا ہے۔ کوئی اتنا اہم بات نہیں ہے“ شان اس کا دھیما  
 بٹانے کو لا پرواہی سے بولا۔  
 ”پتہ نہیں کیوں اُس لڑکی کو پریشان دیکھ کر میں کبھی پریشان  
 ہو گیا۔“ ناصر مزید بولا۔  
 اور شان کے پُرکشش چہرے پر ایک سایہ سا ہرا گیا۔  
 ”تو تم گھر تک ساتھ گیا تھا۔ شان۔ پاٹ سے لہجے میں بولا۔  
 ”اسی لئے تو ساتھ گیا تھا۔ ناصر نے کہا۔



”ہوں۔“ شان نے ہنکا مارا بھرا۔

”ہمارے معاشرے میں لڑکی۔“ ناہر جیسے اپنے آپ سے مخاطب تھا۔  
 ”بجاری کچھ بھی تو نہیں۔ دو قدم بھائی کے ساتھ بھی چلے تو دور سے  
 دیکھنے والے غلط اندازے لگانا شروع کر دیں۔“

”وہ تو ہے۔“ شان بڑے ٹھہرے انداز میں بولا۔  
 ”بجاری کی ماں پریشان ہو گئی تھی۔ اُسے ہمارے ساتھ دیکھ کر۔“  
 ”ہمارے ساتھ نہیں۔ تمہارے ساتھ۔“ شان کا لہجہ اجنبی

اجنبی سا تھا۔

”کیا مطلب۔؟“ ناہر نے وضاحت چاہی۔

”مطلب یہ کہ۔ میں۔ میں تمہاری جیسا پریشان نہیں ہوا۔ مجھ کو  
 کوئی INTEREST نہیں ہے۔ اس پورے معاملے سے۔“ شان کے لہجہ  
 میں بے حسی اور طنز کی ملی جلی کیفیت تھی۔  
 ناہر کچھ تیراں سا اُسے دیکھنے لگا۔  
 پھر۔ آہستہ سے مسکرا دیا۔

”تم تو اس بے چاری کو ڈانٹتے ہی جا رہے تھے۔“ وہ سن کر بولا۔  
 جیسے ماحول کو خوشگوار بنانے کی کوشش کر رہا ہو۔

”ہاں۔“ شان کو اچانک جیسا۔ بے لب و لہجہ کا احساس ہو گیا۔  
 گلاس میں سے پانی پیتے پیتے وہ خوش گواری سے کہنے لگا۔ تم ڈانٹنے  
 کا کہتا ہے۔ میں تو اُسے لگا بھی آتا۔ دو تین۔ اگر وہ ٹپ ٹپ آنسو

بہانا شروع نہ کر دیتا تو۔

”ویسے ایک بات میں نے نوٹ کی تھی۔“ کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے شان کو بشاش دیکھ کر وہ بھی بشاشت سے بولنے لگا۔  
 ”قصور دونوں لڑکیوں کا تھا۔ مگر تم زمین کو ہی ڈانٹے جا رہے تھے۔“  
 ”تم کو کیا معلوم۔ اُس کا بہت اونچا دماغ ہے۔ اپنے آپ کو کچھ سمجھتا ہے۔ آسمانوں پر رہتا ہے محترمہ۔“ چچ میں لئے جیلی کے لال لال شفاف رنگ کو گھورتے ہوئے شان مسکرا مسکرا کر کہہ رہا تھا۔

کچھ دیر قبل کے تاریک سائے چہرے پر سے معدوم ہو گئے تھے۔  
 ”I SEE۔“ جی ڈانٹے وقت بھی اُسے زمین پر اتر آنے کو کہہ رہے تھے۔ ”ناہر بیٹے ہوئے بولا۔“ ویسے میری ایک نصیحت مانو۔ غصہ ہو تو اردو کبھی مت بولا کرو۔ سارا IMPRESSION خراب پڑا ہو گا۔“

شان کو احساس تھا۔ غصہ کی حالت میں وہ کبھی اس زبان سے انصاف نہیں کر پاتا تھا۔

کھپانا سا وہ اپنی گردن سہلانے لگا۔  
 ”چلو۔ آئندہ خیال رکھنا۔“ ناہر نا صحانہ انداز میں بولا۔  
 تو شان خوبصورتی سے ہنس دیا۔  
 ”اس کو میں نے پہلے بھی دیکھا ہے۔“



”کہاں۔؟“ ناصر نے پوچھا۔

”سیٹھ حامد علی کے گھر ڈنر۔ تمہارا آنے سے ایک روز پہلے۔“

”یہ وہاں کیا کر رہی تھی؟“ ناصر کو حیرانگی سی ہوئی۔ ایک عام بوسیدہ سے کوارٹر میں۔ ایک اکیلی ماں کا ساتھ۔ اتنی دور۔ اتنے بڑے آدمی کے یہاں ڈنر پر۔؟

”I DON'T KNOW۔ لیکن یہ ہے وہی۔“

”جی بھی تمہیں اُس دن میوزیم میں بھی دیکھ رہی تھی ناصر کو اچانک یاد آیا۔ اُس نے واقعی زمین کو نظریں اٹھا کر شان کی طرف دیکھتے دیکھا تھا۔

”شاید“ شان نے جواب دیا۔

”تو یوں کہو بُرائی عداوت ہے“ ناصر زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔

”پکا دشمنی ہے۔“ جیلی کا پیالہ میز پر رکھتے ہوئے شان

اٹھ کھڑا ہوا۔

”دوستی کا کوئی امکان نہیں۔؟“ ناصر اچانک اپنا پاؤں اُس کے

پاؤں کے آگے رکھ کر اُس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

شان آگے بڑھتے ہوئے ٹک گیا۔

ایک نظر اُس نے بھی ناصر کی آنکھوں میں جھانکا۔

اور پھر اُس کی بے حد خوبصورت آنکھیں شرارت سے چمک اٹھیں۔

بول کے گوشے مسکراہٹ سے بار سے پھڑپھڑا اٹھے۔

”سوں“ انگلی سے اپنی ناک چھوتے ہوئے۔ ”سوں“ کر کے  
شان نے ناک اوپر کھینچی۔

اور ناصر کو روتی بورتی ”سوں“ کر کے ناک اوپر کھینچتی زیر  
یاد آگئی۔ ناصر۔ اس دوران پہلی بار جانتا رہتا تھا۔ لگا اٹھا۔  
”یعنی امکان ہے۔۔۔؟“

”سوں“ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ایک بار پھر زین  
کی نقل اتار لی۔

”نانا کر کے پیار تمہیں سے کر بیٹھے۔“ ناصر کرسی سے اٹھ کر گنگنا تا ہوا  
باتھ روم چل دیا۔

اور شان جلتی لکڑیوں کے آگے فیٹل پیس سے پشت ٹکائے  
کھڑا سوچوں میں گم تھا۔

گا ہے گا ہے خوبصورت آنکھیں چمک اٹھتیں۔ دلفریب مسکراہٹ  
لبوں پر پھیل جاتی۔



کل انہوں نے واپس چلے جانا تھا۔ آج آخری دن تھا۔ یہاں۔  
 دن کے گیارہ بجنے والے تھے۔ دو ایک ضروری کام کرنے کو تھے۔ مگر  
 جیب میں کچھ گڑ بڑ تھی۔ ایک تو بریک آئیل ختم معلوم ہو رہی تھی تھوڑا  
 اور بھی کام نکل آیا تھا اس میں۔ یہ سب ٹھیک کر دانا تھا۔ درجہ  
 کل کا پرنسپل راستہ کا ٹنا مشکل ہو جاتا۔ لہذا جیب اس وقت ایسی  
 سلیے میں ہوٹل کے منیجر کی تحویل میں تھی۔ اور۔

شان اور نامزد دونوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے ہوٹل کے کمرے  
 میں آگ تاپ رہے تھے۔

دفعۃً ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ شان نے اٹھ کر رہ سو کیا۔

”یس۔ دریشان اسپیکنگ“ وہ حبیب عادت بردہار لہجے میں بولا۔

”میں۔ میں۔“ زبین بول رہی ہوں۔“ گھبرائی سی۔ سہی سی۔

آواز آئی۔ اور۔ شان نے اپنی ہنسی بمشکل روک لی۔

”جی۔ اُس نے اطمینان سے کہا۔

”وہ۔۔ ناصر صاحب۔ ہوں گے؟“ حواس اب بھی مجتمع نہ ہو سکے تھے۔ اور شان کی آنکھوں میں چھائی شرمی معدوم ہو گئی۔

پُرکشش چہرے پر تاریک سایوں کا جال بچھ گیا۔

”نہیں۔ بات کریں۔“ اُس کا لہجہ ڈوبا ڈوبا سا تھا۔ اور پھر اُس

نے ریسور ناصر کو پکڑا دیا۔

”جی بول رہا ہوں۔“ ناصر بولا۔ ”نہیں ہم لوگ کل جا رہے ہیں۔

کیوں؟۔ وہ۔ کیا ہوا انھیں؟ اچھا۔ مجھے آنے کو کہا ہے؟۔ نہیں۔

نہیں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں آجاتا ہوں۔ اچھا۔ خدا حافظ۔“

ناصر نے ریسور رکھ دیا۔

وہ کچھ پریشان سا نظر آ رہا تھا۔ زرین نے فون کیا تھا۔ رات

اُس کی اتنی کی طبیعت خراب تھی۔ اس وقت اُسے بلانے کو زرین سے

کہا تھا۔ کچھ عجیب سی سچویشن ہو گئی تھی۔ ویسے بلایا ہوتا تو مال بھی جلتا

مگر بیماری کی بات تھی۔ اور پھر اُسے ہی بلایا تھا۔

”چلے جاؤ۔ سوچ کیا رہے ہو۔؟“ کھڑکی کے پاس کھڑا شان

اجنبی سے لہجے میں بولا۔

”زرین کی اتنی کی طبیعت رات سے خراب ہے۔ زرین کہتی تھی۔

انکھوں نے مجھے بلایا ہے۔“

”وہی تو کہتا ہوں۔ چلے جاؤ۔“ چہرے پر اب بھی گہری سنجیدگی کی چھاپ



تھی۔ لہجہ اب بھی بالکل اجنبی تھا۔

”تم بھی چلو۔“ ناصر نے مشورہ دیا۔

”No۔“ ہرنٹ بھینچتے ہوئے اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”اکیلے جاتے ہوئے کچھ اچھا نہیں لگتا۔“ ناصر الجھسا گیا تھا۔ ”نہ جائے

ماندن نہ پائے رفتن۔“ والی بات ہو رہی تھی۔

”کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کل شام بھی تو اکیلا ہی گیا تھا۔ اُس کا لہجہ

سنگینی سی لے ہوئے تھا۔

آگے بڑھ کر اُس نے روم سروس کے نمبر ڈائل کرتے ہوئے ٹیکسی

کے لئے کہہ دیا۔

ٹیکسی آ رہا ہے۔ تم چلو۔ میں تب تک کچھ ضروری خطوط لکھ لوں گا۔

اب کے اُس کا لہجہ مصالحت آمیز تھا۔

اور پتہ نہیں کیوں۔ چند ثانیہ قبل کے شان کے لہجے سے ناصر

الجھسا اور اب کے COMPROMISING لہجے سے وہ کچھ مطمئن سا

نظر آنے لگا۔

”چلا جاؤں۔؟“ اُس کی پرانی خوشی عود کر آئی۔

”ہاں۔!“ شان نے سادگی سے کہا۔

”کوئی پکڑا تو نہیں لے گا۔؟“

”تم پکڑائی نہ دو۔ تو کوئی نہیں پکڑے گا۔ شان کا لہجہ ذومعنی تھا۔

”وہاں ہے ہی کون۔ جوں کو میں پکڑائی دوں گا۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے

ناھر ڈرینگ روم میں گھس گیا۔ اور شانِ اقدس سے حیرت سے ڈرینگ روم  
کے پہلے پردے کو تکتا رہ گیا۔

تبھی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔

”یس۔“ شان وہیں کھڑکی کے پاس ٹیک لگائے لگائے بولا۔  
”صاحب۔ ٹیکسی آگئی ہے۔“ اندر آتے ہوئے بیرے نے موڈ بے طریق

سے اطلاع دی۔

”او۔ کے۔ آر پاس ہے۔“

اور بیرا واپس چل دیا۔

”آگیا ہوں۔“ ناھرا چانک ہی ڈرینگ روم سے نکل کر ٹائی کی

گرہ درست کرتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔

”اے۔“ اُس نے پکارا۔

ناھر رک کر مڑا۔

”جلدی آنا۔“ اُس نے کہا۔

”او۔ کے پاس۔“ ناھر نے سیلوٹ مارا۔

اور شان دھیرے سے مسکرا دیا۔

کل رشام زرین کی اتنی کی تسلی کی خاطر وہ زرین کے ساتھ اُن

کے گھر کے اندر چلا گیا تھا۔ جلدی جلدی مختصراً اکھنیں نوٹریا لیک والا

واقعہ سنایا تھا۔



”اس واقعہ کے بعد ہم لوگوں نے ضروری سمجھا کہ ہن کو گھرتک  
چھوڑ آئیں گے۔“

”اور بھی کوئی ساتھ ہے بیٹا۔؟“ زرین کی اتنی کے حواس کچھ  
درست ہوئے تو انھوں نے پوچھا۔

”جی ہاں۔ میرا ملاوڑا بھائی ہے باہر چپ میں۔“

”یہاں کس جگہ ٹھہرے ہو۔؟“ انہیں وہ یہاں اجنبی لگا تھا۔

”جی ہوٹل میں۔“ ہوٹل کا نام بتاتے ہوئے ناصر نے کہا تھا۔

”کہاں سے آئے ہو بیٹا۔ تم لوگ۔؟“ اپنا محسن سمجھتے ہوئے یا

کچھ عداوت ہونے کے ناطے تجسس ہونے کے سبب انھوں نے مزید  
پوچھ لیا تھا۔

اور۔ پھر ناصر نے انھیں اپنے علاقے کا نام بتا دیا تھا۔

”شاہان احمد میرے ماموں ہیں۔“

”تمہارا کیا نام ہے بیٹے۔!“

”ناصر علی۔“ اُس نے اپنا نام بتایا۔

”باپ کا کیا نام ہے؟“

ناصر کو دل ہی دل میں ہنسی آئی تھی۔ اتنی جلدی اور اتنے تھوڑے

سے وقت میں وہ اس کا پورا انٹرویو لے رہی تھیں۔ بعض غور توں کی

عادت ہوتی ہے۔ اُس نے سوچا تھا۔

”یا سر علی۔ اچھا اب میں اجازت چاہوں گا۔ خدا حافظ۔“ اور۔

مزید کچھ کہے سننے بنادہ باہر نکل آیا تھا۔

”بیدھے جانے صاحب۔“ اچانک ٹیکسی ڈرائیور بولا۔ اور اس کی محویت ٹوٹ گئی۔

”ہاں۔ اگلا لائٹ سگنل آئے گا تو لفٹ پر مڑ جاؤ۔“

”اچھا صاحب۔“ ڈرائیور نے کہا۔

آگے جا کر ٹیکسی بائیں جانب مڑ گئی۔ اور پھر جاتے جاتے آخر کار زرین کے گھر کے دروازے پر جا کر رُک گئی۔

اُتر کر اس نے کرایہ ادا کیا۔ اور آگے بڑھتے ہوئے ہولے سے دروازہ پھینچھایا۔

پل بھر میں دروازہ کھلا۔ زرین نمودار ہوئی۔

”آئیے ناھر بھائی۔“ اُس نے کہا۔ ناھر اندر داخل ہوا۔

چھوٹا سا مَحن تھا۔ سامنے ہی چھوٹے سے برآمدے کے ایک سرے پر

بادرچی خانہ اور دوسرے سرے پر شاید غسل خانہ تھا۔

”اتنی کمرے میں ہیں۔“ برآمدے میں کھلتے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ آگے آگے ہوئی۔

اور ناھر جھجھکتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔



انیس بیس سال قبل۔ یہاں سے کوسوں دور چھوٹے سے گاؤں کے  
 چھوٹے سے مکان میں۔ میں اور میری بیوہ ماں رہتی تھیں۔ دگاؤں  
 والوں کے کپڑے سی کی کر میرا اور اپنا پیٹ پال رہی تھیں۔ میں نے آٹھ جگہ  
 پڑھ لیں تو اسی اسکول کی ہیڈ ماسٹر نے ہم ماں بیٹی کی بے کسی پر ترس  
 کھاتے ہوئے مجھے اسی اسکول میں پرائمری جماعت کو پڑھانے پر رکھ لیا۔  
 اوریوں میرا اور میری ماں کا گزر بسر ہونے لگا۔

الیکشن کے دن آئے تھے۔ ہر طرف یا سرخلی کے نام کا پول بالا تھا۔ خاندانی  
 امارت اور شرافت کی دھوم تھی۔ اور پھر۔

ایک دن معلوم ہوا۔ وہ ہمارے گاؤں آئیں گے۔ اسکول کا بھی معائنہ  
 کریں گے۔ وہ اسکول آئے، معائنہ کیا۔ چلے گئے۔ مگر جانے انھیں ایسی کوئی  
 چیز بھاگئی کہ ہفتہ پھر بعد ہی وہ ہماری کٹیا پر بھی آشریف لائے۔ ماں  
 چونکی۔ ہم شریب ضرور تھے۔ مگر عزت والے تھے۔ جو ان بیٹی کا سنا تھا تھا۔ مال کا

دل دھڑک اٹھا۔ چلے پانی سے تواضع تو کی۔ مگر ماتھے پر بل پڑ چکے تھے۔  
 یاسر علی تھوڑی دیر رہ کر ہم لوگوں کا حال احوال پوچھنے کے بعد چلے گئے۔ ماں کا  
 خیال تھا کہ اُن کا رویہ یا سر علی کا حوصلہ پست کرنے کو کافی تھا۔  
 مگر یہ اُن کا خیالِ خام تھا۔

وہ کوئی اثر لے بغیر دوبارہ آئے۔ سہ بارہ آئے۔ اور اب تو مجھ سے بھی اُن  
 کی آمد کا راز چھپ نہ سکا۔ وہ مجھے پسند کرنے لگے تھے۔

"بیٹا ہم غریب ضرور ہیں، مگر عزت والے ہیں۔ تمہارا یوں آنا جانا، یہیں  
 گاؤں میں ذلیل کر دے گا۔" ماں نے آخر کہہ ہی دیا۔

اور۔ یا سر علی اپنی چوری پکڑتے دیکھ کر سہم سے گئے۔

"ہم تمہاری قدر کرتے ہیں مگر غریب اور امیر کا کبھی میل نہیں ہو سکا بیٹے!

تم آئندہ مت آنا۔" ماں غریب ضرور تھیں۔ مگر سخت طبیعت کی مالک تھیں۔  
 صاف منہ پر کہہ دیا۔ یا سر علی مڑ جھا کر رہ گئے۔

کوئی دو ہفتہ بعد پھر آ گئے۔

"تم سکینہ میں دلچسپی لیتے ہو۔ میں سمجھتی ہوں۔ مگر ہمارا مذہب ہمارا معاشرہ

صرف دلچسپی لینے کا قائل نہیں ہے۔ اگر تم واقعی سنجیدہ ہو تو سکینہ سے نکلتی

کر لو۔ ورنہ آئندہ کبھی اس گھر کا رخ نہ کرنا۔" گاؤں میں گھر بکھر سونے لگی

تھیں۔ اور ماں مزید برداشت نہ کر پائیں تھیں۔

چند دن اور گزر گئے۔ اور پھر۔ ماں کے خلاف توقع یا سر علی نے

لپٹہ ایک درست ماہد صاحب اور میرے رشتے کے چچا کی موجودگی میں مجھ سے



نکاح پڑھالیا۔ دو دن وہاں رہے اور پھر اپنی زمیندار کی سلسلے میں اپنے گاؤں واپس چلے گئے۔ ہفتہ بھر بعد پھر آئے۔ دو دن رہے۔ جب جانے لگے تو ماں نے مجھے ساتھ لے جانے کو کہا تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر ٹال گئے۔ اگلی بار لے جانے کو کہہ کر چل دیئے۔

پھر یوں ہی ہوتا رہا۔ ہفتہ بعد آنے کے بجائے مہینہ بعد آنے لگے۔ اصرار مجھے ساتھ لے جانے پر بڑھتا رہا۔ اب بجائے سر جھکا کر بوند بوند بات سننے اور کہنے کے جھجھلانے لگے۔ اور پھر تین تین چار چار ماہ گزر جاتے ان کے آنے میں۔

زرین کی پیدائش میں دو ماہ باقی تھے۔ ماں پریشان تھیں یا سر علی کے کہنے پر میں نے اسکول کی ملازمت بھی چھوڑ دی تھی۔ پریشانی میں دن گزر رہے تھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر ہو کیا۔ خود اپنی مرضی سے تو نکاح کیا تھا۔

پھر ایک دن ہیڈ مٹریس ہمارے یہاں آئیں۔ میری حالت زار کا پتہ تھا تو صرف اُنھیں۔ اور اُنھوں نے ہی یہ راز افشا کیا۔ کہ یا سر علی تو پہلے سے شادی شدہ ہیں۔ اپنی خالہ زادی سے شادی ہوئے چند برس ہوئے ہیں۔ پانچ چھ سال کا ایک بیٹا بھی ہے۔ ہم لوگوں پر قیامت ٹوٹی۔ نکاح سے قبل جب ماں نے پوچھا تھا کہ ان کی کہیں سنگنی وغیرہ تو نہیں ہوئی تو صاف انکار کر گئے تھے۔ ماں تو یہ کسی طور نہ چاہتی تھیں کہ پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے اپنی بیٹی دے کر اُس پر ظلم کریں یا پھر اپنی بیٹی کی زندگی آگ میں جھونکیں۔

یا سر علی آئے تو اس بات کی تصدیق ہو گئی۔ پہلی شادی ہوئے سات سال

رو چکے تھے۔ بیٹا ناصر علی چھ سال کا تھا۔ ہمیں بتایا اس لئے نہیں تھا کہ بقول  
ان کے ماں تہذیب و تمدن کی تھیں۔ حقیقت معلوم ہو جانے پر یقیناً میرا رشتہ نہ دسے۔  
پھر میں نے۔ ماں نے دونوں نے کہا۔ مجھے ساتھ لے چلیں۔ نوکرائی  
کرائی کی بیوی کی خدمت کروں گی کہ میری ہی وجہ سے ان پر زیادتی  
ہوئی تھی۔ پھر ماں کی زندگی کا بھی کوئی بھروسہ نہیں تھا۔  
مگر بقول ان کے وہ میری شکل بھی نہیں دکھانا چاہتے تھے اپنی بیوی  
اور یہ درست بھی تھا۔

دن بہر حال گزرنے لگے۔ اب معلوم ہوا کہ وہ مجھے کیوں ساتھ لے  
بلنے سے کتر رہے تھے۔

زرین پیدا ہوئی۔ یا سر علی کو اطلاع دینا چاہی بھی تو نہ دے سکے۔  
باوجود اصرار کے کسی بھی قسم کا کوئی پتہ نہیں دیا تھا۔ پہلے تو شک و شبہوں  
سا ماں بیٹی پڑ جاتی تھیں۔ اب کچھ ڈھارس بندھی کہ گھر میں پہلی بیوی  
موجودگی کی وجہ سے ایسا کہہ رہے۔

اب کے آئے تو زرین چار ماہ کی تھی۔ سوچا تھا کہ دیکھ کر خوش  
ہوں گے۔ مگر شکل تک دیکھنی گوارا نہ کی۔ گفتہ بھر کو آئے۔ ماں نے بیٹی دیکھنے  
کہا۔ طنز سے مسکرائے۔ اور برہم برہم چل دیئے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا  
تھا کہ کس تصور کی پاداش میں یہ صلہ مل رہا تھا۔

دوسری شادی۔ بیٹی کی پیدائش۔ سب راز میں تھا سدا زواں تھے  
رف ماجد صاحب۔ یا سر علی نے کسی کے کان میں کھنک تک نہ پڑے دیکھے۔



یوں بھی اُن کا علاقہ بہت دور تھا۔ ہم اس گمنام سی جگہ میں پڑے تھے۔ کسی کا آنا جانا ہوتا نہیں تھا۔ اب پتہ چلا کہ اسکول جانے سے بھی اسی لئے روکا گیا تھا اور پھر ہمیں بھی سختی سے منع کیا گیا تھا۔ کہ یوں جو مجھے اور ذرین کو تھوڑا بہت حق حاصل ہے وہ بھی جاتا رہے گا۔

یا سر علی شروع شروع میں تو فراغ دلی سے خرچ دے جاتے تھے۔ بعد میں یہ بھی کم پڑتا گیا۔ اور پھر اب تو ان کا آنا بھی برائے نام ہو کر رہ گیا تھا۔ خرچ ظاہر سے اُن کے آنے کے بعد ہی دلتا۔ ماہوار خرچ بھیجنا اکھنوں نے کبھی گوارا نہ کیا تھا۔ جوں توں کر کے دن گزر رہے تھے۔ یا سر علی کے پیارا اور توجہ کا یوں سے سوڑے کے اُبال کی طرح بیٹھ جانا اب کوئی مجھ نہ رہا تھا گھر میں بیوی تھی، بچی تھا۔ مگر رنگین طبع ہونے کے باعث ادھر ادھر نوٹنگھنے پھرنا اُن کی عادت تھی۔ مجھ سے نکاح۔ ماں کی شروع کی تند خوئی۔ کادوں والوں کی کھسکھس اور پھر قسمت کا لکھا تھا۔ اور اب یوں خبر نہ لینا۔ نہ آنا بے رُخی برتنا۔ یہ بھی اُن کی طبیعت کا خاصہ تھا۔

وہ تو پھول پھول سوٹنگھنے کے عادی تھے۔ یوں مستقل کسی ایک پھول ہی منڈا ہوتا تو گھر میں ہی اپنی اتنی اچھی بیوی پر قناعت نہ کر لیتے۔ قسمت کے لکھے پر ہم ماں بیٹی شاکر بھی ہو جاتیں۔ اگر زندگی کا کوئی نہ تو اتار چل پڑتا تو۔ مگر یہاں تو نہ خود آتے تھے، نہ خبر دینے دیتے تھے۔ خرچہ بھی اب بڑھ گیا تھا، ذرین کی پیدائش سے۔ میری تنخواہ بھی نہ رہی تھی۔ دے کے ماں کی سلامتی تھی، جس پر ہم لوگ پل رہے تھے۔ کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ سب کیا دھرا پنا تھا۔

پھر۔ ایک دن بہت مجبور ہو کر میں نے ڈرتے ڈرتے ماجد صاحب کو خط لکھا کہ کوئی اور چارہ ہی نہ تھا۔ وہ شریف اور کھیلے آدمی ہیں۔ آئے ہمارے حالتِ ناز دیکھی اور واپس جا کر یاسر علی کو سمجھانے کا وعدہ کیے۔  
 یاسر علی آ تو گئے۔ مگر مجسم عتاب بن کر کہ میں نے ماجد صاحب کو بنایا کیوں، اپنی حالت کیوں بتائی۔

بعد میں بہر حال۔ قدرے نرم پڑ گئے۔  
 زرین کو دیکھا۔ بولے۔ "میری کاپی ہے۔" اور مدتوں بعد یہ جملہ میرے کانوں میں رس گھول گیا۔ کچھ رقم بھی دے گئے۔ اور خلاف توقع مجھے تسلی دیتے ہوئے بولے۔

"اب کے کچھ نہ کچھ بند و بست ضرور کر دوں گا، تم دونوں کو یہاں سے لے جانے کا۔" اور جلدی دوبارہ آئے کو کہہ کر چلے گئے۔  
 "میری کاپی ہے۔" چند دن بعد ہی ننھی سی زرین کے کپڑے بدلانے ہوئے میں بڑ بڑائی۔

زرین کلکاری مارتے ہوئے سنیں پڑی۔ شاید نادانستگی میں گدگدی ہو گئی تھی۔ "یاسر کی کاپی" میں نے اُس کے گال کو چوم لیا۔  
 "کیا کہتی ہو۔ مس شکیلہ۔؟" صحن میں سے ماں کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ پتہ نہیں کیوں میں زرین کو لئے لئے گھبرا کر باہر نکل آئی۔  
 ماں سکتے کی حالت میں ہیڈسٹریس کو گھور رہی تھیں۔  
 "کیا ہوا میں۔؟" میں پاس پہنچی۔



"انہوں نے اخبار تھمایا۔ یا سر علی کی تصویر تھی۔ ایک دن قبل گاڑی کا ایکسڈنٹ ہوا تھا۔۔۔۔" سکیٹہ بیگم چیخ چیخ کر رونے لگیں۔

جیسے۔ اٹھارہ انیس سال قبل نہیں آج ہی ان کا ایکسڈنٹ ہوا ہے۔  
ناصر کا بکا انہیں دیکھ رہا تھا۔

زرین کبھی کی چائے لا کر ناصر کے آگے منبر پر رکھنے کے بعد ماں کے سر ہانے جا کھڑی ہوئی تھی۔

"اور یوں میری دکھی زندگی ایک بار پھر خوشیوں سے ہمکنار ہوتے ہوتے ہمیشہ کے لئے دیران ہو گئی۔" اچھی طرح رو لینے کے بعد وہ پھر بولیں۔  
ناصر اب بھی گم غم انہیں رہا تھا۔

اُس کی ماں کی سوکن۔ اُس کی ماں جس نے اُسے جنم دیا تھا۔ اُس پر زندگی کا ہر ٹکڑا بچھا دیا تھا۔ کتنا بڑا ظلم ہوا تھا اُن پر۔ باپ کی رنگینی طبع کے قصے اُسے معلوم تھے۔ کلی کلی منڈلاتے پھرنا اُن کی عادت تھی۔ مگر کیا اتنا کافی نہیں تھا؟ دوسرا نکاح۔ دوسرے نفقوں میں کیا ایک مستقل رقیب لانا ضروری تھا؟ ماں کی روح پہلے کیا کم دکھوں تلے دبی تھی۔؟  
نفرت کی ایک شدید لہر اُس کے سراپا میں برائیت کر گئی۔ اُس نے غور سے اپنی ماں کی حریف کو دیکھا۔

اڑنیس انتالیس کا سن۔ زردی مائل سفید سے چہرے پر وقت سے پہلے گہرائی جھریاں۔ پرانی سی شاال سے جھلکتے سفیدی مائل بال۔ لامتناہی دکھ سپرے اندر کو دھنسی غلامی آنکھیں۔ ماتھے پر مستقل نمازی پن کا مقدس نشان۔!

" ماں بوڑھی تھیں۔ اکلوتی اولاد کے مستقل غم نے زیادہ مہلت نہ دی۔ چھ ماہ کے اندر ہی مالک حقیقی سے جا ملیں۔ ہم ماں بیٹی اس بھری دنیا میں اکیلی رہ گئیں۔ ہیڈ مٹر میں بہت رحمدل تھیں۔ مجھے دوبارہ نوکری دلوادی۔ میں زرین کو ساتھ لے کر اسکول جانے لگی۔ مگر دنیا بہت بُری ہے بیٹا۔ اکیلی عورت کو کسی حال میں جینے نہیں دیتی۔ گاؤں کا ایک اوباش آدمی پہلے تو اسکول آتے جاتے راستے میں تنگ کرنے لگا۔ پھر ایک دن گھرا گیا۔ مجھ سے شادی کا تقاضا کرنے لگا۔ اس کی نظر ہمارے لڑے پھوٹے مکان۔ میری تنخواہ کے چند روپوں اور اُس کے خیال میں یا سرحد دولت میرے لئے چھوڑ کر گئے تھے، اُس پر تھی۔ اُس دن تو ڈانٹ ڈپٹ کر چلتا گیا۔ مگر ڈھیٹ تھا۔ دوبارہ آیا۔ اب کے اُس کی نیت کچھ ٹھیک نہ لگتی تھی۔ میں زرین کو لے کر بہانے سے کھڑکی کے راستے پاس والے مکان میں چلی گئی۔ وہ رات بھی وہیں رہی۔ اور اگلے دن زرین کو ساتھ لئے چند ضروری چیزیں سمیٹے ہیڈ مٹر میں لے کر یہاں چلی گئی۔ اکیس سارا واقعہ سنایا۔ وہ بختہ عمر کی عورت تھیں۔ دنیا دیکھے تھیں۔

اور پھر۔ اکیس کے شورے پر میں نے اپنا مکان بیچا اور زرین کو لے کر چپ چاپ کوسوں دور اس شہر میں اُن کی چھوٹی بہن کے پاس، جو اب بھی یہاں پبلک اسکول کی پرنسپل ہیں چلی آئی۔ مجھ پر ان لوگوں کے بڑے احسان ہیں۔ پرنسپل نے مجھے یہاں بچوں کو اسلامیات پڑھانے پر اسکول میں رکھ لیا۔ اور اسکول کے ساتھ لگے اس کوارٹر میں جس میں پہلے سے ایک استانی رہتی تھی۔ جگہ دلوادی۔ مکان بچنے سے جو بونجی ہاتھ لگی تھی، وہ اکیس کے شورے سے



بنک میں رکھوائی۔ پچاس روپے ماہوار اُس کا آجاتا تھا۔ دوسروں کے سکول  
 سے مل جاتے تھے۔ ساتھ ہی رات کو دیر تک بیٹھ کر سلائی کرتی تھی۔ سو ڈیڑھ  
 سو اُس کے بن جاتے تھے۔ ادویوں میرا در زین کا گزرا دقات چل نکلا۔  
 وقت گزرتا رہا۔ گاؤں کی ہیڈ مٹریس ہمارا حال احوال لیتی رہیں۔  
 اُن کی چھوٹی بہن، بہنوں سے بڑھ کر مہربان ہیں۔ زین چار سال کی  
 ہو گئی تو انھوں نے اُسے اسکول میں داخلے دے دیا۔ چار پانچ سال  
 رہ کر میرے ساتھ اس کو ارٹ میں رہنے والی اُنٹائی کی تبدیلی دوسرے شہر  
 ہو گئی تو پرنسپل نے ازراہ ہمدردی ہمیں اس کو ارٹ میں رکھ لیا۔  
 نئی جگہ آ کر ایک تو گاؤں والوں کی نظروں سے بچ گئی۔ دوسرے  
 ماحول بھی کچھ تبدیل ہو گیا۔ اور پھر سب سے بڑی بات جس کی ہر وقت  
 فکر رہتی تھی کہ زین کو کوئی باپ سے متعلق باتیں بتا کر بد دل نہ کرے  
 یاد بھی نہ کرے وہ فکر بھی جاتی رہی۔ یوں زندگی ایک مستقل ڈگر پر آ گئی۔  
 ماجد صاحب کا فدا بھلا کرے سال دو سال بعد خیریت پوچھ جاتے  
 ہیں۔ اب تو ایک زمانہ گزر گیا۔ اُن کے بھی بچے جوان ہیں۔ پچھلے دنوں  
 اپنی بیگم اور بیٹی فرزانہ کو بھی ساتھ لائے تھے۔ اصرار کر کے زین کو بھی  
 ہفتہ بھر کے لئے ساتھ لے گئے تھے۔ بہت خیال رکھتے ہیں۔ اُن کی بیگم  
 تو مقرر تھیں کہ زین اب جوان ہے، اس کی بات اس کے وارثوں سے  
 کرنی چاہیے۔ مگر وارث تو خدا ہے۔ میں نے منع کر دیا۔ کیا گڑھے مردے  
 اکھیرنے۔ اور پھر زین میری ساری پونجی ہے۔ مبادا لینے کے دینے پڑ جائیں

زارش اسی کا مطالبہ کر بیٹھیں تو۔؟

نئی فیکر لاحق ہو گئی تھی۔ بڑی مشکل سے انھیں سمجھایا: بہت نیک  
لوگ ہیں۔ کتنے سال گزر گئے۔ یا سر علی کے راز کو راز ہی رکھا ہوا ہے۔ اب تو  
باقاعدہ قرزانہ کی اور زرین کی خط و کتابت بھی ہے۔ وہ بھی بی۔ اے  
رہ چکی ہے۔ زرین بھی اب تھرڈ ایئر میں ہے۔ ایف اے کے بعد سے یوشن  
بھی پڑھا رہی ہے۔ بس وقت ہے گزر رہا ہے۔ خدا کا شکر ہے۔  
ناصر اب بھی انھیں دیکھ رہا تھا۔

میتین چہرے پر قناعت کی روشنی تھی۔ شرافت کا نور تھا۔  
پائیزگی کا بول بالا تھا۔

اس کے باپ کی منگو جہ۔! اُس نے سوچا۔

خود اُس کے باپ نے اُسے اندھیرے میں رکھ کر اُس سے نکاح پڑھایا  
تھا۔ اُس نے جان بوجھ کر اس کی ماں کو دکھ نہیں دیا تھا۔

اور پھر۔ خود اُس نے کونسا شکہ دیکھا تھا۔

شوہر کی بے رخی۔ بیوگی۔ پہاڑ سی جوانی۔ بچی کا راسخہ۔

زمانے کے ستم سہتی یہ عورت۔

کتنی بے ضرر۔ کتنی مظلوم۔ کتنی نیک۔ کتنی پاک تھی۔

شوہر کے لاکھوں کی املاک تھی۔ چاہتی تو وادیلہ کرتی۔ اپنا حق

کے کر رہتی۔ شاندار کوٹھی میں رہتی۔ کاریں۔ لوکروں کی ریل پیل ہوتی

اس کے پاس۔ مگر



شہر نے ایک بار منع کیا۔ تو آج تک منہ سے بھاپ تک نہیں نکالی  
 کتنی مطیع و فرمانبردار تھی۔ کتنی صابر و شاکر تھی۔  
 ”یہ الیم دیکھو بیٹا“ اٹھوں نے سر ہانے رکھا ایک الیم اٹھا کر اُس کی  
 طرف بڑھایا۔

اُس کے گھٹنوں پر رکھا۔ خود ہی صفحے پلٹنے لگیں۔  
 انیس بیس سال قبل کی ابو کی تصویر۔ یہی کاپی گھر میں بھی  
 فریم کی ہوئی رکھی تھی۔

اُسی عمر کی، اُن کی اور زرین کی اتنی کی اکٹھی تصویریں۔  
 خود ناھر کی پانچ چھ سال کی عمر کی تصویر۔ وہ آج بھی اُس کے  
 بیڈ روم میں اس کے بیڈ سائڈ ٹیبل پر فریم کی ہوئی رکھی تھی۔  
 اُس کے بچپن کی چند اور تصویریں۔ سذرین کے بچپن کی۔ پھر  
 جوانی کی کئی اور تصاویر۔

”اور یہ ہمارے نکاح کے کاغذات ہیں“ اٹھوں نے تکیے کے نیچے  
 سے کاغذ نکال کر اُسے دکھائے۔

”سیکینہ بیگم۔ عمر اٹھارہ سال۔۔۔۔۔ یا سر علی۔۔۔۔۔ حق ہر۔۔۔۔۔“  
 اُسے پہلی بار جنبش ہوئی۔

کاغذ میز پر رکھے۔ کرسی سے اٹھا۔

”سہری پر اُن کے قریب بیٹھا اور پھر اُس مقدس ہستی کے قدم چھولئے۔  
 ”اتنی۔ مجھے ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کا پتہ آپ کے چہرے سے

نظر آ رہے ہیں۔ میں آپ کا بیٹا ہوں۔ میرے سر پر ہاتھ رکھئے۔  
 شہت جذبات سے اُس کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔ اُس نے اُن کا ہاتھ  
 پکڑ کر عقیدت سے اپنی آنکھوں سے لگایا اور پھر اپنے سر پر رکھ لیا۔  
 ”میرے بیٹے! آنکھوں نے اُس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔“ میرے  
 یا سر علی کے بیٹے۔ وہ پھر بے اختیار رونے لگیں۔

”روئے نہیں اتنی۔“ اُس نے اُن کی شال سے اُن آنسو پونچھ لئے۔  
 ”اب نہیں ہیں مگر آپ کا بیٹا تو زندہ ہے۔ اور بیٹا جوان ہو۔ تو مال  
 پچھلے دُکھ بھول جایا کرتی ہے۔ آج سے آپ کے دُکھوں کے دن بیت  
 گئے۔ آپ کا بیٹا آپ کے ساتھ ہے۔“

”مرد کی آواز۔ اور مجھ بے بس کے گھر میں۔ خدایا تو کتنا ہریانہ ہے۔“  
 وہ اُس کا ماتھا چوم کر ایک بار پھر رو دیں۔

اور۔ پھر روتی ہی چلی گئیں۔

نامر بھی پھر کچھ نہیں بولا۔ اچھا تھا رد لیتیں۔ سالوں کا بوجھ

ہلکا ہو جاتا۔

پھر اُس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ زرین سر ہانے کھڑی بازو میں منہ  
 چھپائے ہچکیا لے لے کر رو رہی تھی۔

وہ اٹھا۔ آہستہ قدم چلتا ہوا اُس کے قریب جا کھڑا ہوا۔

”زرین۔“ اُس نے پکارا۔

وہ روتی ہی گئی۔



” زرین “ ہاتھ بڑھا کر اُس نے اُس کا بازو چہرے سے ہٹالیا۔  
ایک پل کو۔ ناھر کو لگا۔ اُس کی اپنی تصویر اس کے سامنے ہے۔  
تنی شکل ملتی تھی زرین کی اُس سے۔

وہ اور زیادہ رودی۔

” نہ رومیر کی بہن “ اُس نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا۔  
” بھیا “ وہ بے اختیار اُس سے پیٹ گئی۔  
” میری بہن “ ناھر کے مضبوط بازو اُس کے گرد محیط ہو گئے۔

اور یہ ہیں اُسے معلوم ہوا۔

وہ کیوں اتنا بے چین تھا۔ بے کل تھا۔ پریشان تھا۔ ؟ کیوں اُسے  
تناخیاں تھا کہ اُسے گھر کے اندر تک چھوڑنے آیا تھا۔  
پڑوسیوں کی، لوگوں کی۔ اُسے کیوں اتنی فکر نہ تھی۔  
اُسے سینے سے لگا کر اُسے محسوس ہوا۔  
وہ۔ اُس کا اپنا خون تھی۔ اس لئے۔

”زی۔ جاؤ۔ شاہباش اپنے بھتیائے لئے چائے گرم کر کے لے آؤ۔“  
 اتنی کو قدرے سکون ملا تو آنسو پونچھ کر ٹھنڈی چائے کو ہاتھ لگاتے  
 ہوئے بولیں۔

”اچھا اتنی۔“ رو دھو کر اب وہ بھی سکون پا چکی تھی۔ ”آپ بیٹھے  
 بھتیائے میں چائے گرم کر کے لاتی ہوں۔“  
 ناصر دوبارہ اتنی کی مسہری کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ زی چائے منگ  
 لے کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

”بیٹا۔ میں نے تمہیں کل ہی پہچان لیا تھا۔ تم نے اپنے گاؤں کا نام۔ اپنا  
 نام اور پھر یا سر علی کا بھی بتایا تھا۔ تو میں صاف سمجھ گئی۔ تمہارے جانے  
 کے بعد ساری رات اسی کشمکش میں گزری۔ کہ تمہیں یہ راز بتاؤں یا نہیں۔  
 کبھی سوچتی یہ راز افشاں کر کے سب کچھ نہ کھودوں۔ اپنے اعتماد کو زرین  
 کو۔ پھر کبھی سوچتی وقت آ گیا ہے۔ یہی وقت شاید خدا نے مقرر کیا ہے۔“



یہی سوچ سوچ کر نڈھال ہو رہی تھی۔ ہتھاری سوچوں میں، میں زمین کے  
ساتھ بیٹے موٹر سائیکل والوں کے واقعہ کو بھی بھول بیٹھی تھی۔  
اچانک اُس کا خیال آ گیا۔ ہتھاری سوچ ایک طرف رہ گئی۔

دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پہلی بار خیال آیا کہ اگر تم لوگ نہ  
آتے تو کیا ہوتا؟ کہیں وہ لوگ اسے اٹھا کر ہی لے جاتے تو؟ میں تو  
لٹ جاتی۔ جیتے جی مر جاتی۔ ادھ۔ پر درد گار۔ یا یہ سوچتے ہی مجھے لگا کہ  
میرا دل بیٹھ رہا ہے۔ بمشکل ہاتھ بڑھا کر پانی کا گلاس تلاش کیا۔ ہاتھ  
کانپ رہے تھے۔ گلاس چھوٹ کر فرش پر گرا۔ ٹوٹا تو زرین جاگ گئی۔  
”کیا ہوا۔ اتنی۔؟ وہ پوچھنے لگی۔

”بیٹا پانی پلاؤ۔“ میں نے بمشکل کہا۔

”اُس نے بتی جلائی۔ سہارا دیا۔ پانی پلایا۔ معصوم سی جان اتنی گھبرا گئی  
تھی۔ ایک ماں ہی کا آدم تھا۔ بستر ٹھیک کیا۔  
”بیٹے جسم میں جان نہیں ہے۔“ میرے منہ سے نکلا۔

پریشانی میں بے چاری کبھی ہاتھ سہلاتی۔ کبھی پاؤں۔ بھاگ کر  
گٹھو کو زینا لاتی۔

صبح کے چار ہوئے تو کچھ طبیعت سنبھلی۔

”بیٹا۔ کیا بتاؤں جو ان بیٹی کا ساتھ ہے۔ کالج جاتی ہے تو بھی جان  
اٹھی رہتی ہے۔ دلہن کا وقت ہوتا ہے تو دروازے سے کان لگائے کھڑی  
رہتی ہوں۔ رات کو پتہ بھی کھڑا تھا ہے تو دل بیٹھنے لگتا ہے۔ تھک گئی ہوں

بیٹا۔ نہ ڈھال ہو گئی ہوں۔ مرد کے سہارے کے بغیر زندگی کتنی مشکل ہے۔  
 یہ مجھ سے پوچھو۔ کل شام میری زلی کو کچھ ہو جاتا تو میں کیا کرتی۔؟ بتاؤ  
 بیٹا۔ میں کیا کرتی۔؟

اداب۔ وہ ایک بار پھر رو رہی تھیں۔  
 "اتنی۔ اب پلٹر نہیں روئیں۔ اب میں آگیا ہوں۔ میری بہن کو کوئی  
 آنکھ اٹھا کر تو دیکھے۔"

"یہی سوچ کر صبح ہوتے ہوتے میں نے فیصلہ کر لیا کہ پہلے نہ سہی  
 اب تو ضرور تمہیں آگاہ کر دوں گی۔ کہہ دوں گی۔ زرین کو سنبھالنا اب  
 مجھ اکیلی کے بس میں نہیں ہے۔ سوچا اپنی ماں سے نہ سہی باپ کا تو  
 بیٹا ہے۔ بھائی تو ہے۔"

"اتنی۔ آئندہ آپ یہ لمبی چوڑی بات نہیں کہیں گی۔ آپ اب تو کی  
 سوری ہیں اور میں اور زرین آپ کے بچے۔ بات ختم۔ اور اب آپ  
 ایک آنسو بھی اور نہیں بہائیں گی۔ زرین کو چائے لئے اندر آتے دیکھ کر  
 وہ مسکرا دیا۔ آپ ایک عدد جوان بیٹے۔ اور ایک عدد جوان بیٹی کی ماں  
 ہیں۔ ناشکری کرنا گناہ ہے۔ بناؤ چائے۔ شاباش۔ آخر میں وہ  
 بشارت سے زرین سے مخاطب ہوا۔

"ہاں بیٹا۔ توبہ کرتی ہوں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ اتنی نے  
 آنسو پرچھ لئے۔"

زلی نے چائے بنا کر ماں کو پیالی پکڑائی۔ پھر ناصر کو دی۔



”تم نہیں پیو گی؟“ اُس نے زرین کی طرف دیکھا۔

”عادت ہی نہیں ڈلوائی“ اتنی مسکرا کر بولیں۔

”گڈ۔“ ناصر چلے گا گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔ ذی آرام سے جا کر  
ناصر کی کرسی کے بازو پر بیٹھ گئی۔

”سجیکشن کون کون سے ہیں۔؟“

”انگلش لٹریچر۔ جیا گریفی۔“

”کچھ آتا جاتا بھی ہے یا ویسے ہی آسمانوں پر رہتی ہو۔“ جانے کیوں  
اُسے اچانک ہی شان کے اُس کے متعلق کہے الفاظ یاد آ گئے۔

”کیا۔؟“ اُس کے لب و لہجے پر وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

”کچھ نہیں۔ اچھا بتاؤ کالج کہاں ہے۔؟“

”شہر میں۔“ اُس نے جواب دیا۔

”میں آسکوں گا۔؟“ کپٹی پر کے بال کھجاتے ہوئے وہ شرارت سے بولا۔

”یہ بات ہے۔“ وہ بھی سمجھ گئی۔

”ایک ہی لاکمزوری ہے اپنی۔“ وہ انکسار سے بولا۔

”کیا کمزوری ہے بیٹا۔؟“ بھائی بہن کو باتیں کرتے دیکھ کر خوش

ہوتے ہوئے وہ اچانک گھبرائے ہوئے لہجے میں بولیں۔

اور بہن بھائی دونوں۔ ایک ساتھ تہہ ہتھ لگا بیٹھے۔

”اتنی۔ ناصر کھائی اس دن میوزیم میں نسرین کے بالکل قریب ایسے

اُس نے ناصر کے کندھے سے کندھا ملا لیا۔ بالکل یوں کندھے سے کندھا



جوڑ کر۔ اور پھر یوں : "اُس نے سراد سچا کر لیا۔" بے نیازی سے اسٹھوڑ  
 دیکھنے لگے۔ علیے اکھیں پتہ ہی نہ ہو کہ کندھا کسی لڑکی سے ٹکرائے  
 کھڑے ہیں۔"

اور۔ ناصر کو اچھو لگ گیا۔ جلدی سے پیالی مینر پر رکھ دی۔  
 "جیوٹی کہیں کی؟" اُس نے اُس کی چوٹی اُکھنچ لی۔ "میں کیوں  
 اُس سے کندھا ٹکرانے لگا۔"

"ایک ہی تو کمزوری ہے آپ کی۔" اپنی چوٹی واپس کھنچتے ہوئے  
 زی ناصر ہی کے سے ٹکرا لہجے میں کہا۔  
 ناصر حقیف سا سنس دیا۔

زی نے پھر اپنی پوزیشن بغوال لی۔ اور  
 اتنی دونوں کو دیکھ دیکھ ہنساں ہو گئیں۔



زرین خوشی خوشی دوپہر کا کھانا تیار کرنے میں لگی تھی۔ ناہر نے بازار سے آکر کھانا جو کھانا تھا۔ آج وہ کتنی خوش تھی۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے؟ کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے؟۔ وہ بار بار سوچتی۔  
اُسے تو بس اتنا معلوم تھا کہ وہ چند ماہ کی تھی کہ اب تو ایکسڈنٹ میں ختم ہو گئے تھے۔ اور بس۔

پھر۔ وہ تھی اُس کی اتنی تھیں۔ اسکول تھا اور بس یہ کوارٹر۔  
پھر ذرا سی تبدیلی آئی۔

وہ کالج میں داخل ہوئی۔ پچھلے سال اب کے پرلتے دوست ماجد صاحب مجاہد منملی کے آئے۔ فرزانہ سے دوستی ہوئی۔ ابھی چند روز قبل یہاں سے کافی دور واقع وہ اُن کے گھر گئی۔ اور بس۔ اور ہاں، اُسے یاد آیا۔ وہ فرزانہ کے ساتھ کسی سیٹھ حامد علی کے یہاں اُن کی بیٹی ٹینا کی امریکہ سے مذکورہ سلسلے میں دئے گئے ڈزپر گئی تھی۔ وہاں ناہر کے کزن ذیشان کو

دیکھا تھا۔ اب تو وہ اُس کا بھی رشتہ دار لگتا تھا۔ ناصر کے ماموں کا  
 رڑکا تھا۔ تو اس کا بھی کچھ تو ہوا ہی۔

ہو نہ۔ شنا تھا مغزور ہے۔ ہے بھی۔

اور پھر اُسے اچانک موڑ بائیک والے واقعے کے بعد جھگڑاتا۔  
 دھار تا ذیشان یاد آ گیا۔

غصہ والا بھی بہت ہے۔ اُس نے مزید سوچا۔ خیر اُسے کیا۔  
 ”بھیا۔“ ناصر کو لے پھندے اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ کچن  
 سے ہی چلی آئی۔ وہ سیدھا اُدھر آ گیا۔

کریٹ رکھا۔ پھر دروازے پر گیا۔ دوسرا کریٹ اندر لایا۔ اور پھر کئی  
 چھوٹے موٹے لفافے تھے۔

گھی تھا۔ چینی تھی۔ والیں تھیں۔ چائے کے پیکٹ۔ دودھ کے  
 ڈبے۔ پھل اور نہ جانے کیا کیا تھا۔

اتنی بھی ہادرچی خانے میں آگئیں۔ آنکھوں میں تشکر اور احساسِ مندی  
 کا احساس لئے۔

”بیٹا....“ انہوں نے کچھ کہنا چاہا۔

”اتنی۔ کچھ کہہ کر مجھ سے میری خوشیاں مت چھینیں۔ ماماؤن جان  
 نے بہت پیار دیا ہے۔ شان نے کھالی بن کر دکھایا ہے۔ مگر ماں اور  
 بہن کو تو پہلی بار دیکھا ہے نا۔ اتنی مجھے خوش ہونے دیں کہ میرا بھی ایک  
 گھر ہے، جس میں بہن کھانا پکاتے ہوئے کھالی کی منتظر ہے۔ جس میں ماں



انکھیں بچھائے بیٹھی ہے کہ اُس کا بیڑا آنے والا ہے۔ اتنی....  
 ”میرے بیٹے ماں تیرے صدقے۔ پروردگار تو کتنا مہربان ہے۔  
 اللہ۔ میرا تجھ سے وعدہ ہے میں بچھلے دکھ سارے بھول جاؤں گی....  
 اتنی آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔

زرین نے دم پر رکھے چادر کی دیکھی اتاری۔ اُس کی جگہ توارکھ  
 دیا۔ دوسرے چولہے پر رکھی دیکھی کا ڈھکنا ہٹا کر دیکھا کوفتے تیار تھے۔  
 دیکھی اتاری۔ اور جلدی جلدی آئے کے پیڑے بنانے لگی۔  
 ناہرا اتنی کے ساتھ صحن میں دھوپ میں کرسیوں پر بیٹھا باتوں  
 میں مصروف تھا۔

”بیٹا۔ ابھی اپنے گھر مت بتانا۔“ مدتوں سنبھال کر رکھے ہوئے  
 زار کو صیے وہ یکدم ہی کھولنے کی اپنے میں ہمت نہیں پا رہی تھیں۔  
 ”اچھا اتنی۔ نہیں بتاؤں گا۔ مگر....“  
 ”مگر کیا؟“ انھوں نے کہا۔

”یہ بہت بڑی بات ہے۔ بڑی اہم۔ چھپے گی کیسے۔؟ میں تو حیران  
 ہوں اب تک یہ چھپی رہی تو کیسے۔؟“

”بس بیٹا۔ کچھ تو جگہوں کی دوری تھی کچھ ہماری غریبی۔ گنائی کی  
 قس۔ اور پھر اڑتے اڑتے بھٹک پہنچی بھی ہوگی کسی کے کان تک۔ تو ہتھالے  
 تو کے لئے یوں بھی مشہور تھا کہ رنگین مزاج ہیں۔ نکاح کو افواہ کہہ کر ادھر  
 دھر ٹال دیا ہوگا۔ میں نے کون سا کبھی اپنا حق طلب کیا تھا۔ یا پیغام

بھیجے یا دھول کئے تھے اور پھر سب سے بڑی بات اُن کی بہت جلدی  
بے وقت کی موت کی تھی۔ اُن کے ساتھ ہی میرا بھی قصہ ختم ہو گیا۔ شاید  
پتہ بھی ہو کسی کو۔ لیکن مجھ غریب کی کے پرواہ۔

”امی ایسا مت کہئے۔ مجھے دُکھ ہوتا ہے۔ جو ہو گیا۔ سو ہو گیا۔ اب تو  
آئندہ کا سوچنا چاہئے۔ ہمیں آئندہ کیا کرنا ہے۔“

”بیٹا۔ تم ہی کچھ سوچو۔ تم اپنے خاندان کو ہتر سنبھالتے ہو۔“

”ہاں امی۔ فی الحال میں کچھ نہیں کہوں گا۔ ماموں جان بہت  
سخت طبیعت کے اور اصولوں کے پابند انسان ہیں۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتا  
کہ یہ خیر سن کر اُن کا رد عمل کیا ہو گا۔ کیا پتہ اچھا ہی ہو۔ لیکن بہت  
ممکن ہے اس کے برعکس ہو۔ وہ کچھ سوچتے سوچتے آہستہ آہستہ بول  
رہا تھا۔ دلچسپ جائیداد کو بے شک بیٹھا لا ہوا انھوں نے ہی ہے۔ مگر  
آمدن میرے نام ہے۔ مالی لحاظ سے مجھے آپ لوگوں کی کوئی فکر نہیں ہے۔  
فکر ہے تو یہی۔ کہ آپ لوگوں کو یکدم ہی یہاں سے لے جا نہیں سکوں گا۔  
یوں بات فوراً سامنے آجائے گی۔ اور ماموں جان ....“

”کیا تمہارے ماموں جان، میں قبول نہیں کریں گے۔“ امی تشویش  
بھرے لہجے میں بولیں۔

”قبول تو آپ کو خدا نے کرا دیا ہے امی۔ آپ فکر کیوں کرتی ہیں۔؟“  
وہ بے اشت سے بولا۔ مگر اُن کی طبیعت اور طرح کی ہے۔ کبھی لگتا ہے  
یہ جراثیمیں دھلکے کی طرح لگے گی۔ پتہ نہیں کیا رد عمل ہو؟ امی آپ



بُرائے منائیں۔ مگر وہ خاندان، خاندانی، اچھے اونچے۔ بس عجیب ہی منطق ہے اُن کی۔ چند ماہ قبل میں نے ایک جگہ منگنی کرنی چاہی تو اس قدر پوچھ گچھ اور معلومات میں لگے رہے۔ شجرہ نسب منگو کر چھان بین کرتے رہے۔ بس کیا بتاؤں۔ ”اُس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”پھر راضی ہوئے بیٹا۔“ وہ خوش ہو کر پوچھنے لگیں۔  
 ”ہاں اتنی۔ خدا خدا کر کے۔“

”صدقے جاؤں میرا بیٹا۔“ انھوں نے اُس کا سر قریب کر کے اُس کا ماتھا چوم لیا۔ ”لو کی کیسی ہے۔“  
 ”اچھی ہے اتنی۔!“ اُس نے کہا۔

”کبھی ملو اوڑ بیٹا۔ مگر....“ وہ اچانک اُداس ہو گئیں۔ ”ہم بھی کیا قسمت بے کر آئے ہیں۔ ساری زندگی چھپتے چھپتے ہی رہیں گے۔“  
 ”ہنیں۔ اتنی نہیں۔ میں آپ کو ضرور ملو اوڑ گا۔ آپ لوگ چھپتی چھپاتی کبھی نہیں رہیں گی۔ میں آپ لوگوں کو ساری دنیا کو دکھاؤں گا۔ اپنی ماں اور اپنی بہن کو۔“

اتنی آنکھوں میں آئے آنسو پونچھنے لگیں۔

”بس چند دن کی بات ہے۔ میں ذرا ماموں جان اسٹڈی کروں گا۔ ہموار کرنے کی کوشش کروں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگوں کو بے گریباؤں تو وہ کھلے ماتھے سے خوش آندیر کہیں۔ کوئی ایسی بات نہ ہو جس کا مجھے دکھ ہو۔ آپ کو دکھ ہو۔ بس۔“

”وہ کچھ کہیں گے بیٹا۔“

”کہہ نہیں سکتا۔ ظاہر ہے اچھا تو نہیں لگے گا۔ اور پھر انہوں نے میری پرورش اپنی اولاد کی طرح کی ہے۔ اُن کی سوچ بھی باپ جیسی ہے۔ مخالفیت تو ضرور کریں گے۔“

”پھر کیا ہو گا۔ بیٹا۔؟“

”آپ کا بیٹا آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا۔ آپ فکر مت کریں۔ خدا کوئی نہ کوئی حل نکال ہی دے گا۔ سر دست تو آپ کوئی اچھا سا مکان کرائے پر لینے کی کوشش کریں۔ فی الحال میں رُک نہیں سکتا۔ ایک تو چھٹی ختم ہے۔ دوسرے ذیشان کو شک پڑ جانے کا ڈر ہے۔ اس وقت بھی پریشان ہو رہا ہو گا۔۔۔“

وہ ایک پل کو چپ ہو گیا۔

ہونٹوں پر ہلکی سی سکراہٹ ابھرائی۔

شان کچھ کچھ جلتا سا بھی تھا۔

”تو آپ ایسا کریں۔ ایک تو مکان لے لیں اچھا سا۔ اور سب ضروری

بات یہ کہ چوکیدار رکھیں۔ زرین کو کہیں اکیلا مت جانیں دیں اس

وقت تو آپ یہ رکھ لیں۔“ اس نے جیب سے ایک ہزار روپے نکالتے ہوئے

اُن کی طرف بڑھائے۔ ”اور یہ میرا کارڈ بھی۔“ اُس نے اپنا وزیٹنگ کارڈ

بھی انہیں دیا۔ میں جانتے ہی اند بھی رقم ارسال کر دوں گا۔ یہ دونوں

کام جلد سے جلد کریں۔ اور مجھے فوراً اطلاع دیں۔ ضرورت پڑے تو فون نمبر



ہے کارڈ پر فون کر لیا کریں۔ مجھے باخبر رکھیں۔ میں ایک ماہ بعد پھر  
فکر لگاؤں گا۔

زرین نے ویاں میز لا کر رکھ دی۔

”زرین جلدی۔ بھوک بھی لگی ہے۔ اور وہ جو ہے نامیرا کزن۔  
غصے کے مارے خود کو کاٹ رہا ہوگا۔“ ناہرنے شرارت سے کہا۔  
اور۔ زی کے خوبصورت ماتھے پر بل پڑ گئے۔

”وہ بھی غصے والا ہے بیٹا۔“ اتنی نے سادگی سے پوچھا۔

”ہنیں اتنی۔ یہ تو میں ویسے ہی کہہ رہا تھا۔ ویسے پریشان تو ہو رہا  
ہوگا نا جلدی آنے کو کہا تھا۔ اور یہ ٹائم ہو گیا۔“

”بہت مغرور ہے وہ سنا ہے۔“ زی میز پر برتن رکھتے ہوئے  
نخوت سے بولی۔

”لوگوں کا خیال ہے۔ بلکہ زیادہ تر لڑکیوں کا۔“ اُس نے شرارت  
سے زرین کی طرف دیکھا۔ کہ وہ مغرور ہے۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ وہ  
ایسا نہیں ہے۔ مجھ سے زیادہ CLOSE اُس کے ساتھ کوئی نہیں  
ہے۔ وہ بے حد سادہ اور بے حد اچھے دل کا مالک ہے۔ یہ تو اس  
کی پرورش اور تربیت ہی ایسی ہوتی ہے کہ اس کے رکھ رکھاؤ۔  
اٹھنے بیٹھنے کے طریقوں سے لوگ غلط اندازہ لگا لیتے ہیں۔ کچھ لوگ بھی  
بہت پیسہ اور اونچی طرزِ رہائش بعض اوقات لوگوں کے دلوں میں  
غلط فہمی پیدا کرتی ہے۔ کئی کئی ملازم صرف اُس کی خدمت پر مامور

ہوتے ہیں۔ کبھی اُس کو اپنے تسمے باندھتے ہیں نے مشکل سے دیکھا ہے۔  
 اجنبی لوگوں سے بات چیت کے دوران وہ بہت لڑے دیئے رہتا ہے۔  
 اسی طرح کسی سے جلد ہی بے تکلف ہو جاتا کبھی اُس کی عادت نہیں۔  
 مگر۔ کبھی تم اُسے اپنی ماما کے ساتھ دیکھو۔ ایسے ہی کریم بابا کے ساتھ۔  
 بعض اوقات تو یا قاعدہ لاڈکراتا نظر آتا ہے۔ پھر جہاں وہ اپنا  
 تسمہ نہیں باندھتا۔ وہاں وہ اپنے گھوڑوں اور کتوں کی تمام دیکھ  
 بھال وہ خود کو ٹلے ہے۔ یہاں وہ نوکروں پر بھی بھروسہ نہیں کرتا۔۔۔۔۔“  
 ”بڑے لوگوں کی بڑی باتیں بیٹا۔ انی آہستہ سے بولیں۔  
 ”ہونہم۔ بڑے لوگ۔“ زی پلیٹ نامہ کو دیئے ہوئے بڑ بڑائی۔  
 ”مجھے نہیں اچھا لگا وہ؟“ نامہ نے وہی پلیٹ انی کو تھما دی۔  
 ”جو اپنے آپ کو کچھ سمجھتا ہے۔ مجھا اچھا نہیں لگتا۔“  
 ”بہتیں کیسے لگا کہ وہ اپنے آپ کو کچھ سمجھتا ہے۔“ نامہ نے چاول کی  
 ڈس انی کے آگے پکڑی۔  
 ”میں کسی کو ایسا موقع ہی نہیں دیتی کہ میرے سامنے اپنے آپ کو کچھ  
 سمجھے۔“ زی نے کھائی کی پلیٹ میں کو فتنے ڈال دیئے۔  
 تو پھر خواہ مخواہ بچارا زیر عتاب ہے۔“ نامہ کھانے میں مصروف ہو گیا۔  
 ”زیر عتاب نہیں ہے مگر۔۔۔۔۔“ وہ کچھ سُرخ سی ہو گئی۔  
 ”مگر۔ بہتیں اچھا نہیں لگتا۔ ویسے یہ خدا واسطے کا بیر کیوں ہے بے چارے  
 سے۔“ نامہ نے کہا۔



”بچارا۔ بچارا۔ آپ اُس کی اتنی حمایت کیوں کرتے ہیں۔؟“

اور۔ ناصر نے ایک جاندار قہقہہ لگایا ”میرا بھائی جو ہوا۔“  
”ہو نہ۔“ اپنے آپ کو کچھ سمجھتا ہے۔

”CORRECTION, CORRECTION۔ ابھی ابھی تم کہہ رہی تھیں۔

کہ میں کسی کو ایسا موقع ہی نہیں دیتی کہ میرے سامنے اپنے کو کچھ سمجھے۔“  
”مجھے ڈانٹ کیوں رہا تھا کل۔“ وہ معصومیت سے بولی۔

”اوہ۔ تو یہ بات ہے۔“

”وہیے DONT CARE, اے بڑے دیکھے ہیں۔“ وہ لاپرواہی سے

بولی۔ اور۔ ناصر نے شرارت سے آنکھیں نیچائیں۔

”تم میرے کزن کی انسٹ کر رہی ہو۔“ وہ مسکرائے ہوئے بولا۔

”کہہ دیا نہ مجھے آپ کے کزن کی کوئی پرداہ نہیں ہے۔“ اُس نے لاپرواہی

سے ہاتھ ہلایا۔

”او۔ کے، او۔ کے۔ کہہ دوں گا اُس کو بس۔“

”مزور کہہ دیں۔“

اورانی بہن بھائی کی لوگ جھونک سے مخطوط ہوتی رہیں۔

”اتنی۔ اب میں چلوں گا کھانے سے فارغ ہوتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”گو دل نہیں چاہ رہا تھا جانے کو۔ مگر مجبوری ہے۔۔۔۔۔“

”بیٹا۔ دل تو میرا بھی نہیں چاہ رہا۔ خواب لگ رہا ہے سب۔“

”بھئی۔ یہ رات ادھر رہ لیں تا۔ رزی کی ڈیڈیا کی آنکھوں میں التجا تھی۔

”میری بہن! شان کو شبہ ہو گا۔ درنہ میں ضرور لیتا۔ کیا میرا دل چاہتا ہے یہاں سے جانے کو۔“ ناصر نے زرین کا سر اپنے پہلو سے لگا لیا۔  
 ”شان۔ شان۔ بس۔۔۔ اُس نے غصہ بمشکل روکا۔“  
 ”اچھا اتنی۔ مکان اور چوکیدار کی تلاش آج سے ہی شروع کر دیں۔  
 مجھے جلد سے جلد خط لکھیں۔۔۔۔۔“

”اچھا بیٹا۔ اتنی کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔“ خدا عمر دروازے۔“  
 ”اچھا۔ خدا حافظ۔ اُس نے زی کو سر پر پھیلایا۔ اور اپنا سر  
 اتنی کے آگے جھکا دیا۔“

”خدا حافظ۔“ اتنی نے اُس کا ماتھا چوم لیا۔ ”اللہ حافظ۔ ناصر ہو۔“  
 ”بھیا۔ جلدی واپس آئیے گا۔“ حسبِ معمول ”سوں“ کر کے ناک اوپر  
 کھینچتے ہوئے زرین نے کہا۔

اور ناصر کو شان یاد آ گیا۔

”اچھا خدا حافظ۔“ وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

”خدا حافظ۔“ زی نے کہا۔

ناصر دروازے سے باہر نکلا۔

زرین اور اتنی دونوں دروازے میں کھڑی تاحہ نظر  
 اُسے دیکھتی رہیں۔“



ناصر۔ کچھ جھجھکتا سا۔ حقیقت سا اندر داقل ہوا۔  
 آگ کے قریب گرسی پر بیٹھا شان ابھی سی سوچوں سے چونکا۔  
 ”ہیلو سر۔“ ناصر نے کہا۔

”ہیلو۔“ شان کا لہجہ جذبات سے عاری تھا۔  
 ”سوری شان مجھے دیر ہو گئی۔ ناصر اُس کے لب و لہجے پر نادم سا صفا  
 دینے لگا۔ دراصل وہ۔ وہ زرین کی اچی کی طبیعت....“  
 ”ہاں۔ ہاں معلوم ہے۔ صبح یہی کہہ کر گیا تھا۔“ وہ تند سے لہجے میں بولا۔  
 اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”بابا جان گاؤں آیا ہے۔ فون کیا تھا۔ فوراً آنے  
 کو بولا ہے۔“ کہتے کہتے وہ ڈرینگ روم میں گھس گیا۔  
 ”آج ہی چلنا ہے کیا۔“ ناصر بھی اُس کے پیچھے چلا آیا۔  
 ”ابھی۔ اسی وقت۔ ہتھالا ہی انتظار کر رہا تھا۔ باقی کام کر لئے ہیں۔  
 وہ اسی سنجیدگی سے بولا۔

ناہرنے دیکھا۔ سامان جوں کا توں پڑا ہے۔

شان بھی تولیہ اٹھاتا۔ پھر رکھ دیتا۔ کبھی شیو کا سامان ہاتھوڑم سے لاتا تو ڈرینگ روم میں ہی ٹیبل پر رکھ دیتا۔  
ناہر کو ہنسی آگئی۔

سارے کام بقول خود منسلک تھے۔ مگر پھر بھی ہر چیز جوں کی پڑی تھی۔ کبھی کوئی چیز اٹھا ہی لیتا تو سمجھ میں نہ آتا کہ رکھے کیسے۔؟ خاصی عادت خراب کر دی تھی کریم بابا اور ناظم نے۔ پتہ نہیں لندن میں کیسے گزارا چلایا تھا۔

”کون کون سے کام کر لئے ہیں۔؟“ ناہر جلدی جلدی سوٹ کیس میں کپڑے بھرتے ہوئے بولا۔ مسکرا کر۔

”جیب ٹھیک ہو چکا ہے۔ اور۔ ہوٹل کا PAYMENT بھی ہو گیا ہے۔ وہ سادگی سے بولا۔ چہرے پر کی تسلی اب معمول پر آ رہی تھی۔  
”بڑے کام کئے ہیں سر۔“

”اور کیا؟“ اُس نے وہی شیو کا سامان اٹھا کر ناہر کو دکھا دیا۔  
ناہر پھر ہنس دیا۔ اور پھر جلدی جلدی سامان اکٹھا کرنے لگا۔  
”سر شان۔“ ناہرنے اُسے مخاطب کیا۔  
”ہوں۔“ اُس نے کہا۔

”آپ بہت نکمے ہیں۔“ ناہر بڑے سببیگ کا زپ بند کرتے ہاتھ جھاڑ کر سنجیدگی سے بولا۔



”دقت کا پابند ضرور ہوں۔“

ناھر۔ اُس کی چوٹ پر مسکرا دیا۔

اور پھر کسی خوبصورت خیال کے تحت اُس کا چہرہ جگمگا اٹھا  
”کچھ کامیابی ہوا۔؟“ اُس کے چہرے کو بغور دیکھنے کے بعد، شان  
مکرمے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

ایک پل کو ناھر سمجھ نہ سکا۔ کس بات کی کامیابی۔؟  
کیا اُسے زرین اور ان کے متعلق کچھ معلوم ہوا تھا۔

پندرہ منٹ کے اندر اندر۔ وہ چھوٹے سے پہاڑی بازاری میں  
گزر رہے تھے۔

دائیں طرف ایک سڑک جاتی تھی۔ جو کچھ دور چل کر چند موڑ مڑنے  
کے بعد۔ زلی کے گھر کو جاتی تھی۔ اُس کی ماں کے گھر کو۔  
غیر ارادی طور پر ناھر رُخ موڑ کر ادھر دیکھنے لگا۔  
”جانا ہے کیا۔؟“ اچانک شان گبھیر لہجے میں بولا۔

”ن۔ ن۔ نہیں تو۔ کہاں۔؟“ ناھر اُٹھائے راز کے خد سے جلدی  
سے رُخ سامنے کرتے ہوئے بولا۔

اور پھر۔ اُس نے دیکھا۔

شان کے پُرکشش ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ اکبر آئی تھی۔  
ایسا کیوں تھا۔؟

اگر بھی چلا بھی گیا۔ تو ایسی کونسی بڑی بات ہو گئی تھی اور پھر دیر  
 سویر تو ہوتی ہی رہتی ہے۔ شان کو برا کیوں لگا تھا۔  
 مگر۔ نہیں۔ یہ اس کا وہم تھا۔  
 شان تو بہت وسیع قلب و ذہن کا مالک تھا۔  
 ”ماموں جان پروگرام سے قبل گاؤں پہنچ گئے ہیں۔“ جیپ  
 شہر سے باہر والی سڑک پر ہوئی تو ناصر اُردو کوٹ اچھی طرح درست  
 کرتے ہوئے بولا۔

اور۔ ہنسی جیسے بھٹک کر شان کے لبوں پر آ گئی۔  
 ناصر حبِ عادت بابا جان کا سا مذاکرتے ہوئے گہرا رہا تھا۔  
 ”میرا خیال ہے۔ میں نے کوئی لطیفہ نہیں سنایا۔ شان کو ہنستا ہوا  
 دیکھ کر ناصر چونکا۔ اور شان نے ایک گہری سانس لی۔  
 ”ناصر کبھی کبھی مجھ کو تم پر رشک آنے لگتی ہے۔“  
 ”وہ کیوں۔؟“ ناصر بولا۔

”اپنا وقت اچھا گزار لیتے ہو۔“  
 ”تو تمہیں کس نے روکا ہے۔ تم بھی اچھا گزارو۔“  
 ”یہ ہی تو مشکل ہے۔“

”مثلاً۔؟“ ناصر نے پوچھا۔

”بعض لوگ پیدائشی خوش قسمت ہوتے ہیں۔“ شان سڑک پر  
 نظریں جمائے آہستہ سے بولا۔



”مگر مثلاً۔“ ناصر نے معلوم کیا۔

”جیسے تم۔“ شان کی مسکراہٹ میں گمبھیرا تھی۔

”وہ تو ہے۔“ اُس کا چہرہ کسی خوش آئند خیال کے تحت ہلکا

اُٹھا۔ میں واقعی خوش قسمت ہوں۔“

”اچھا بتاؤ اتنا دیر وہاں کیا کرتا رہا۔؟“ شان ایک نظر اُس کے بشاش

چہرے پر ڈالتے ہوئے پھر سامنے دیکھنے لگا۔ ابھی بچھا بچھا سا تھا۔

”وہ۔ وہ۔ بس ڈاکٹر لایا۔ اتنی کو۔ میرا مطلب ہے۔“

زرین کی اتنی کودکھایا۔۔۔۔۔“

”پھر۔؟“ اس چھوٹے سے لفظ میں بلا کی بے چینی تھی۔

”کچھ کیا۔ بس گپ شپ کرتے رہے۔“ ناصر کو جھوٹ پر جھوٹ

بولنا پڑ رہا تھا۔

”ہوں۔“ بے چیتی۔ بے قراری میں بدل رہی تھی۔

”کیسا لڑکی ہے۔؟“ ناصر کی طرف رخ کرتے ہوئے اُس نے مزید پوچھا۔

اُس کی مسکراہٹ میں بے بسی گھل گئی تھی۔

ناصر نے چونک کر شان کو دیکھا۔

چند ثانیے دیکھتا ہی رہا۔ ادھر پھر۔

”ادھ۔ پروردگار۔“ ناصر کا سر غیر ارادی طور پر جیب کا دستہ

تھامے اپنے ہاتھ پر ٹک گیا۔

شان کیا سمجھ رہا تھا۔؟



ایک پل کو اُس ذہن بھٹا اٹھا۔

اور پھر وہ مزید چونکا۔

اگر شان کو ایسا کوئی شبہ تھا بھی۔ تو وہ ناھر سے بسا  
اوقات اکھڑا اکھڑا۔ روکھا روکھا۔ اور اس وقت کچھ بے چین اور  
بے قرار سا کیوں تھا۔ اور پھر۔ اُس کی اس وقت کی مسکراہٹ میں  
بے بسی کیوں تھی۔؟

چپ کیوں ہو گیا۔؟ اُس کے لہجے سے چھین صاف عیاں تھی۔  
ناھر نے سر اٹھا کر سڑک پر نظریں جمائے شان کو دیکھا۔  
"سوچ رہا تھا۔"

"کیا۔؟" شان نے اس کی طرف دیکھا۔

"کہ....." ناھر اکھن میں پڑ گیا۔

"کہ کیا جواب دو۔"

"ہاں۔" ناھر نے کہا۔

"جواب دے بھی کیا سکتے ہو۔؟"

ناھر نے کنکھیروں سے شان کو دیکھا۔

سامنے دیکھتے ڈرائیو کرتے ہوئے وہ صاف دکھی نظر آ رہا تھا۔  
اود۔ پھر ناھر کو۔

شان اچانک بہت اچھا لگا۔ بہت اپنا۔ بہت قریب لگا پہلے

کئی گنا اچھا۔ پہلے سے کہیں زیادہ اپنا۔ پہلے سے کہیں بڑھ کر قریب۔



”تم یوں جرح کر رہے ہو جیسے میں تمہاری کوئی چیز لے رہا ہوں۔  
 ”کسی اور کا لیا ہوا تو لیا ہو۔ میرا کوئی چیز نہیں لے سکتا۔“ یکدم ہی  
 شان گڑبڑا گیا۔ مگر اپنی آن اپنی جگہ قائم رکھی۔  
 ”شان۔“ ناہر نے کہا۔

”ہوں۔“ شان نے جواب دیا۔  
 ”اجازت ہو تو کچھ عرض کروں۔“  
 اور۔ شان اُس کے انکار پر مسکرا دیا۔ اُداس سا۔  
 ”بولو۔ مگر کوئی NON SENSE نہیں۔“ شان خائف تھا کہ  
 پھر وہ ذی کا ذکر کر دے۔

”نہیں NON SENSE نہیں۔“  
 ”جو کہو گے۔ ٹھیک کہو گے۔“ شان نے عندالتی لہجے میں کہا۔  
 ”جو کہوں گا۔ سچ کہوں گا۔ سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔ ناہر نے  
 شان کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

اور شان نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس دیا۔  
 ”تمہیں زندگی اچھی لگنے لگی ہے۔“ ناہر بھرپور اعتماد سے گویا ہوا۔  
 ایک پل کو شان کو۔ جیسے سکتا سا ہو گیا۔

پھر اُس نے آہستہ سے سر ناہر کے ہاتھ کی گرفت سے نکال لیا۔  
 ”بابا جان بولتے تھے کہ بچھلے دنوں اُس نے جو ٹینڈرز بھیجی تھی  
 اُن کا منظوری آ گیا ہے۔ اور اکیلے انھوں نے مجھ کو فوراً بلا لیا ہے۔“

رات وہ IMPORTANT POINTS, DISCUSS کریں گے۔ کل وہ واپس اپنا ہیڈ کوارٹر جائیں گے اور مجھ کو شاید جلد ہی SITE پر آنا پڑے گا۔  
 "سوال گندم، جواب جو۔"

"بھئی۔ تمہارا سوال کا جواب یہ ہے کہ۔ وہ۔ دوسرا لڑکیوں سے کچھ  
 "THAT'S ALL-DEFFRENT ہے۔"

اور ناصر نے یہ بھی غنیمت سمجھا۔  
 کھلے لفظوں میں ہارمان لینے کی وہ دیے بھی اُس سے توقع نہیں  
 کر رہا تھا۔

موڑ پر اچانک ایک گاڑی آئی اور سوچوں میں کھوئے شان نے  
 اسٹرنگ زور سے گھما کر جیب قابو میں کر لی۔  
 "لگڑ۔ بگڑ صاحب دھیان سے۔" ناصر نے اُس کی گردن پر ہاتھ پھیرا۔  
 شان زور سے ہنس دیا۔

"یہ ٹائٹل کس خوشی میں دے رہا ہے۔"  
 "جس چیز کی گردن نہیں جھکتی حقیقت کے سامنے۔ ہماری زبان  
 میں اُس کو لگڑ بگڑ کہتے ہیں۔"

"اور جس چیز کا ہر وقت ہر جگہ گھومتا رہتا ہے۔ آگے پیچھے۔ دائیں  
 بائیں۔ اوپر نیچے۔ اُس کو کیا کہتے ہیں تمہاری زبان میں۔"  
 "ناصر۔" ناصر نے اپنی غائب ٹوچھوں پر تاد دیا۔

اور ساتھ ہی شان نے پھر اچانک موڑ پر سے برآمد ہوئی بس سے



بھٹکل جیپ بچالی۔

”سر عشق کے قدموں میں جھکانا ہی پڑے گا۔“ ناصر خوبصورتی سے گنگنایا۔

”آنا ہی پڑے گا۔“ شان نے اگلی لائن کہتے ہوئے شرارت سے ناصر کو دیکھا۔

”کیا مطلب ہے؟“ ناصر نے کہا۔

”یہ سر نہیں جھکے گا۔“

”اُس کو آنا پڑے گا۔“

”ٹھیک سمجھا ہے۔“

”دیے وہ بھی کچھ کم نہیں۔ یہ ابھی سے بتا دوں۔“

”سوں“ کر کے انگلی سے ناک چھوتے ہوئے شان نے دوبارہ ناصر کو

دیکھا۔ ناصر سنیں دیا۔

اور پھر۔ رُخ پھیر کر کھڑکی میں قدرت کا لازوال حسن نظروں

پر نظروں میں سامنے لگا۔



جو خوب صورت حقیقت ناہر کو ہفتہ بھر سے خواب لگ رہی تھی۔  
 اُس کی تصدیق کرنے وہ اِس دیک اینڈ پر انکل ماجد کے یہاں جا  
 پہنچا تھا۔ اور پھر واقعی تصدیق ہو گئی۔ کبھی کبھی خواب بھی تو سچے  
 نکلتے ہیں۔

انکل ماجد کو وہ بچپن سے ابو کے فاضل دکتوں کی حیثیت سے جانتا  
 تھا۔ اُس کی خیریت دریافت کرنے وہ اکثر شاہان احمد کے گھر آتے سار  
 ہر بار اُس کی پرد گریں جان کر اور دیکھ کر خوش ہوتے۔ ناہر بھی جب  
 موقع ملتا ضرور اُن کے یہاں جاتا۔ آنٹی۔ بیگم ماجد اُس کا اپنے بچوں  
 کی طرح خیال رکھتیں۔ اُن کے بیٹے حامد اور ساجد ناہر ہی کی عمر کے  
 لگ بھگ تھے۔ چھوٹا بیٹا ساجد آجکل میڈیسن میں ایم اے کرنے ساریکہ  
 میں تھا۔ اور حامد ہیں باپ کے ساتھ نرس میں شامل تھا۔ فرزانہ،  
 اُن کی بیٹی بی اے کر چکی تھی۔ اور آج کل گھر پر ہی تھی۔



شام کا وقت تھا۔ سردی اچھی خاصی تھی۔ ماجد صاحب اور  
حامد تینوں ڈرائنگ روم میں بیٹھے مختلف موضوعات پر بحث کرتے  
چائے پی رہے تھے۔

حامد نے آخری چند گھونٹ جلدی جلدی لئے اور اٹھ کھڑا ہوا۔  
”ناہر میں تھوڑی دیر تک آتا ہوں۔ ذرا فرزانہ اس کی دوست  
کے گھر سے لینے جانا ہے۔“  
”ہاں۔ ہاں ضرور۔“ ناہر نے کہا۔

اور پھر حامد چلا گیا۔

زرین اور سکینہ بیگم۔ ماجد صاحب کی اولاد کے لئے بھی باپ کے  
مرحوم حبگری دوست کی یتیم بچی اور بیوہ بھتیجی اور بس۔ باپ کے  
جگری دوست کا نام یاسر علی تھا۔ مگر اس کے علاوہ اور کوئی تفصیل  
کسی بچے کو نہیں بتائی گئی تھی۔

”دل میں یاسر علی کا راز چھپائے غصہ بیت گیا بیٹے تمہیں دیکھتا  
تھا تو اکثر خیال آتا زرین۔ تمہاری بہن۔ تمہارے باپ کی بیٹی۔  
تمہارا خون۔ کس قدر گمنامی اور کمپرسی کی زندگی گزار رہی ہے۔ اکثر  
بھابی سکینہ سے کہتا کہ وہ اجازت دیں تو یہ بات شاہان احمد۔ تمہارے  
ماموں کو بتا دی جائے۔ آخر ان کا اور زرین کا، یاسر علی کی اتنی  
بڑی جائیداد میں کچھ تو حق بنتا تھا۔ مگر۔ وہ بے چاری۔ غریب گھرانے  
کی بے کس عورت۔ گھبراتی تھیں۔ ڈرتی تھیں۔ اس راز کے افشا

ہونے سے۔ بہتر سمجھایا کہ کچھ نہیں ہو گا۔ آخر کب تک چھپائے رکھیں  
گی اور پھر کب تک چھپی رہے گی یہ بات؟۔ جیسا کہ تم نے دیکھا۔ ہم  
لوگوں نے منہ پر مہر لگا رکھی تھی چپ کی۔ مگر تمہیں دیکھ کر وہ خود ہی  
بے قابو ہو گئیں۔ بتا دیا سب کچھ۔ اور پھر اس میں اُن کا بھی قصور  
نہیں۔ مجھے معلوم ہے۔ وہ زرین کی وجہ سے بہت پریشان رہتی ہیں۔  
وہ چھوٹی تھی تو انھیں صرف مالی تنگی کی فکر تھی۔ مگر جو نہی جوان  
ہوئی۔ بھائی سودائی ہوئے لگیں۔

”کیا ہو گا بھائی جان۔ دنیا بہت بُری ہے۔ جوان لڑکی کا ساتھ  
ہے۔ کوئی جھوٹ موٹ کا ہی اڑا دے تو کیا کروں گی۔“ وہ ہر ملاقات  
میں پریشانی سے کہتیں۔

میں نے ایک بار یہ بھی تجویز پیش کی کہ اگر وہ چاہیں تو میں تمہیں  
مطلق کر دوں۔ آخر تم زرین کے بھائی ہو۔ زرین کا تم پر حق ہے۔ مگر  
وہ بے چاری۔ حیا کی پتلی۔ اس عمر میں شرمناک کہتیں۔ ”نہیں بھائی جان  
وہ کیا سوچے گا میرے اور آپ کے بھائی کے بارے میں۔“

بے چاری اپنے سیدھے پن اور شرافت سے مار کھا گئیں۔ بہر حال  
مجھے خوشی ہے کہ حق دار کو حق خود بخود مل گیا۔ بیٹا کچھ بھی سہی وہ  
تمہارے باپ کی بیوی ہے۔ تمہارا باپ۔ خدا اُس کو معاف کرے۔  
تم سے کیا چھپانا۔ جوان ہو تم بھی اب۔“ وہ مکرائے ”خامسارنگین  
مزانج تھا۔ کبھی ادھر، کبھی ادھر۔ شادی کے بعد بھی بڑے اطمینان سے



عشق لڑاتا پھرتا۔ دور پار کے علاقوں میں تو کسی کو کبھی یہ تک نہ بتایا کہ وہ شادی شدہ بھی ہے۔ تھا بھی جوان جہان۔ کیسی بے وقت موت آئی تو بہ۔ "اکھوں نے اُداس سی سانس لی۔" ہاں تو میں بات کر رہا تھا۔ کہ جب بھابی سکینہ پر نظر پڑی تو دلوانہ ہو گیا۔ مجھے فوراً نئے عشق کی اطلاع کرتا تھا۔ پتہ نہیں کیا وجہ تھی۔ شاید اس بار یہ بات نیازنگ لے کر آنے والی تھی۔ میں نے بھابی سکینہ کے بارے میں ہمیشہ سے زیادہ باز رکھنے کی کوشش کی۔ دور پار کے غریب لوگ تھے۔ بیوہ ماں کی مصوٰ سادہ بیٹی تھی۔ نہ دنیا کا کوئی تجربہ تھا نہ لوگوں کا۔ پھر اُن کے چھوٹے سے گاؤں میں بات پھیل رہی تھی۔ کسی کی عزت سے خواہ مخواہ کھیلنا۔ میں نے بہت لعنت ملامت کی۔ تو فوراً جوش میں آکر نکاح کے لئے تیار ہو گیا۔ میں اس بات پر بھی خوش نہیں تھا۔ مگر وہ سُن ہی نہیں رہا تھا۔ پھر میں نے کہا۔ اکھیں اپنی شادی اور بیٹے کا ضرور تبادُل۔ تو یوں بد کا جیسے میں نے کوئی اہوئی بات کہہ دی ہو۔

"کبھی نہیں۔ اُس کی ماں سخت قسم کی عورت ہے۔ پھر نکاح کی

اجازت دے گی ہی نہیں۔" اُس نے کہا۔

میں نے کہا پھر کیا اتنی ہی ضروری ہے۔ یہ دوسری شادی۔ اُلٹا مجھے الزام دینے لگا کہ دیے جاتا ہوں تو بھی روکتے ہو۔ نکاح کرنے لگا ہوں تو بھی منع کرتے ہو۔ مختصر یہ کہ کسی طرح نہ مانا۔ شادی کر ہی لی۔ پھر میں نے رائے دی۔ کہ اب کی ہے شادی تو بھلاؤ۔ اگر پہلی بیوی کا سامنا



نہیں کر سکتے تو چھپا کر کھو مگر صحیح طریقے سے۔ گھر دلاؤ تمام حقوق دو۔  
 مگر شادی کے فوراً ہی بعد وہ پھپھتا نے لگا تھا۔ بھابی سکینہ کو وہ  
 خواہ مخواہ کا بوجھ سمجھنے لگا تھا۔ پھر بات بگڑتی گئی۔ وہ اُن کے نام  
 سے چڑنے لگتا تھا۔ اُن کے ذکر سے فرار کی سوچتا تھا۔ ایک دن تو کہنے  
 لگا۔ طلاق دے دیتا ہوں۔ مفت کی مصیبت پال رکھی ہے۔ میرا دماغ  
 خراب ہو گیا تھا۔ وغیرہ۔

اس پر میں نے سختی سے تنبیہ کیا۔ زرین کی پیدائش پر وہ مزید برا فروختہ  
 ہوا۔ لڑکی کے نام سے اُسے چڑھتی۔ بھابی سکینہ۔ بچاری ناگردہ گناہوں  
 کی پاداش میں پس رہی تھیں۔ ایک دن مجبور ہو کر مجھے خط لکھا۔ تمام  
 حالات لکھے۔ جب کہ حالات اُن سے کہیں بڑھ کر مجھ پر عیاں تھے۔ میں  
 گیا۔ اُن سے ملا۔ زرین کو دیکھا۔ ہتھارے باپ کی دوسری تصویر تھی۔  
 کتابد قسمت تھا یا سر۔ نہ اپنی پہلی بیوی کا ہو سکا۔ سکون تو وہاں تھا۔  
 مگر۔ اور نہ ہی دوسری بے چاری کو کوئی شکوہ دے سکا۔ خیر۔ واپس آکر  
 میں نے یا سر کو سمجھایا۔ لعنت ملامت کی۔

اور پہلی بار اُس پر کچھ اثر ہوا۔ بھابی سے ملنے گیا۔ بچی کو دیکھا۔  
 جیسے کہ بعد میں مجھے سکینہ بھابی نے بتایا۔ عرصہ بعد اُن سے اچھے طریقے سے  
 ملا تھا۔ آئندہ کے لئے کچھ تسلی دی تھی۔ اور میری نصیحت کے مطابق انھیں  
 گھر دلانے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر۔

افسوس زندگی نے وفانہ کی۔ چند ہی دن بعد بھابی جانِ اعلیٰ کے ساتھ



شہر تک جا رہا تھا کہ ایکسڈنٹ ہو گیا.....“

چائے کا گھونٹ لیتے لیتے ماجد صاحب نے دُکھ بھری داستان کا اختتام کیا۔

”اب کبھی کچھ نہیں آگیا بیٹا۔ بلکہ اصل وقت اب آیا ہے۔ زرین کو عمر کے عین اس موڑ پر تمہاری ضرورت سب سے زیادہ تھی۔ تم ان لوگوں کو پا کر خوش ہوئے ہو۔ تو میرا بھی ذہن پر سے عرصہ کا گراں بوجھ ہٹ گیا ہے۔“  
 ”انکل میں واقعی بہت خوش ہوں۔ ماماؤں جان اداشان نے ابو اور بھائی کی جگہ پُر کر کے ہے۔ اس طرح سے کہ میں کبھی نہیں بچھتاؤں گا کہ میرے ابو اور میرا کوئی بھائی نہیں ہے۔ اور اب آپ دعا کریں کہ خدا مجھے سمیت اور استقامت دے کہ انہی کو کبھی یہ خیال نہ آئے کہ وہ بے سہارا ہیں اور زرین کبھی یہ محسوس نہ کرے کہ اُس کا باپ زندہ نہیں ہے۔“  
 اُس نے خالی کپ مینز پر رکھتے ہوئے کہا۔ اُس کے لہجے میں غم تھا۔  
 استحکام تھا۔

”مجھے بھی تم سے یہی امید تھی بیٹا۔“ انھوں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”مگر انکل۔ آپ کی ڈیوٹی اب بھی وہی ہوگی۔ آپ اُن کو پہلے کی طرح ملتے رہیں گے۔ میں اکیلا کافی نہیں ہوں۔ ہمیں اب بھی آپ کی ضرورت رہے گی۔“ ناصر حسبِ عادت خوشگوار لہجے میں بولا۔

”کیسی بات کرتے ہو بیٹا۔ ساری زندگی کا نااُمید میں اب توڑ دیا تھا۔ وہ بھی مگر ادیئے۔“

”انکل۔ اب اجازت چاہوں گا۔ اب بھی پہنچے پہنچے رات کے بارہ بج جائیں گے۔ گھڑی دیکھ کر کھڑے ہوتے ہوئے وہ مغذات کے لہجے میں بولا۔  
 ”ہاں بیٹا۔ رات رہنا ہوتا تو الگ بات تھی۔ وہ بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔“ ذرا ٹھہرو۔ تمہاری آنٹی کو بتا دوں۔

”ضرور۔ اور انکل۔ ایک بات اور۔ اتنی کہتی تھیں۔ یہ بات جب تک چھپی رہ سکے اچھا ہے۔ میرا مطلب ہے مائوں جان اور شان سے۔ آپ کو مائوں جان کی طبیعت کا پتہ ہے۔ گننام سے گاؤں کی، گننام غورت کو پتہ نہیں وہ قبول بھی کرتے ہیں یا نہیں۔؟ وہ پھر سے دکھی ہو گیا۔  
 ”ہاں یہ تو ہے۔ مگر تم دکھی نہ ہو۔ آہستہ آہستہ شاید ہموار ہو جائیں۔ اللہ پر چھوڑ دو سب۔“

”اچھا انکل۔ خدا حافظ۔“ اُس نے ماجد صاحب سے ہاتھ ملایا۔ ”خدا حافظ آنٹی۔“ اندر آتی ہوئی آنٹی کو بھی اُس نے ”خدا حافظ“ کہا۔  
 بیگم ماجد نے بہتیرا کھانے پر روکنا چاہا۔ مگر ماجد صاحب ہی نہ ملنے۔ پردے پانچ گھنٹہ کا راستہ طے کرنا تھا۔ شام پہلے ہی ہو چکی تھی۔  
 ”خدا حافظ بیٹا۔“ بیگم ماجد نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔  
 اور۔ پھر۔ وہ منٹوں میں اپنی خوبصورت نئی کار میں ہموار چلتی سڑک پر رواں دواں تھا۔



پہاڑ پر آئے آج اُسے دو ہفتے ہو گئے تھے۔ گومیہ والی علاقوں  
 میں سردی کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ زندگی معمول پر آ گئی تھی۔  
 مگر یہاں اب بھی پھٹی برف باری کے آثار جگہ جگہ جی برف کے  
 تودروں کی شکل میں نظر آ رہے تھے۔ نیچے بل کھاتی سرسبز سرسبز البتہ بالکل  
 صاف تھی۔ ادنیٰ نیچے درخت ادرا کا دکا کچے پکے مکانات بھی اپنا  
 سفید لبادہ اتار کر پھینک چکے تھے۔ سردی اگرچہ اب بھی بہت تھی۔ مگر  
 وہ منجھ کرنے والی خاصیت کھوپکی تھی جو کچھل بار اُس کی اور ناصر کی  
 یہاں دورات قیام کے دوران تھی۔

کیلے سردی سے گھبرائے اُسے ناصر صبح ہی صبح یہاں سے چلتا کر کے  
 نیچے شہر میں اتار لے گیا تھا۔

چھوٹا سا خوب صورت شہر  
 خیال آتے ہی۔ اُسے وہاں جانے کا خیال آیا۔



اچانک ہی وہ یہاں بوریست محسوس کرتے لگا۔ کتنے دن ہو گئے تھے اُسے یہاں آئے ہوئے۔

ہوسپٹل کی تعمیر کے سلسلے میں اُسے یہاں آنا پڑا تھا۔ قیام یہاں واقع اپنی ہی کوٹھی پر تھا۔ ان دنوں وہ میٹر میں اکٹھا کرنے کا بندوبست کر رہا تھا۔ کام سردی کا زور کم ہونے پر اگلے ماہ شروع کروانا تھا۔ "ذیشان کنسٹرکشنز" بڑے سے اپنے نام کے لگے بورڈ کے پاس ہی وہ کھڑا تھا۔

سامنے تاحد نظر مشینریز۔ گریڈرز۔ لکڑی کی پیٹیاں اور متعدد تعمیر سے متعلق چیزیں نظر آرہی تھیں۔ مزہ دوراب بھی ادھر سے ادھر صرف نظر آرہے تھے۔

اُس نے گھڑی دیکھی۔ دن کا ایک بج رہا تھا۔

کافی دنوں سے کام کر رہا تھا وہ۔

اب ذرا آڈٹنگ ہونی ہی چاہیے۔

بابا جان بھی کل چکر لگا چکے تھے۔ اُن کی آمد بھی فی الحال متوقع نہ

تھی۔ جلدی سے جیب میں بیٹھ کر وہ نزدیک ہی اپنی رہائش گاہ پر آیا۔

ناظم کو وہاں شہر کے ہوٹل میں ریزولیشن کے لئے فون کرنے کو کہہ کر وہ تیار ہونے لگا۔

گھنٹہ بھر بعد ہی وہ کریم بابا کی ہمراہی میں خود ہی ڈرائیو کرتا۔

چھوٹے اُس خوبصورت شہر کی طرف گامزن تھا۔



ڈرائیور کو آج اُس نے بھی ساتھ نہ لیا تھا۔ مطمئن ہو کر RELAX  
ہونا چاہتا تھا شاید۔

مختصر سے بازار سے ہوئے وہ ہوٹل کی طرف جانے والی سڑک پر  
ہو لیا۔ اور وہیں اُس کی نظر دائیں طرف دیوار پر لگے پکچر کے پوسٹر پر  
پڑی۔ "DIRTY DOZEN"

یہاں اتنی اچھی پکچر بھی آجاتی ہے؟ اُس نے سوچا۔  
گھڑی دیکھی۔ پکچر شروع ہونے میں کچھ دیر اب بھی تھی۔  
پتہ نہیں کیا بات تھی۔

اس شہر کے لئے روانگی پر بھی اُس کا دل۔  
عجیب سی خوشی محسوس کر رہا تھا۔

اور پھر اس وقت پکچر کا یہ پوسٹر دیکھ کر بھی اس کا دل اسے  
دیکھنے کو بچوں کی طرح چلا تھا۔ ورنہ تو۔  
سنجیدہ ماحول میں پیدائش۔  
مدبر فضا میں تربیت۔

اور تدبیر ہی کی توقع میں تودہ مشین کی قسم کی چیز بن کر رہ گیا تھا۔  
تدبیر۔ اصول۔ آن۔

زندگی ان ہی اصولوں کا نام ہو کر رہ گئی تھی جیسے۔  
ہوٹل پہنچتے ہی اُس نے کافی مشکواتی۔  
کریم بابا سامان لگانے لگے۔

شیو کا سامان خود نکال کر وہ ڈرلنگ روم جانے لگا۔ تو بابا کو حیرت سی ہوئی۔ شان کو شاید وہ پہلی بار کام کرتے دیکھ رہے تھے۔  
 ”آپ آگ کے پاس بیٹھو بابا۔ میں تیار ہوتا ہوں۔“ بیرے نے  
 آکر مٹی کا تیل بڑی سی انگلیٹھی میں رکھی لکڑیوں پر ڈال کر تیلی دکھائی  
 تو شان نے بابا سے کہا۔

کسی کی مدد کے بغیر شان کا تیار ہونا۔ بابا کے لئے یہ بھی نئی بات تھی۔  
 آج شان نے تیاری میں وہ اہتمام بھی نہیں برتا۔  
 گرم پانی سے منہ ہاتھ دھویا۔ سوٹا وہی رہنے دیا اور بالوں میں  
 برش کرتے ہوئے کمرے میں آگیا۔

وقت کی کمی تھا شاید یا پھر۔ کسی خوشگوار تبدیلی کا اثر۔  
 بابا نے دھیر ساری کافی کپ میں ڈال۔ ذرا سا ابلا پانی چائے دانی  
 سے ٹپکایا۔ تو شان نے کپ اٹھا کر خود پھینٹا شروع کیا۔  
 پیٹ تیار ہوا تو بابا نے مزید ابلا پانی ڈال دیا۔  
 ”چینی۔“ کپ میز پر رکھتے ہوئے شان بولا۔  
 اور بابا کو ایک اور تبدیلی نظر آگئی۔

”کتنی۔ چھوٹے صاحب؟“ اس پہلے وہ کافی میں چینی نہیں ملا تا تھا۔  
 ”آٹھ چمچ۔“ اور بابا نے آدھا چمچ چینی ڈال دی۔

اور پھر شان نے خلافِ عادت اس میں چند قطرے دودھ ٹپکایا۔  
 ”بہت اسٹرانگ پیتے تھے پہلے آپ۔“ بابا اس تبدیلی پر خوش



نظر آرہے تھے۔

"باں بابا۔ ناصر نے پلایا تھا دودھ اور چینی ملا کر۔ اچھا لگا  
 تھا ہم کو۔" چچہ چلاتے ہوئے اُس نے کپ اٹھالیا۔  
 اور بابا نے۔ اپنے لئے شکوائی چائے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے  
 سوچا۔ اُن کا چھوٹا صاحب عمر کے لحاظ اور تقاضے سے ہر کام  
 کرے تو کتنا اچھا ہو۔

"بابا۔ میں پکچر دیکھنے جا رہا ہے۔ آپ آرام سے اپنا ڈنر منگا کر  
 کھا لو۔" اُس نے جلدی جلدی کوئی حلق سے اُتار کر خالی کپ میز  
 پر رکھتے ہوئے کہا۔

"بہتر سرکار۔" بابا نے ہینگ پر سے اُس کا اوڈر کوٹ اُتارتے  
 ہوئے کہا۔ پھر اُس کے قریب چلے آئے۔

"اپنا خیال رکھئے گا سرکار۔ ڈرائیور کو ساتھ لے آئے تو اچھا  
 ہوتا۔" اُسے اوڈر کوٹ پہناتے پہناتے وہ حسبِ عادت تشویشناک  
 لہجے میں بولے۔

"اوکے بابا۔" شان نے کہا۔

اور۔ دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

اس میں بابا کا بھی قصور نہیں تھا۔

لندن کے قیام کے علاوہ۔ اُس سے قبل اور اس کے بعد ہمیشہ

بابا جان کے حکم کے مطابق ملازموں کی تحویل میں ہی رہتا تھا۔



زمینداری اور کاروبار کا بھاری بوجھ سنبھالنے کے باوجود بعض  
وقت اُسے اپنا چھوٹا سا ذاتی کام کرتے ہوئے بوجھ سا محسوس ہونے لگتا۔  
ہال میں اندھیرا ہو چکا تھا۔ گیٹ کیپر کی ٹارچ کی روشنی کی رہنمائی  
میں وہ گیلری میں سے چلتا لائن کی آخری سیٹ پر آ بیٹھا۔  
ہال میں خاصی سردی تھی۔ بیٹیں بھی آرام دہ نہیں تھیں۔  
بہر حال اُس نے پاؤں ایک طرف کر کے سامنے پھیلا لئے اور کوٹ  
کا کالر اچھی طرح سے درست کیا اور نظریں اسکرین پر جمادیں۔  
کسی پچر کا ٹریلر دکھایا جا رہا تھا۔

خدا خد اگر کے پچر شروع ہوئی 'WORLD WAR' کی پچر تھی۔  
بہت حزن کی۔ وہ ارد گرد سے بے خبر ہو گیا۔  
پھر انٹرول ہوا۔ بتیاں روشن ہو گئیں۔  
رائٹیں سمیٹ کر وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔  
اُس نے دیکھا گیلری تقریباً خالی تھی۔ دائیں طرف چار پانچ آدمی  
بیٹھے تھے۔ اور پھر اُس سے آگے ایک لائن چھوڑ کر ایک فیملی بیٹھی ہوئی  
تھی۔ چار لیڈیز ایک لڑکا۔

رہ کے کی شکل کچھ جانی پہچانی سی معلوم ہوئی۔ اور پھر اُسے یاد  
آیا۔۔۔ ساجد تھا۔ ماجد صاحب کا چھوٹا بیٹا شاید۔  
پھر یا جان یا سر علی کی ماجد صاحب سے پرانی دوستی ہونے کے  
نظم یہ لوگ کبھی کبھی اُن کے یہاں تاہر کی خیریت دریافت کرنے آتے تھے۔



اب تو باہا جان سے بھی اچھے خاصے تعلقات تھے۔ ناصر کبھی کبھی جانا تھا۔  
ان کے یہاں۔ شاید بیٹوں سے کبھی گپ شپ تھی۔ مگر خود شان سے ایسی  
کوئی قاصد بے تکلفی نہ تھی۔

ساتھ لیڈ تیر تھیں۔ ماں بہنیں ہوں گی شاید۔  
چوتھی سیٹ پر بیٹھی رٹ کی شکل بھی کچھ جانی پہچانی سی تھی۔  
شاید دیکھا تھا کہیں کسی پارٹی وغیرہ میں۔ اور۔  
آخری سیٹ پر بیٹھی رٹ کی نے سیٹ پر سے جھولتی اپنی لمبی سی  
چوٹی کو سنبھالنے کی کوشش میں سائیڈ پر دیکھا اور پھر۔ غیر ارادی  
طور پر پچھلی سیٹ کی طرف نظریں اٹھیں۔  
تو جانے کیوں۔ ؟

شان کو ایک لمحے کے لئے۔ اپنے دل کی دھڑکن بے ترتیب  
ہوتی محسوس ہوئی۔

زرین تھی۔ اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ۔  
ایک پل کو زرین کی نظریں شان کی نظروں سے ٹکرائیں۔  
اور پھر۔ دلکش چہرے پر حیالی کی لالی بکھر گئی۔  
گھنی خوبصورت پلکیں جھک گئیں۔  
اُس نے رخ واپس موڑ لیا۔  
ادر شان کو۔

چھوٹا سا یہ خوبصورت شہر بہت حسین لگا۔

" I DON'T CARE " اُسے اُس کے الفاظ یاد آ گئے۔

" SHE DOES CARE " اُس نے سوچا۔

اُس کی پلکوں پر چھائی لالی۔

پلکوں کا تیرا کر گرنا ہی کہتا تھا۔

اور پھر اُسے یاد آیا۔ سیٹھ حامد علی کے یہاں اُس نے زرین کو

اسی لڑکی کے ساتھ دیکھا تھا۔ بڑی عمر کی خواتین ماں و خالہ ہوں گی۔

اُس نے سوچا۔ اسی طرح ساجد سے بھی درمیان میں بیٹھی خواتین کے

ذریعہ ہی کوئی رشتہ ہو گا۔

زی۔ یہ لو۔۔۔ ساجد اُسے کھنی مونگ پھلیوں کا پیکیٹ دینے

لگا تودہ چونکا۔

" نو۔ تھینکس۔ میں نہیں کھاؤں گی۔ گلا خراب ہے سذین نے

معذرت کی۔

" کچھ نہیں ہو گا۔ میں دوائی دلا دوں گا۔ ساجد نے وہیں سے

ہی آحے جھپکتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر مونگ پھلی کا لٹاقہ اس کے

ہاتھ پر رکھ دیا۔

اور پتہ نہیں کیوں۔ شان نے سوچا۔

اس دوائی کے بچے " کو کرسی سمیت گیلری سے نیچے لڑھکادے۔

پکچر ختم ہو چکی تھی۔

وہ جلدی جلدی بیڑھیاں طے کرتا ہوا باہر پارکنگ میں آ گیا۔



چوکیدار کو پے منٹ کر ہی سر ہاتھا کہ وہ لوگ یکے بعد دیگرے  
سیڑھیاں اترتے دکھائی دئے۔

لڑکیاں آگے آگے اور خواتین پیچھے پیچھے تھیں۔  
جیب میں داخل ہونے سے قبل جانے کیوں اس نے ایک دانستہ  
نظر زمین پر ڈالی۔

شان کی نظروں کا رد عمل تھا شاید۔

زریں کی بھی نظریں اٹھ گئیں۔

اور پھر۔ پلکیں گرنے اٹھنے لگیں۔

تو نشان کا دل چاہا۔

چھوٹے سے اس خوبصورت شہر میں بسیرا کر لے۔

بتسم لب۔ مسکراتی آنکھیں۔ ہنسا چہرے لائے۔ وہ اپنی جیب

میں چاہیے بیٹھا۔

شام کے تین بج چکے تھے۔ چھوٹے سے خوبصورت بازار کی ہمسایہ  
 چھوڑ کر وہ قدرے کھلی۔ ہوٹل کی طرف جانے والی سڑک پر ہولیا۔  
 پہاڑی علاقے بھی کتنے پُر فریب ہوتے ہیں۔  
 دن چھوٹے اور راتیں لمبی محسوس ہوتی ہیں۔  
 طلوع آفتاب مدہوش کن۔ اور شا میں اُداس ہوتی ہیں۔  
 تین ہی بجے تھے۔ مگر سورج تیزی سے اونچے سرمئی پہاڑوں میں  
 پناہ ڈھونڈنے کے لئے سرگرداں نظر آ رہا تھا۔ نیلگوں آسمان شفاف تھا۔  
 اور۔ بڑا سا سفید بادل کا ایک ٹکڑا۔  
 دھیرے دھیرے پیلے آکاش پر آوارہ گردی کرتا۔  
 جانے کیوں۔ اُسے اپنے جیسے لگا۔  
 کل شام سے وہ بھی زندگی میں شاید پہلی بار۔  
 بلا مقصد۔ اُدھر اُدھر گھوم رہا تھا۔



کام نہ کاج۔ مزدی کا لوں سے فرار اختیار کئے۔  
اس شہر میں آوارہ گردی کرتا۔

دور۔ بہت دور اوپر آسمان کی وسعتوں میں۔ شاہانہ شان سے  
تیرے عقاب پر نظریں جمائے وہ آہستہ رفتار سے ڈرائیو کر رہا تھا۔  
تھی وہ چونکا۔

دائیں جانب سڑک کے کنارے زرین کھڑی تھی۔ اپنی اُسی دوست  
کے ساتھ۔ نسرین نام تھا غالباً۔ کالج کی عمارت کے قریب ہی تھی۔ شاید  
چھٹی ہو جانے پر کسی ٹرانسپورٹ کی منتظر تھیں۔

بلا سوچے سمجھے اُس نے پاس جا کر جیب روک لی۔

”آئیں۔ لے جاؤں آپ لوگوں کو۔“ آخر تو اب وہ ایک دوسرے  
کو اتنا تو جانتے ہی تھے۔ اور پھر بڑکیوں کا یوں سر راہ کھڑے رہنا  
اُسے کبھی اچھا نہ لگا تھا۔

”او۔ زی۔ نسرین اُسے پہچانتے ہی آگے بڑھی۔

”تم جاؤ۔ میں بس سے آجاؤں گی۔“ زرین سڑک پر نظریں  
جماتی ہوئی ہوئی۔

اور شان کے چہرے پر تاریک سے سائے لرز اُٹھے۔

”آئیں میں نسرین۔“ شان نے فوراً ہاتھ بڑھا کر اُس کے لئے  
دروازہ کھول دیا۔

اور نسرین واقعی آگے بڑھ آئی۔



نسرین نے چونک کر اٹھیں دیکھا۔ شاید اُس کا خیال تھا نسرین  
اُسے چھوڑ کر نہیں جائے گی۔ اور یا پھر اگر وہ جلے گی بھی۔ تو شان  
اُسے اکیلے لے کر نہیں جائے گا۔

ایک پل کو زی کا رنگ بدل سا گیا۔  
اُس کو ایک ہی پل میں شان نے دیکھا۔  
اُس کے چہرے پر غم کی کیفیت ابھری۔  
وہ مٹی تو حد نے جگہ لے لی۔

وہ بھی مدھم پڑ گئی۔ تو اپنی ہتک کا احساس چھلکنے لگا۔  
اور۔ شان کو ایک گونہ اطمینان کا احساس ہوا۔  
”زی۔ تم بھی آجائیں تو اچھا تھا۔ آج بہت دیر ہو گئی ہے۔“  
نسرین کو اپنی ماں کی فکر لگی ہوئی تھی۔ ذرا سی دیر ہو جانے پر پریشان  
ہو جاتی تھیں۔ زی کے دلی جذبات کے بے خبر حیرت میں بیٹھتے بیٹھتے وہ بولی۔  
”کہہ دیا نا بس سے آجاؤں گی۔“ اُس کی طرف دیکھے بغیر وہ بولی۔ اور  
اُس کے لہجے کی تلخی محسوس کر کے شان کو مزید اطمینان ہوا۔

”آپ چلیں۔ آجائے گا بس سے وہ۔“ ایک بھر پور نظر زی پر ڈالتے  
ہوئے اُس نے جیب اسٹارٹ کر دی۔

اور پھر نظروں سے اوجھل ہونے تک۔ برابر وہ سڑک کے کنارے  
کھڑی زی کو دیکھ رہی تھی۔

نسرین کو چھوڑ کر وہ سیدھا ہوٹل گیا۔ کپڑے تبدیل کئے۔ آگ کے



قریب صوفے پر بیٹھا۔ ٹانگیں سامنے کی میز پر سیدھی پھیلائیں۔  
 اور۔ کافی کی چسکیاں لیتا۔ رائیڈر ہیگرڈ کو پڑھتا رہا۔  
 کبھی کبھی البتہ ذہن کھٹک جاتا۔

زی۔ کیوں اُس کے ساتھ جانے پر رضامند نہ تھی۔؟  
 کل رات پچر ہاؤس میں تو ٹھیک ٹھاک تھی۔  
 آج اچانک کیا ہو گیا۔

"I DON'T CARE" اُسے اچانک یاد آیا۔ تو محترمہ کو اپنی  
 آن کا خیال تھا۔

پھر اُسے کل رات پچر ہاؤس میں اُس سے نظریں ملنے پر اُس کے  
 چہرے کی لالی اور پلکوں کا گرنا یاد آیا۔ ان پر شاید اُسے اختیار نہیں  
 بعض حرکات غیر ارادی بھی تو ہوتی ہیں۔

تو میڈم شعوری طور پر اُس سے انکاری ہے۔  
 اور غیر شعوری طور پر۔؟

اُس کے لبوں پر خوبصورت مسکراہٹ بکھر گئی۔  
 فی الحال اُس کا لا شعوری کافی تھا۔

شعور بعد میں دیکھا جائے گا۔ دیکھتے ہیں کب تک انکار کرتی  
 ہے۔؟ اُس نے سوچا۔

اور پھر اُسے اچانک یاد آیا۔  
 نرسین اُس کی چپ میں بیٹھنے کے لئے آگے بڑھی تھی۔



تو وہ - واضح طور پر جل گئی تھی - اُس کا لا شعور -

کتاب بند کر کے اُس نے میز پر رکھ دی - سرھونے کی پشت سے  
نکاکر آنکھیں موند لیں -

کبھی وہ کچھ سوچتا نظر آتا اور کبھی خوبصورت لبوں پر دلکش  
سکراہٹ ابھرتی - اور پھر -

اُسے اچانک نا صریح یاد آ گیا - اس وقت ہوتا تو کیا کچھ نہ کہتا -  
"بابا" اُس نے ڈرلینگ روم میں معروف کریم بابا کو آواز دی -  
"جی سرکار" وہ نمودار ہوئے -  
"پن اور پیڈ لادیں" اُس نے کہا -  
"اچھا حضور" وہ بولے -

اور پھر - وہ وہیں بیٹھا - دیر تک نا صریح کو خط لکھتا رہا -  
کبھی بخیدہ نظر آتا - کبھی لکھتے لکھتے مسکرا دیتا -  
شاید آج کی پوری رپورٹ دے رہا تھا -  
اگلے دن - وہ واپس پہاڑ پر چلا گیا -

یوں فارغ دن اُسے کم ہی نصیب ہوتے تھے - اور توقع کے  
مطابق کام کی رفتار بھی کم پڑی ہوئی تھی -

بہر حال - وہ پھر کام پر لگ گیا - ساتھ ساتھ ہر دوسرے روز  
بابا جان کو کام کا پروگرام بھی بتاتا جاتا تھا -



دُور دُور ہوئے وہ گاؤں سے واپس آیا تھا۔  
 بابا جان گاؤں پہنچے ہوئے تھے۔ چند ضروری نکتے لیے تھے، جن پر فون پر  
 تفصیل سے بات چیت نہ ہو سکتی تھی۔ اسی لئے وہ گاؤں چلا گیا تھا۔  
 گاؤں میں بھی زمینداری کے سلسلے میں بیسیوں مسائل منتظر رہتے تھے۔  
 اسی لئے باوجود یہاں ضروری کام کے وہاں چار دن رُکنا پڑا۔  
 دو دن پھر یہاں مسلسل کام میں لگا رہا۔ جسمانی اور ذہنی طور پر  
 وہ سخت ٹھکاوٹ محسوس کر رہا تھا۔  
 نیچے وادی میں شہر جانے کا سوچا۔ مگر۔۔  
 کل کا دن یہاں لگانا اشد ضروری تھا۔ اُس کے بعد اس کا پیالے  
 بھی کام کر داسکتا تھا۔

اور پھر۔ اسی طرح ایک دن مزید وہ صبح آٹھ بجے سے لے کر سہ پہر  
 تک مسلسل کام میں مصروف رہا۔ کئی فائیلوں سے نمٹنا تھا۔ کئی چیزیں



گودام میں چیک کرنی تھیں۔ اور پھر باقی کا سارا وقت وہ SITE پر موجود رہا۔  
کوٹھی پر واپس پہنچا تو سخت تھکا ہوا تھا۔ اُس نے کھانا بھی  
نہیں کھایا۔

”کافی لاد“ اُس نے آگ کے قریب رکھی آرام چیر پر ڈھیر ہوتے  
ہوئے ناظم سے کہا۔

اجانک اُس کے دل میں شہر جانے کی سوائی۔  
مگر تھکن۔ اُس نے مضموں سی انگڑائی لی۔

اور پھر۔ اُسے زکی کا خیال آگیا۔

لب خواہ مخواہ ہی مسکرا اٹھے۔ وہ کسی مشینی طاقت سے اٹھا۔  
بیل دبائی اور دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

”جی سرکار۔“ کریم بابا تھے۔

”بابا تیاری کریں۔ شہر جانا ہے۔“

”مگر۔ آپ تھکے ہوئے ہیں بیٹا۔ اگر ضروری کام نہ ہو تو۔۔۔۔۔“

مضموں نے اُسے گودوں میں کھلایا تھا۔ کبھی کبھی اپنی اولاد کی طرح  
حسرت کرنے لگ جاتے۔

”ضروری کام نہیں ہے مگر۔ وہ مسکرایا۔“ تھکن ضرور ختم ہو جائے گا۔

”جیسے حکم ہو۔“ اور کریم بابا تیاری میں مصروف ہو گئے۔

اُس نے کوئی پی۔ ناظم نے جیب میں سامان رکھوایا اور حسیب سابق

کریم بابا کو لے کر ڈرائیور کو ساتھ لئے بغیر ہی چل دیا۔



بادلوں سے ہی سہرے چمکتے سورج سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ کچھ  
 بادلوں کا پلہ بھاری ہو جاتا تو کبھی سورج کا۔ مگر ان دنوں اس موسم میں  
 بادلوں کی جیت یقینی تھی۔ دوپہر ڈھلتے ڈھلتے بادلوں نے ہلہ بول دیا۔  
 سورج بے چارے کو چھپتے ہی بنی۔ ہر سو بادل ہی بادل نظر آنے لگے۔  
 اُس نے گھڑی دیکھی۔ شام ہونے میں ابھی دیر تھی۔ مگر آسمان پر چھا  
 گھاؤں نے وقت سے پہلے ہی اندھیرا کھیل دیا تھا۔  
 کتنا اچھا لگتا تھا اُسے یہ سب۔ مسحور ہوتے ہوئے اُس نے اُڑا  
 پر نظر ڈالی۔

اونچے پہاڑ۔ گہری کھائیوں، سدا بہار پائینز۔ سب اس وقت  
 بلکوں ایسے سفید بادلوں کی لپیٹ میں تھے۔  
 چٹائی کی چکر دار سڑک پر بادلوں کا راج تھا۔ اُس نے ہیڈ لائٹس  
 رکھی تھیں۔ اس کے باوجود راستہ دیکھنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔  
 مگر ان سب کے باوجود اُسے موسم سے پیار تھا۔  
 "ٹپ۔ ٹپ۔ ٹپ۔" اچانک جیپ کی چھت بج اُٹھی۔ اور اس سحر  
 سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اس کے جیپ کے دائیں پرز چلا دیئے۔  
 شہر کے قریب پہنچ کر بابا کو اُس نے اُسی چھوٹی سی دکان سے  
 چائے پلائی۔ جہاں ناھر نے اُسے چائے پینے کے لئے روکا تھا۔  
 آج اُس نے خود بھی پی۔ اُسے الو کھا مزا آیا۔  
 ناھر سچ کہتا تھا۔ دودھ میں بنی چائے کی اس چھوٹی سی سیلی سی



پیالی میں جو مزا تھا وہ اندر کوئی نینل کے سڑے بھاری کپ میں نہیں تھا۔  
شہر کے اندر داخل ہو۔ تو  
اُسے عجیب سا احساسِ خوشی ہو رہا تھا۔ انوکھا سا مزاحوس  
ہو رہا تھا۔

رات کا کھانا اس نے دیہی کمرے میں منگوا کر کھایا۔ اور پھر وہ  
جلد ہی سو گیا۔

اوپنچائی پر بنے خوبصورت سی کیفے کے بیرونی حصے میں بیٹھا دوپہر  
کا کھانا کھا لینے کے بعد وہ کافی پینے میں مصروف تھا۔  
مطلع آج پھر ابراؤد تھا۔ سردی اختتام پر تھی۔ بادلوں نے اپنی  
دنوں برس کر تو دل کا غبار نکالا تھا۔

اس نے اوپر نگاہ کی۔ سیاہ گھٹائیں پورے آکاش کو گھیرے  
میں لئے تھیں۔

سامنے دیکھا۔ ہلکی ہلکی بوندیں بھی پڑ رہی تھیں۔  
ٹپے دیکھا۔ سڑک پر انفرانفری سی دکھائی دے رہی تھی۔ ابھی  
ابھی شاید قطرے پڑنا شروع ہوئے تھے۔

ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا۔ اور اُس کے سامنے جسم میں سرایت کر گیا۔  
اُسے بھی تو ایسی ہی یخ منجمد کرنے والی ہواؤں، گھٹاؤں اور بارشوں  
سے عشق تھا۔ ورنہ اس وقت کیفے میں دو تین ہی لوگ دکھائی دے رہے تھے۔  
وہ بھی اندر ہال میں گھسے آگ کے قریب کرسیوں پر سکرے بیٹھے تھے۔



”دیڑ“ اُس نے سامنے سے آتے دیڑ کو قریب بلایا۔

مردب دیڑ مرعوب نظر آ رہا تھا۔

”بل لاؤ“ اُس نے کہا۔

”او۔ کے سر“ اور دیڑ اندر کی طرف چل دیا۔

بارش زور پکڑ رہی تھی۔ نیچے سڑک پر پیدل چلنے والے مچھٹ گئے تھے۔ اکا دکا لوگ البتہ اب بھی چھتریاں سروں پر لٹکائے سکرٹے سیکڑتے چلے جا رہے تھے۔

اُس نے بل ادا کیا۔ رینا کوٹ کی ٹوپی سر پر کھٹیک کی۔ اور اپنے تلے قدم رکھتا لکڑی کی سیڑھیاں اتر نیچے آیا۔

جیب میں بیٹھا اور چل پڑا۔

آہستہ آہستہ وہ ہوٹل کی طرف جا رہا تھا۔

تبھی اس نے دُور سے دیکھا۔

وہیں۔ چند دن قبل والی جگہ پر سڑک کے کنارے ندین کھڑی

تھی۔ اُس نے فوراً پہچان لیا۔

آج اکیلی تھی۔ شاید اس کی دوست پہلے ہی جا چکی تھی۔ یا شاید آج

کالچ ہی نہیں آئی تھی۔ یا پھر وہ کالچ ہی میں رہ گئی تھی۔ بہر حال

وہ قریب آتا گیا۔

بارش اور آندھی کے زور سے وہ جیسے اپنا توازن کھوئے جا رہی تھی۔

وہ پاس آ کر رُک گیا۔



"آؤ۔ تم کو گھر ڈراپ کروں۔ دروازہ کھول کر اُس کی طرف چھانکے۔  
 ہوئے وہ بارش میں بھگی زرین سے اپنا بیٹ سے بولا۔  
 ایک پل کو وہ زرین کو اس طوفانِ باد و باران میں رحمت کا  
 فرشتہ نظر آیا۔ مگر۔ پھر۔

"میں بس سے چلی جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے جاؤ۔" اُس کے لہجے میں غصہ کی جھلک تھی۔ اُدا سی تھی،  
 تلخی تھی۔ مایوسی تھی۔ اُس نے گاڑی آگے بڑھا لی۔

اس غیر متوقع جواب پر زرین بارش و آندھی کے طوفان کو کھول  
 بھال اُسے جاتے دیکھنے لگی۔

شان آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔

کچھ باہر طوفان تھا۔ کچھ اُس کے اندر۔

قریبی موڑ کاٹتے ہوئے اُس نے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی دیو مر میں سے  
 دیکھا۔ زی کے پاس ایک سفید کار کھڑی تھی۔

کوئی اُسے لفٹ دینے لگا تھا شاید۔ یا پھر وہی کچھ غصہ قبل والا  
 واقعہ دہرایا جانے لگا تھا۔

غصہ کی شدت سے وہ پاگل ہوا تھا۔

اور کوئی پراہ کئے بغیر موڑ کاٹتے ہوئے نکل گیا۔ مگر۔ پھر۔

جانے کیسے؟ ایک شارٹ کٹ طے کرتا وہ دوبارہ اسی سڑک

پر نکل آیا۔



سفید کا رآہستہ آہستہ زرین کے پاس سے آگے رنگنے لگی تھی۔

”بیٹھو۔ ورنہ اتنا ماروں گا۔ کہ سارا زندگی یاد رکھے گا۔“ قریب پہنچتے

ہوئے اُس کے لئے دروازہ کھول کر اُس نے غصے سے کھولتے ہوئے کہا۔

کتاب میں ہاتھ میں لئے گھبرائی۔ یہی زرین بغیر کسی چوں و چراں کے

جلدی سے جیب میں آ بیٹھی۔

”تم کو بہت شوق ہے کوئی موٹر بائیک پر یا کار پر اگر تھائے سے ضرور

بات کرے؟“ گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے وہ مزید جھگھاڑا۔

زرین نے مزید گھبرا کر، سہم کر اُس کی طرف دیکھا۔

”میں جب کہتا ہے بیٹھو۔ پھر تو نہیں بیٹھتے سو۔ اور وہ...“

”اُس کے ساتھ بھی تو نہیں بیٹھی۔“ وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔ اور

شان کو غصے میں کہی اپنی بات کی تصحیح پر اور بھی غصہ آگیا۔

”بیٹھ جاتے اُس کے پاس بھی۔“ اُس کے طنز اور تلخی پر زرین کی

آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بولی کچھ نہیں۔

”تم۔ اپنے کو۔ اتنی اونچی کیوں۔ سمجھتی ہے؟“ اُس کی چپ شاید

اُسے اچھی نہ لگی۔ اور بھی۔ تلخی سے بولا۔

اور آنسو لڑاھک کر زری کے گالوں پر آ رہے۔

کیسا عجیب آدمی تھا۔ کھلائی بھی کرتا تھا۔ رُلاتا بھی تھا ذی نے

نازک سی خوبصورت انگلیوں کی لاروں سے اپنے آنسو پونچھ لئے۔

شان نے کٹکھیوں سے دیکھا۔



اُسے ایک گونہ اطمینان ہوا۔ پتہ نہیں کیوں؟  
 اور پھر۔ وہ چپ چاپ ڈرائیو کرنے لگا۔  
 "سوں" کر کے زرین نے ناک کھینچی۔ اور شان نے رخ پھیر کر ایک  
 مرد پر نظر اُس پر ڈالی۔

کوٹ۔ کپڑے۔ جوتے تک سب بھیگے ہوئے تھے۔  
 ڈارک براؤن بالوں کی ایک لٹ بھیگ کر سرخ گال سے  
 پک گئی تھی۔

وہ واقعی بہت خوب صورت تھی۔  
 "تم کو اکیلا گھومنے کا اتنا شوق کیوں ہے۔؟" لہجے کی تلخی اب کم  
 گئی تھی۔ مگر انداز اب بھی وہی تھا۔

زی کو اچانک اپنی توہین کا احساس ہوا۔ سُرخ سُرخ آنکھوں  
 سے اُس کو دیکھا۔

"میں گھوم نہیں رہی تھی۔ کالج آئی تھی۔  
 اور شان چپ سا رہ گیا۔ نظریں سامنے سڑک پر جمادیں۔  
 "کٹیک ہے۔ لیکن جب میں بیٹھنے کو کہتا تھا تو آئی کیوں  
 میں تھی۔؟"

عجیب زبردستی تھی۔ اگر وہ آ نہیں رہی تھی۔ تو اس میں اتنا بلا فروغ  
 نے کیا ضرورت تھی۔

"میری مرضی۔" سامنے دیکھتے ہوئے وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔



"تم بہت RROUD ہے۔" وہ پھر تیز ہونے لگا۔

"ٹھیک ہوں۔" اُس کی اُردو اور پختون زرہ لہجے پر مکمل ہنسی روکتی وہ اُس کے لہجے میں بولی۔

"اوہ۔" اُسے پھر سے غصہ آنے لگا۔ "تم۔ تم بہت سر بہ چڑھا ہے۔  
زرین نے اُسے دیکھا۔

اور پھر پتہ نہیں کیوں وہ اپنی ہنسی نہ روک سکی۔  
"تم ہنستا کیوں ہے۔؟" اور زرین کو مزید ہنسی آ گئی۔

اچھا آدمی تھا؟ بات بے بات پر غصہ ہو رہا تھا۔

شان نے اُس پر ایک گہری نظر ڈالی۔ اور پھر سامنے دیکھتے ہوئے  
ڈرائیو کرتے لگا۔

"آپ مجھے یہاں میری دوست کے گھر چھوڑ دیں۔" وہی جگہ قریب  
آ رہی تھی۔ جہاں کچھ غرصہ قبل اُس نے اُس کی دوست نسرین کو اتارا تھا۔  
"NEVER" وہ جیسے بدکا۔

"کیوں۔؟" وہ خیرانگی سے اُسے دیکھنے لگی۔

"میرا مرضی۔" وہ بے نیازی سے بولا۔

کچھ دیر قبل کی وہ تندی اب اُس کے چہرے پر نہیں رہی تھی۔

"نہ۔ میں آپ کی مرضی کی پابند نہیں ہوں۔"

"ہم دیکھتا ہے، کیسے ہتھیں ہو۔" وہ نسرین کا گھر دیکھے چھوڑتے ہوئے

سیدھا آگے نکل گیا۔



”مجھے ضروری نوٹس لینے تھے۔“

”کارلج میں لیتے۔“

”آج وہ نہیں آئی تھی۔“

”I CAN'T HELP IT“ وہ لاپرواہی سے کندھے اُچکا کر بولا۔

اور زی جزبہز ہو کر رہ گئی۔

”آپ اپنے آپ کو کچھ سمجھتے ہیں؟“ وہ غصہ سے بولی۔

”سمجھتا ہوں - SO WHAT؟“

”آپ بہت PROUD ہیں۔“

شان نے چونک کر زی کی طرف دیکھا۔

ایک پل کو غور سے اُس کی غصہ اُگلتی آنکھوں میں دیکھا۔

”دو PROUDS کا آپس میں دوستی ہو جائے تو کیسا ہے۔؟“

اچانک ہی اُس کا نازک سا نرم سا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں لیتے ہوئے اُس نے ہولے سے کہا۔

اور۔۔ غصہ اور تیزی بھول کر۔ گہرا کر زربین نے اپنا ہاتھ واپس

کھینچ لیا۔ شان محفوظ ہوتے ہوئے سامنے دیکھنے لگا۔

”میم صاحب۔ تم نے ہمارا بات کا جواب نہیں دیا۔ قدرے توقف

کے بعد اُس نے پھر کہا۔

اور وہ پھر گہرا گئی۔ کیا جواب دیتی۔ رُخ کھڑکی کی طرف کرتے

ہوئے اُس کے پختون لہجے پر آئی سکرابٹ پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔



ناہر بھائی پچ کہتے تھے۔ شان کو اُردو بولتے کبھی سنو تو تم سنیں نہ  
 روک سکو۔ بچارا بہت مشکل سے بول لیتا ہے۔ مجھ سے بھی زیادہ تراپنی  
 آسانی کے لئے انگلش میں بات کرتا ہے۔ میرا بھی یہی حال ہوتا اگر  
 ابو کی رہائش گاہ مستقل گاؤں میں ہوتی۔ مائوں جان البتہ گزارا  
 کر لیتے ہیں۔ ویسے ان کی انگلش سے میں بہت متاثر ہوں۔ بہت  
 خوب صورت ACCENT ہے اُن کا....."

"BY THE WAY MY DEAR"۔ تم کو نسا کلاس میں پڑھتی ہے؟  
 شان ہی بولا تھا۔

"تھر ڈائیر میں" رُخ اندر کی طرف کر کے نظریں اپنی کتابوں  
 پر جماتے ہوئے اُس نے دھیرے سے جواب دیا۔  
 "SEE!" چند لمحے وہ چپ رہا۔

"اگر میں تم کو ہر دن گھر ڈراپ کروں گا۔ تو تمہارے بڑے تو ناراض  
 نہیں ہوں گے؟"

ضرور ہوں گے۔" زی نے اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے اُسی کے  
 لہجے میں کہا۔

"اچھا۔" وہ کچھ بھی سمجھ بغیر سنجیدگی سے بولا۔ تمہارے گھر میں کون  
 کون ہوتا ہے۔؟"

"میری امی اور میں۔"

"WHAT ABOUT YOUR FATHER"



”اُن کی DEATH ہو چکی ہے۔“

”اوہ۔ ہمتارا بہن بھائی نہیں ہے؟“

”نہیں۔“ اُس کے لب دلہجے سے محفوظ ہوتی وہ سر نفی میں ہلا کر بولی۔

”ہوں۔ اس لئے تم بہت MEAN....“ اُس نے اپنے سر کو

چھوتے ہوئے کہا۔ ”سر پر چڑھا ہے۔“

”میں سر چڑھی نہیں ہوں۔ آپ۔ آپ سر چڑھے ہیں۔“ جانے

کیے کہہ گئی وہ۔ انداز میں شکوے کی ٹھٹھک نمایاں تھی۔

”ایم۔ سوری۔ اگر میں نے تم کو HURT کیا ہے۔“ سامنے دیکھتے

ہوئے وہ متاسف سا بولا۔ ”ویسے میں براؤڈ بالکل نہیں ہوں۔“

لوگ غلط اندازہ کرتا ہے۔“

اور زری۔ پھر۔ اُس کے لب دلہجے پر سگرائے بنا نہ رہ سکی۔

جانے کیا بات تھی؟ خالصتاً اپنے مادری لہجے میں الٹی سیدھی

اُردو اُسے معصوم بنائے دے رہی تھی۔

”ناہر مجھ سے بہت اچھا واقف ہے۔“ وہ مزید بولا۔

”ناہر۔ ک۔ ک۔“ اور وہ فوراً چپ ہو گئی۔

”ناہر۔ میرا کزن۔“ وہ جو.... وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اُس کی

طرف دیکھنے لگا۔ اور زری کا رنگ بدل سا گیا۔

اُسے اپنی طرف دیکھتے پا کر شاید وہ افشائے باز گھاٹ لیشہ سے

گھبرا گئی تھی۔



”میرا یار ہے۔“ اُس نے کہا۔

”اچھا۔ وہ سبھل کر بولی۔

”ہاں۔ جیسے تمہارا یار سرین ہے۔“

اور وہ خوبصورتی سے سنیں دی۔

”کیوں۔؟“ اُس نے اپنا ٹیٹ سے ہاتھ کی پشت سے اُس کا چہرہ چھوا۔

”دیکھ ہی۔“ وہ مزید سنیں دی۔

”تم ہمارا اردو پر سنہتی ہے۔ ہے نا۔؟“

اور زی کھلکھلا کر سنیں دی۔

”کیا کرے میم۔ فارن لینگویج جو ہے۔“ وہ بھی مسکرانے لگا۔

”ہمارا تو یہ ہے۔“ اُس نے جبرے کو ہاتھ لگایا۔ ”JAWS“ دُکھنے

لگا بولتے بولتے۔ اور تم۔ تمہارا زبان بہت مشکل ہے۔ اُس نے

مضموم سی بے بسی سے کہا۔

اور زی کو وہ اس کے بہت اچھا لگا۔

وہ ہنستے ہوئے ڈرائیو کرنے لگا۔

زی کا گھر قریب آنے لگا تھا۔

”میں کل ادھر ہوں۔ تم کو گھر کو لانے کو کالج آئے گا۔“ اُس نے ہرے

سے اُس کا ہاتھ دباتے ہوئے اپنا ٹیٹ سے کہا۔

”ہنیں۔ آپ تکلیف نہیں کریں۔ میں خود ہی آجاؤں گی۔ زی نے

ہاتھ چھڑاتے ہوئے گھبرا کر کہا۔

روز روز ایسا ہونا اچھی بات نہیں تھی۔

ایک سایہ سا شان کے پُرکشش چہرے پر لہرا گیا۔  
 "کتنے بچے چھٹی ہوتا ہے۔؟ جیب اُس کے دروازے کے آگے  
 روکتے ہوئے اُس نے پوچھا۔

"دو بچے۔" کتابیں ہاتھ میں لے کر وہ اترنے لگی۔

"میں آؤں گا۔" اُس کے لہجے میں عزم تھا۔

"شکریہ۔" اُن سنی کرتے ہوئے زی نے اُس کا گھر پہنچنے کے  
 لئے شکریہ ادا کیا۔

"ہائے۔" شان بولا

"ہائے۔" زی نے کہا اور۔ گہرائی سی گھر کے اندر داخل ہو گئی۔

رات ہوتے ہوتے زرین کو بخار نے آیا۔

گھنٹہ پھر تیز بارش اور آندھلی میں کھڑے رہنے کے باعث اتنا  
 تو ہونا تھا۔

کل ہی اُس کی اتنی نے سامان لئے گھر بھجوا یا تھا۔ ضرورت کی دو  
 چار چیزیں ہی رہتی تھیں۔ آج خیال تھا زی کالج سے لوٹے گی تو یہ چیزیں  
 بھی تانگے میں رکھ کر نئے گھر شفٹ ہو جائیں گے۔

مگر زرین کے گھر پہنچتے پہنچتے ہی چار بج گئے تھے۔ پھر کیڑے بدلتے  
 کھانا کھانے میں ہوتے ہوتے گھنٹہ بھر ادرا لگ گیا۔



شام ہونے کو تھی۔ اتنی نئے نئے گھر میں دن کے اس کے منتقل  
ہونا مناسب نہ سمجھا۔

کچھ زرین کی بھی طبیعت سست تھی۔ ہمت ہی نہیں پڑ رہی  
تھی۔ گو کہ نئے گھر میں جانے کی خوشی اُسے کتنے دنوں سے بے قرار  
کئے ہوئے تھی۔

سر شام ہی وہ یستر میں گھس گئی۔

”بیٹے۔ تاجر کو نئے گھر میں جانے کا خط آج ہی ڈال دو۔ نیا پتہ  
بھی لکھ دینا۔ پریشان ہو رہا ہو گا۔“  
”اچھا امی۔ لکھ دوں گی۔ سر میں درد ہے اس وقت تو۔“  
اور اتنی نے دودھ گرم کر کے گلاس میں لا دیا۔  
”لو بیٹی! یہ گولی دودھ کے ساتھ لے لو۔ ٹھنڈ لگ گئی ہے  
شاید۔ مسہری کی پٹی پر بیٹھتے ہوئے انھوں نے شفقت سے اس کے  
سر پر ہاتھ پھیرا۔

”ٹھنڈ۔ جیسی ٹھنڈ۔ اس وقت بھی ناصر کھائی کا کزن آکر نہ لاتا تو  
کھڑی ہی رہتی اسٹاپ پر۔“



”وہ لے کر آیا ہے۔؟“ اتنی نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں اتنی۔ وہ ادھر ہی ہے۔ شاید کسی کام سے آیا ہوا ہے۔  
آج کالج کے پاس سے گزر رہا تھا۔ میں بارش میں کھڑی تھی تو  
لفٹ دے دی۔“

”اچھا۔“ وہ کچھ متفکر سی بولیں۔ بیٹا کسی اور کے ساتھ بغیر بچے  
سمجھے نہ بیٹھ جانا۔“

”پہلے کسی کے ساتھ بیٹھی ہوں اتنی۔ ناصر کھائی کا رشتہ دار تھا۔  
اس لئے آگئی۔ ورنہ....“

”وہ تو ہے۔ مگر۔ ناصر کے بارے میں تو کچھ نہیں کہتا تھا۔  
”نہیں تو۔“ زرین نے کہا۔

”تمہ نے تو کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔؟“

”نہیں۔ اب میں اتنی بے وقوف بھی نہیں ہوں۔ جس بات کو  
آپ چھپانا چاہتی ہیں۔ وہی کروں گی جہکے۔“ وہ دودھ ختم کیے  
گلاس سرمانے رکھی تپائی پر رکھتے ہوئے بولی۔

”ہاں۔ ناصر نے ویسے بھی لکھا ہے کہ وہ خود ہی سب ٹھیک  
کرنے کی کوشش کرے گا۔ آہستہ آہستہ۔“

اتنی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

ادر پھر۔ رات ہوتے ہوتے اُسے تیز بخار چڑھ گیا۔  
صبح وہ کالج بھی نہ جاسکی۔ ناشتہ کے بعد اتنی نے بخار اتارنے



دالی گولی دودھ کے ساتھ کھلائی۔ اور خود مختصر سامان اکٹھا کرنے لگیں۔

دس بجتے بجتے اس کا بخارا ترچکا تھا۔ نقاہت تھی۔ مگر نئے گھر کی خوشی میں سب بھول بھال وہ اتنی کے ساتھ بمعہ سامان کے تانگے میں جا بیٹھے۔

نیا گھر بہت پیارا تھا۔  
دو بیڈ روم کی خوبصورت سی اینیکی تھی۔ دو ہی باتھ روم۔  
کچن۔ اور ڈرائینگ ڈائننگ اکٹھے تھے۔  
زی اپنا بخارا بھول بھال اُسے چوکیدار کی مدد سے صاف کرانے اور پیٹ کرنے میں لگ گئی۔  
تھوڑا سا تو سامان ہی تھا۔ دوپہر تک کسی نہ کسی طرح لگا ہی لیا۔

اتنی اور زی کا اکٹھا بیڈ روم تھا۔ دوسرا صر کے لئے ٹھیک کرایا۔

ڈرائینگ روم میں دو چار دن قبل کا خریدا سکیئر ہینڈ سادہ سا صوفہ رکھا۔ اسی طرح ڈائننگ روم میں میز کرسیاں لگائیں۔ اور صر کے لئے خریدا بیڈ اُس کے بیڈ روم میں ڈال دیا۔

اور پھر۔ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد چوکیدار نے گھر کی مزید صفائی کی۔ تو چھوٹا سایہ خوبصورت گھر نفاس سے چمکا اٹھا۔

شام کو زی کو دوبارہ بخار نے آلیا۔ اتنی پریشان تھیں۔ اُس کی ذرا سی تکلیف سے وہ بے چین ہو جاتی تھیں۔ انہوں نے چوکیدار کو ڈاکٹر کے پاس بھگایا۔ اور جب تک وہ دوا لے کر آتا۔ زی کو پھر بخار کی دوا دے دی۔

اور۔ بستر میں گھسی بخار کی شدت سے بے تاب زی کو جانے کیوں شان کا خیال آ گیا۔

آج وہ دو تین بجے کے قریب حب سابق کالج اسٹاپ پر آیا ہو گا۔ زی کا تو ویسے بھی اُس کے ساتھ آنے کا ارادہ نہ تھا۔ مگر اُس نے اُس کو دہاں موجود نہ پا کر ضرور سوچا ہو گا کہ اُس نے جان بوجھ کا ایسا کیا ہے۔

معا اُس کی نظروں میں اُس کا پرکشش چہرہ گھوم گیا۔ اُس پر تاریک سائے لرزاتے دیکھے۔ اور۔ پھر اُسے غصہ میں دیکھا۔

”تم۔ اپنے کو۔ اتنی اونچی کیوں سمجھتی ہے۔؟“ غصہ میں سمجھناشان اُردو میں بمثل لفظ جوڑ جوڑ کر بولا تھا۔

اور۔ بخار میں تپتی زی بے اختیار ہنس دی۔



مگر پھر۔ باوجود اُس کے ساتھ گھر تک نہ آنے کے ارادے کے۔  
اس وقت اُسے انوس ہوا۔

بقول اُس کے خود "فارن لینگوئج" کے لفظ بمشکل جوڑتا۔  
اٹک اٹک کر ادا کرتا۔ پھر کچھ خفیف سا مسکراتا۔ وہ کتنا محسوس  
لگتا تھا بے ضرر سا۔ سادہ سا۔ ا  
اکھڑا۔ مغرور سا۔

"دو PROUDS کا آپس میں دوستی ہو جائے تو کیسا ہے؟"  
اُس کی آواز کی بازگشت۔

کانوں میں پڑتے ہی وہ چونکی۔

اور پھر۔ نہ چاہتے ہوئے بھی، وہ اُسی کے متعلق سوچتی رہی۔

وہ مقررہ وقت پر وہاں گیا۔ مگر زی نہیں تھی۔  
 کالج کی تو بھٹی ہو چکی تھی۔ پھر؟ اُسے مایوسی سی ہوئی۔ آگے  
 زرتے ہوئے وہ چھوٹے سے بازار کا ایک اور چکر کاٹتے ہوئے پھر  
 اسی طرف آنکلا۔

دور سے اُس نے دیکھا نسرین اسٹاپ پر کھڑی تھی۔ اکیلی ہی۔  
 مزید مایوسیوں نے اُن گھیرا۔  
 کافی دور سے ایک بس آرہی تھی۔ نسرین کے پاس آکر رُکی۔ تو وہ  
 جلدی سے جا بیٹھی۔ وہ پھر وہاں سے گزرا۔ آہستہ آہستہ۔ مگر کوئی اُتار نہ  
 تھوڑی کے۔ گول چکر کاٹتے ہوئے وہ تیسری بار وہاں سے گزرا۔  
 اور پھر۔ سیدھا ہوٹل چلا گیا۔

زی نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا۔ یا تو جان بوجھ کر وقت سے پہلے  
 ہی گھر چلی گئی تھی۔ یا پھر جان بوجھ کر گھر سے کالج ہی نہ آئی تھی۔ یقیناً اُس  
 سے بچنے کے لئے۔ اُس نے جان بوجھ کر اُسے AVOID کیا تھا۔



کل صبح کے بجائے اُس نے ابھی ابھی جیب میں سامان ڈلوایا اور  
واپس پہاڑ پر جانے کے روانہ ہو گیا۔

تمام راستہ اُس کا ذہن غصہ سے بھناتا رہا۔

واپس پہنچا تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ سخت ذہنی تناؤ کے بعد اس وقت  
وہ تھکا تھکا۔ مضمحل ہوا سا تھا۔

کپڑے تبدیل کئے۔ نرم و گرم بستر میں گھسا۔ تو قدرے سکون احساس  
ہوا۔ اُداسی البتہ اب بھی پُرکشش چہرے پر چھائی ہوئی تھی۔

”کھانا نہیں لاؤں صاحب؟“ ناظم نے آکر پوچھا۔

”کھانا نہیں۔ کیک کا ایک پیس اور کافی۔“ اُس نے بیدھے ہوتے  
ہوئے نرم نرم تکیوں سے بستر کی پشت سے ٹیک لگالی۔

گرم اسٹرونک کوئی پی۔ تو جیسے ساری تھکن دور ہو گئی اُداسی  
بھی معدوم ہونے لگی۔ اور پھر۔ فون پر وہ دیر تک بابا جان سے کنسرکشن  
سے متعلق اہم باتیں کرتا رہا۔

رات کو کئی کروٹیں بدلتے کے بعد وہ سو گیا۔

اگلے دن۔ سارا کام کر داتا اور کرتا رہا۔

موسم اب بہتر ہو رہا تھا۔ تعمیر کا کام چند دنوں میں شروع کر دینے کا  
سوچتے ہوئے اُس نے گاؤں جانے کا پروگرام بنالیا۔

چند دن گاؤں میں رہا۔

موسم اب بہتر ہو رہا تھا۔ گندم کی فصل سنہری ہو رہی تھی۔ مزارعوں  
کی مصروفیت بڑھ گئی تھی۔

اُسے گاؤں میں رہ کر سکون کا احساس ہو رہا تھا۔

مدتوں بعد۔ کیا جانے کیا ہوا تھا۔ شان نے دل کھول کر ماما سے گپ  
پپ کی تھی۔ کتنی ہی دیر اُن کے پاس بیٹھ کر کتنی ساری باتیں کی تھیں۔  
یہ نہیں تھا کہ وہ واقعی ہی معذور تھا۔ یا پھر اُس کی تربیت ایسی کی گئی  
تھی کہ اُسے ماما کے پاس بھی بیٹھ کر کھل کر بات کرنے کی اجازت نہ تھی۔ بلکہ حالات  
یہ کچھ ایسے ہو گئے تھے۔ منین کی مانند۔ کہ اُسے موقع ہی نہ ملتا گاؤں میں سکون  
سے بیٹھ کر۔ ماما سے سکون سے بات کرنے کا۔

وہ چھوٹا سا ہی تھا کہ اتنی فوٹ ہو گئی تھیں۔ اور پھر ماما نے ہی اُس کی  
پرورش کی تھی۔ بابا جان نے بے شک کہ ملاں اور باپ دونوں بن کر اس کی تربیت  
کی تھی۔ مگر اُس کی پرورش میں ماما کا بھی پورا پورا ہاتھ تھا۔

"شان بیٹے۔ اب تو اس سونے سونے گھر میں بہو آئی ہی چاہئے۔"  
ماما کی زبان پر اُن کی دیرینہ آرزو آج مچل ہی تو گئی۔

"اوہ۔ ہاں ماما۔ اب تو واقعی آنا چاہئے۔" سر پر کھمکا سفید ملل کا  
دوپٹہ اُن کے سر پر ٹھیک سے اوڑھاتے ہوئے وہ خوشگوار سے بولا۔

"سچ کہتے ہو بیٹا۔؟" ماما نے تصدیق چاہی۔ وہ جو آج تک اس  
موضوع کو ٹالتا آیا تھا۔ حیرانگی کی تو بات تھی۔

"ہاں۔ اُس کے لہجے میں شرارت تھی۔

"تو پھر کدوں بات۔ بڑے صاحب سے۔؟"

"ہوہ۔ نہیں ماما۔" اُس نے گہرا کر کان چھوئے۔



”کیوں نہیں۔ وہ بھی فکر مند رہتے ہیں اسی خیال سے۔ یہی تو عمر ہے  
 بوڑھے ہو کر تو کوئی شادی نہیں کرتا۔  
 ”مگر۔ ماما۔۔۔۔۔“

”کیا۔؟“ انھوں نے پوچھا۔  
 ”مجھ کو کوئی لڑکی اچھا تو لگے نا۔“ اور اُسے زری کا خیال آگیا۔  
 بات کرتے کرتے اُداس ہو گیا۔  
 ”بڑے صاحب تو ابھی پچھلے دنوں بھی کسی گھرانے کی بات کر رہے تھے۔ کہتے  
 تھے گھرانہ تو اچھا ہے۔ مگر لڑکی بہت۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ سوئی سوٹرن ہے۔“  
 اور۔ شان نے جاندار قبضہ لگا لیا۔  
 ”سوٹرن۔ ماما سوٹرن۔“ اُس نے تصحیح کر دی۔

”ہاں وہی۔“ ماما نے کہا۔  
 ”پھر۔؟“ شان نے سوال کیا۔  
 ”بس انھیں پسند نہ آئی۔ ہمیں معلوم ہے بڑے صاحب کی طبیعت۔“  
 ”تو پھر ماما اب ہم کیا کر سکتا ہے۔“  
 ”تو بیٹا۔ تم خود کوئی لڑکی پسند کر دنا۔ یوں بیٹھے تو نہیں رہو گے۔  
 دو بچوں کے باپ ہوتے۔ وقت پر شادی کی ہوتی تو۔“  
 اور پھر شان زور سے ہنس دیا۔  
 ”اب شان بوڑھا ہو گیا ہے ماما۔“  
 ”اے خدا نہ کرے میرا بچہ بوڑھا ہو۔ مگر اپنے صاحب کا پتہ ہے



کتنی عمر میں شادی کی تھی۔

"کتنا عمر تھا۔؟" اُسے ماما کی باتوں میں مزا آ رہا تھا۔

"مشکل سے اٹھارہ سال کے ہوں گے۔"

"اچھا۔ اُس نے مصنوعی حیرانگی سے پوچھا۔

"بس۔ اب اور زیادہ مذاق میں مت ٹالو۔ پورا گھر۔ پورا گاؤں  
اُس دگائے بیٹھا ہے۔

"اور کے ماما۔ اب ضرور سوچے گا اس بارے میں۔

رات سونے سے قبل بابا جان کا فون آ گیا۔ ابھی بنام کوستان نے  
خود انھیں اپنے گاؤں میں آنے کی اطلاع دی تھی۔ کافی دیر تک مختلف  
موضوعات پر تبادلہ خیال بھی کیا تھا۔ مگر شاید کوئی فردری کام پیش آ گیا تھا۔  
اور پھر اُس کا اندازہ درست نکلا۔

جس پلاٹ پر کنٹرکشن ہونے والی تھی۔ اُس کے دھلان والی رُخ پر  
زمین کے سابق مالک سے ایک اور شخص کا تنازعہ نکل آیا تھا۔ دونوں وہیں  
نیچے شہر کھدہ بنے والے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر قبل وہ شخص بابا جان سے  
ملا تھا۔ شان سے اس وقت وہی مسئلہ موضوع گفتگو تھا۔ کام شروع  
کر دانے سے قبل مذکورہ اشخاص سے شان کا بذاتِ خود ملنا اور کوئی  
کسلی بخش تہنیدہ کر لینا فردری تھا۔

"وہاں جا کر کسی موزوں جگہ پر اُن لوگوں کی میٹنگ بلاؤ۔ IT IS A MUST"

"لو کے بابا جان - DON'T WORRY - میں سب کھٹیک کر لوں گا۔



کل ہی روانہ ہو جاؤں گا۔

اور پھر اگلے دن۔ یہاڑ پہ پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ سونے کی  
کوشش کی۔ مگر بار بار آنکھ کھل جاتی۔ سکون سے سو ہی نہیں سکا۔  
صبح شہر جانے کا خیال آیا۔ تو نیند ہی اڑ گئی۔ زی ایک بار پھر  
اُس کے تصور میں ابھر آئی۔

اُسے واقعی زی اچھی لگنے لگی تھی۔

اس سے قبل وہ کئی لڑکیوں سے مل چکا تھا۔ متاثر بھی ہوا تھا۔  
مگر صرف اُن کی خوبیوں سے۔

کوئی اگر خوب صورت تھی تو اُسے تو صیفی نظروں سے دیکھتا۔ کوئی  
نیک سیرت تھی۔ تو بھی دل میں سراہا تھا۔ اودھیں۔  
مگر۔ عجیب سی بات تھی اب کی بار تو۔

زی خوبصورت تھی۔ مگر اُس کی خوبصورتی اُسے کھینچتی تھی۔ جیسے اپنی  
طرف۔ نیک سیرت تھی تو اُس کی سیرت اُس کے دل کو چھوتی تھی۔ جیسے  
جا کر۔ اور پھر۔ کچھ اور بھی تھا۔

اس میں خود داری تھی۔ اُس کے ساتھ ساتھ اکھڑی تھی۔  
اور شاید یہی وہ چیزیں تھیں۔ جو شان کو کھانے لگی تھیں۔  
وہ پہلی ہی ملاقات میں اُس کے پاس خود نہیں آئی تھی۔  
بلکہ تب تو اُس نے شان سے بیزاری کا اظہار کیا تھا

اور پھر۔ جب اتفاقاً وہ بار بار سیرِ راہ ملنے بھی لگی۔

تو اپنی خود داری ہاتھ سے جانے نہیں دی۔

اُسے شاید پسند بھی کرنے لگی تھی۔ مگر جھکنا نہیں جانتی تھی۔

ایک معمولی گھرانے کی لڑکی تھی۔ مگر اپنی آن رکھنا جانتی تھی۔

”ٹنگ.... ٹنگ.... ہال میں لگے کلاک کی آواز تھی۔

ہاتھ بڑھا کر اُس نے لیمپ آن کیا۔ گھڑی دیکھی صبح کے پانچ بج رہے

تھے۔ وہ بستر سے نکلا۔ ہاتھ روم گیا۔ اور نماز کی تیاری کرنے لگا۔

نماز پڑھی۔ فارغ ہو کر دوبارہ بستر کی طرف بڑھا ہی تھا

کہ ناظم بیڈ ٹی لے کر حاضر ہوا۔

”سلام چھوٹے صاحب“

”سلام“ اُس نے جواب دیا۔

ناظم نے ٹرے میز پر بستر کے قریب لگادی اور خود انگیٹھی میں بڑی

بڑی لکڑیاں جما کر اُن میں آگ سلگادی۔

شان نے گرم گرم چائے کا گھونٹ حلق سے اُتارا تو طمانیت کا

احساس ہوا۔ بیڈ ٹی میں دیر وہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

”صاحب۔ رات نیچے شہر سے جانِ عالم صاحب کا فون آیا تھا۔

آپ سے خد بات کرنا چاہتے تھے۔ مگر آپ تھکے ہوئے تھے۔ میں نے بے آرام

کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ پیغام دینے کا کہہ دیا اُن کو۔ کہتے تھے اُن کے

بیٹے کی شادی پر آپ نہیں جاسکتے تھے۔ کل جمعہ کو ولیہ ہے۔ آپ ضرور



آئیے گا۔ ورنہ وہ خفا ہوں گے۔

”ہوں۔“

آج شہر تو جانا ہی تھا۔ کل ولیمہ بھی ایٹنڈ کرے گا اُس نے سوچا۔  
بابا جان شاذ ہی ایسے موقعوں کے لئے وقت نکال سکتے تھے۔ یہ  
کام بھی شان کو ہی کرنے پڑتے تھے۔

ناظم خالی برتن اٹھا کر چلا گیا تھا۔ شان کو پھر سوچوں نے  
آن بگھرا۔ کون تھی زرین؟ اچانک اُسے خیال آیا۔

اگر وہ اس کا ذکر بابا جان سے کر دے تو کیا وہ مان جائیں گے؟  
اور پھر اُسے سنسی بھی آئی۔

اتنی جلدی۔ اتنا آگے سوچنا۔

جب کہ اُسے یہ بھی اچھی طرح نہیں معلوم تھا کہ آیا زرین بھی اُسے  
پسند کرتی تھی یا نہیں۔

اگر اشاروں کنایوں کی کوئی زبان تھی تو پھر زرین بھی اُسے اچھا  
سمجھتی تھی۔ اُسے دیکھ کر بلیش بھی ہو جاتی تھی۔ پلکیں گرنے، اٹھنے لگتی  
تھیں۔ وہ اُسے تھوڑا کر سیرین کو گھر ڈراپ کرنے چل پڑا تھا۔ تو وہ  
واضح طور پر ہل گئی تھی۔ لیکن اگر۔

اُس کی بالوں پر غور کیا جاتا تو ایسی کوئی قابلِ توجہ بات ہاتھ نہیں  
آتی تھی۔ جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا کہ وہ بھی اُسے پسند کرتی تھی۔

اور پھر شان نے اُسے اگلے دن گھر ڈراپ کرنے کو کہا تو منہ کر گئی



تھی۔ شاید اپنے گھر والوں کا لحاظ تھا۔

مگر پھر۔ اگلے دن آئی ہی نہیں۔ اگر تھوڑا بھی اس کا خیال ہوتا تو۔ آتی تو سہی۔ ! وہ پھر سے دکھی ہو گیا۔

اور پھر وہ اُلجھ گیا اپنے آپ سے۔ اُسے کیا ہو گیا تھا۔ ایک عام سی لڑکی کے لئے اپنی سوچیں فضول گزارنے لگا تھا۔ مگر۔ کیا وہ۔ عام سی لڑکی تھی۔ ؟

وہ تو عام سے ہٹ کر تھی۔ دل نے سرگوشی کی۔

جی بھی تو وہ بے چین سا تھا۔ بے قرار سا تھا۔

ان دکھی سی چیمیں محسوس کرتا تھا۔ اپنے پہلو میں۔

بے نام سی خلش کا احساس رہتا تھا دل میں۔ اور پھر۔

وہ آئی کیوں نہیں؟ اُسے اتنا ہی گیا گزرا سمجھتی تھی۔ اُسے

اچانک اپنی توہین کا احساس ہوا۔

اُس پر۔ غصہ آنے لگا۔ بے طرح۔ بے تحاشہ۔

اور پھر۔ اُس نے فیصلہ کر لیا۔

شہر جا کر اُس سے مٹھیر ہوئی بھی تو کوئی لفٹ نہیں کرے گا۔



”اللہ۔ دیر ہو گئی ہے۔ بس کمبخت نظر ہی نہیں آتی۔“ نسرین نے گھڑی دیکھ کر جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

وہ لوگ گھنٹہ بھر سے کالج کے نزدیک، بس اسٹاپ پر گھڑی بس کے آنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ وہ بسیں آئی بھی تھیں۔ مگر کھنچا کھنچ بھری ہوئی۔ رُکے بغیر ہی سامنے سے گزر گئیں۔ کھڑے کھڑے اُس کی ٹانگیں جواب دینے لگی تھیں۔

”روز یہی ہوتا ہے۔ مصیبت...“ زی بھی بڑبڑائی۔

دُور دُور تک بس کا پتہ نہیں تھا۔

”پتہ نہیں۔ وہ ذیشان پھر نظر نہیں آیا۔“ اس مصیبت کے موقع

پر اچانک نسرین کو ذیشان یاد آ گیا۔

ایک بار اسی طرح کھڑے کھڑے جب ہمت جواب دینے لگی تھی تو اُس نے اچانک آکر لفٹ دینے کی پیش کش کر دی تھی۔

زرین کا رنگ بدل سا گیا۔

اُس کے پھر نہ آنے سے تودہ خود بھول پریشان تھی۔

پتہ نہیں کیوں؟

”ہاں کون لوگ ہیں۔ دیے ہیں بہت شریف۔“ نسرین نے اُس کا

توٹس لئے بغیر پھر کہا۔ ”دیے زی تم کیوں نہیں بیٹھ رہی تھیں۔ جب وہ

ہمیں گھر چھوڑنے کو کہہ رہا تھا۔ اس دن؟“

”بس یو نہی۔ اب ہر بار ضروری تھوڑی ہے کہ بیٹھا جلتے۔“

اُس نے لا پرواہی سے جواب دیا۔

”دیے لگتا شریف ہے۔ ہمیں کوئی غلط رائے قائم نہیں کرنی

چاہئے۔“ نسرین نے کہا۔

”ہوں۔“ زی دھیرے سے بولی۔

اور ابھی۔ دُور فاصلے پر فاصلے پر ایک جیب آتی دکھائی دی

”اوہ۔ خدا کرے ذیشان ہو۔ اور ہمیں گھر چھوڑ آئے۔“ نسرین

خوش ہوتے ہوئے بولی۔

زی کا دل بے ترتیبی سے دھڑکا۔

اتنے دھیر سارے دن بعد۔

شاید وہی تھا۔

اور زی کو واضح طور پر احساس ہوا۔

وہ اتنے دھیر سارے دن اُس کی منتظر رہی تھی۔ اُس کی راہ دیکھی تھی۔



چاہا تھا کہ وہ آئے۔ اُسے ملے۔

"پتہ نہیں کون کبھی تھا۔ دھول ہی اڑا کر چلا گیا۔" نسرین  
زی کے دلی جذبات سے بے خبر مایوس انداز میں آگے بڑھتی جیب کو  
دیکھتے ہوئے بولی۔

اور زی کے۔ خوبصورت چہرے پر تاریک سائے گھر آئے۔  
کہاں چلا گیا تھا وہ؟ اُس نے اُداسی سے سرچا۔  
گھر پہنچ کر اُس نے کپڑے تبدیل کئے۔ اور کھانا کھائے بغیر ہی بستر  
میں جا گھسی۔

زی کھانا کیوں نہیں کھایا۔؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" اتنی  
پاس آتے ہوئے تشویشناک لہجے میں بولیں۔

"ٹھیک ہوں اتنی۔ آپ بلا وجہ فکر مند ہو جاتی ہیں۔"  
"تو پھر کھانا کیوں نہیں کھایا۔"

"بس دل نہیں کر رہا۔" اُس نے کہا۔

"دونو اے ہی کھا لیتیں۔ مٹریچہ پکا یا ہے۔" اُنہوں نے اُس کی  
پسندیدہ ڈش کی لالچ دی۔

"نہیں اتنی۔ رات کو کھالوں گی۔" اُس نے رضائی پھر سر  
تک کھینچ لی۔

"جیسے تمہاری مرضی۔" اتنی اپنے کام میں لگ گئیں۔



اور زرین۔ اپنے سے اُلجھ پڑی۔

کیوں۔ وہ ایک سائے کے نیچے بھاگ رہی تھی۔

وہ ایک مغرور شخص۔

کسی لڑکی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔

اور وہ۔ خواہ مخواہ اُس کے لئے اُداس ہو رہی تھی۔

”دو PROUDS کا آپس میں دوستی ہو جائے تو کیسا ہے؟“

اُس نے کہا تھا۔

مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ اُسے پیار بھی کرنے لگا تھا۔

پیار۔؟ وہ چونک پڑی۔

کیا وہ اُس سے پیار کرنے لگی تھی۔؟

اوہ۔ اُس نے سر تھام لیا۔

اتنی بے چین۔ اتنی بے قرار

اُداس اور مُرجھائی ہوئی وہ اس لئے رہنے لگی تھی

کہ وہ اُس کو چاہنے لگی تھی۔

گھبرا کر۔ اُس نے لحاف منہ سے ہٹایا۔ اور اُٹھ کر اتنی کے

پاس آ بیٹھی۔

وہاں بھی دل نہ لگا۔ تو باہر چھوٹے سے لان میں نکل آئی۔

”کیا کرے سیم۔ فارن لینگوئیج ہے نا۔۔۔“ نل سے پانی بھرتے پھٹان

چوکیدار کو دیکھتے ہی اُس کے کانوں میں جیسے کسی نے کہا۔



اور۔ تھک کردہ اندرا آگئی۔

اپنے بیڈ روم میں۔ پھر باتھ روم میں۔

چہرے پر پانی کے چھینٹے ڈالے۔ تو لیے سے خشک کرنے لگی۔ تو سامنے  
شیٹے میں اپنے چہرے پر نظر پڑ گئی۔

کتنی اُداس اُداس تھیں اُس کی آنکھیں۔ بدلیاں منڈ لائیں۔

اُس نے۔ پلکیں جھپک کر پار دیکھنے کی کوشش کی تو۔

گھنگھور گھٹائیں برس پڑیں۔

”زی۔“ یکایک اتنی کی آواز آئی۔

”جی اتنی۔“ اُس نے جلدی سے آنکھیں رگڑیں۔

”اپنا سوٹ تو دیکھو۔ آج درزی سے لے کر آئی ہوں۔“ اُسے آتے

دیکھ کر اتنی نے لفافے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

کرسی پر سوٹ پھیلا کر وہ جلدی سے اس پر جھک آئی۔ مبادا

اتنی کی نظر، اُس کی آنکھوں پر پڑ جائے۔

”کل جانِ عالم صاحب کے بیٹے کا ولیمہ ہے نا۔ سوچا اُس

میں پہن لوں گی۔“

”کون سے جانِ عالم صاحب؟“ وہ بے دھیانی میں بولی۔

”ارے وہی یہاں کے ٹھیکیدار۔ کچھلے جمبہ بیٹے کی شادی ہوئی تھی۔ اس

جمبہ کو ولیمہ دے رہے ہیں۔“

”ہوں۔“ قہیض کو الٹے پلٹے ہوئے وہ دھیرے سے بولی۔



اتنی۔ زی۔ نسرین اور اُس کی اتنی۔ ٹھیکیدار جانِ عالم کے گیٹ  
کے اندر داخل ہوئیں۔

باہر مردانہ سائید پر گاڑیاں ہی گاڑیاں نظر آرہی تھیں۔  
قدرے فاصلے پر بیرونی لان میں شامیانوں کے تلے کرسیوں پر  
بیٹھے اُن گنت ہرمان نظر آرہے تھے۔  
عورتیں البتہ اندرونی دروازے سے گھر کے اندر داخل ہو  
رہی تھیں۔

”زی۔“ نسرین نے اچانک سرگوشی کی۔ ”ذیشان کی گاڑی  
بھی کھڑی ہے۔“

”ہو گی۔“ زی نے لاپرواہی سے کہا۔

”وہ دیکھو۔ وہی بھر ہے۔“

اور۔ زی نے دیکھا۔ واقعی اُسی کی گاڑی تھی۔

دل ایک بار پھر۔ زور سے دھڑکا۔

اور پھر۔ وہ نسرین کے ساتھ اندرونی دروازے میں  
داخل ہو گئی۔

تمام وقت وہ ایک انجانی سی خوشی محسوس کر رہی تھی۔  
گو کہ دل کبھی کبھی کسی انجانے ہی فحشے سے رُک رُک سا جاتا۔  
رنگ برنگے آنچل لہرا رہے تھے۔ عورتیں خوش گئیوں میں مصروف



تھیں۔ پھر کھانا لگایا گیا۔ لیڈیز نے یہاں بھی فاضی مستعدی دکھائی۔

فنکشن ختم ہو چکا تھا۔ کئی جہان جاچکے تھے۔

زرین اور نسرین کی اتنی نے بھی بیگم جانِ عالم سے اجازت لی۔  
اندیہ لوگ بھی باہر نکل آئیں۔

جانِ عالم صاحب۔ شان سے مصافحہ کرتے ہوئے اُس کے  
ساتھ اُس کی گاڑی تک آئے۔

وہ گاڑی میں بیٹھتے زگا۔ تو نظریں غیر ارادی طور پر اندر کی  
طرف سے آتی خواتین کی ٹولی پر پڑیں۔

ایک پل کو اُس کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی۔  
اُس نے زرین کو دیکھا۔

دُھیرا رے دونوں کے بعد۔

ارکارلٹ۔ ریڈڈریس میں کتنی پُرکشش لگ رہی تھی۔

سُر پھر۔ اُس کی آنکھوں کی چمک بجھ گئی۔

گاڑی میں بیٹھا۔

جانِ عالم صاحب کو "فدا حافظ" کہنا۔

اور تیزی سے گیٹ کی طرف مڑ گیا۔

رات اُس نے کرڑیں بدل بدل کر بے چینی سے گزار دی۔ کیا ہو گیا  
 تھا اُسے؟ وہ جھنجھلا جھنجھلا اُٹھا۔  
 کسی لڑکی سے متاثر ہونا اتنا کہ انسان اپنی سُدھ بدھ ہی کو بھیجے۔  
 اس پتھر پر وہ یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔  
 جی بھی۔ شاید۔ اس وقت ناشتہ کے بعد بھی کرسی کی پشت سے  
 سرٹکائے بیٹھا وہ اپنے آپ سے اُلجھ رہا تھا۔  
 جانِ عالم صاحب کے بیٹے کا ولیمہ تو وہ کل ایئرڈ کر چکا تھا۔  
 چلا ہی جاتا یہاں سے۔ مگر جس کام کے لئے وہ با با جان کی ہدایت  
 پر آیا تھا۔ وہی رُکا ہوا تھا۔  
 دراصل مذکورہ اشخاص میں سے ایک باہر شہر سے گیا ہوا تھا۔ اُس نے  
 آج رات کو آنا تھا۔ اور کل صبح دس بجے اُس نے سب کی میٹنگ ہوٹل کے  
 ہال میں بلوائی تھی۔ کل کا دن لازمی اُس نے یہاں رُکنا تھا۔



ورنہ خود اُس کا دل۔

اس بار یہاں پھرنے کو ایک پل کو بھی نہیں چاہ رہا تھا۔  
وہ ستر سے اُٹھا۔ رات کے کپڑے تبدیل کئے۔

چند ضروری ٹیلی فون کالز کرنے تھے۔ باری باری اُن سے فارغ ہوا۔  
دو چار ضروری خط لکھنے تھے۔ جن کے لئے پہاڑ پر وقت نہ نکال سکا تھا۔  
وہ لکھ ڈالے۔

ادرجہ۔ بے سرحہ ہو کر بستر پر پڑا رہا۔ رات بھر سویا تو نہیں تھا۔  
بے خبر ہو کر آنکھیں موند لیں۔

آنکھ کھلی تو چار بج رہے تھے۔ شام کے۔

وہ ہڑٹا کر اُٹھ بیٹھا۔ ایسی غفلت کی نیند وہ بہت کم سویا تھا۔  
اُٹھ کر اُس نے گرم گرم پانی کا شا درلیا۔ طبیعت بشاش ہو گئی۔  
ڈریس آپ ہو کر وہ کمرے میں آ گیا۔

”کھانا۔ چھوٹے صاحب۔“ کریم بابا تھے۔ جو کمرے سے باہر کتنی دیر  
سے اُس کے جاگنے کے منتظر بیٹھے تھے۔

”نہیں بابا۔ صرف چائے۔“ وہ چوڑی سی کھڑکی کے پاس آتے  
ہوئے بولا۔

”سینڈوچ ہی کھا لیجئے۔ سرکار۔“ بابا کو اُس کا اس قدر کم کھانا  
پینا کبھی اچھا نہیں لگتا تھا۔

”اد۔ کے بابا۔ جیسا آپ کہے گا۔“ نظروں ہی نظروں میں کھڑکی سے



باہر کا لازدال حُسن سراہتے ہوئے وہ خوشگواہری سے بولا۔

اور۔ بابا اُس کی چائے کا آرڈر دینے چل دیئے۔

کل کا دن مزید یہاں۔ اُس نے نیراری سے سوچا۔

کمرے کی طرف رخ کرتے ہوئے وہ یوں ہی خالی نظروں سے ادھر

ادھر دیکھنے لگا۔

پھر آگے بڑھ کر۔ روم سروس کے نمبر ڈائل کئے۔

گولف کے بارے میں اپنی خواہش ظاہر کی۔ اور پھر چائے سے فالغ

ہوتے ہی وہ گولف کلب کی طرف ہو لیا۔

پیدل ہی۔ فرلانگ کا تو فاصلہ تھا۔

گو کہ کوئی اور موقعہ ہوتا۔ تو یہاں بھی۔ اُس کا ڈرائیور مستعد کھڑا

اُسے کلب پہنچانے کو منتظر کھڑا نظر آتا۔

مگر۔ کچھ عرصے سے۔ اُس میں تبدیلیاں آرہی تھیں۔

نمایان طور پر۔

یہ الگ بات تھی۔ کہ وہ خود اکیس محسوس نہیں کر پارہا تھا

کافی دیر وہ وہیں مصروف رہا۔ اُسے اچھی کمپنی ملی تھی۔ وقت

گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ پھر گھڑی دیکھی۔ چھ بجنے ہی والے تھے۔

تھکا تھکا سا وہ باہر نکل آیا۔

شارٹ کٹ کرنے کے لئے اُس نے ایک مختصر سی کھیتی کی پگڈنڈی

کا انتخاب کیا۔ اور سر جھکائے گم سا آگے بڑھنے لگا۔



معاذِ بچھے آہٹ ہوئی۔ شاید کوئی اور بھی آ رہا تھا۔

پلڈنڈی شاید عام طور شارٹ کٹ کے لئے استعمال میں آتی تھی۔  
بچھے دیکھے بغیر ہی وہ بائیں طرف پر ہو گیا۔  
آنے والے کو راستہ دینے کے لئے۔

”آپ.....؟“ زی شاپنگ کے لفافے دونوں ہاتھوں میں اٹھائے  
سیڑھی کھڑی رہ گئی۔

اور شان کوئی جواب دیئے بناڑک گیا۔

شاید اس اچانک اور اتفاقاً مڈ بھڑ کے لئے ذہنی طور پر تیار نہ تھا۔  
”آپ ابھی یہیں ہیں۔ میرا مطلب ہے اس شہر میں؟“ زی نے  
حواس مجتمع کر کے مزید پوچھا۔

”ہاں۔“ اُس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور جانے کے لئے  
قدم بڑھا دیئے۔

زیرین بھی ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

دراصل اُس کی رت کا پی ختم ہو گئی تھی۔ اور اُسے ابھی تھوڑی دیر  
قبل ہی خیال آیا کہ خریدنی جائے۔ کلاس میں اس کے بغیر گزارہ نہ تھا۔  
اسی کھیتی سے ہوتے ہوئے بچھے گولف کلب کے دائیں طرف  
دکانیں کھیں۔ اور اسی کھیتی سے ہو کر بالکل سامنے نظر آنی دو چار  
کوٹھیوں کے پاس اُن کی انیکسی تھی۔ اسی لئے وہ بلا خوف و خطر اکثر  
تریداری کے لئے گھر سے نکل آتی تھی۔



"آپ کی یہاں کوئی کام ہوتا ہے؟" زرین نے محسوس کیا۔ شان  
 بچی کھنچا سا تھا۔ شاید اُس کے پچھلے رویہ کی وجہ سے۔ تلافی کے طور پر  
 لیزا اس نے بات کرنا ضروری سمجھا۔  
 "ہاں۔" شان نے ایک نظر اُسے دیکھا۔ اور پھر سامنے دیکھتے ہوئے  
 تھرسا جواب دیا۔

آج تو وہ بولے جارہی تھی۔ شاید اس لئے کہ وہ نہیں بول رہا تھا۔  
 "کیا کام ہوتا ہے۔؟" اُسے اختصار سے کام لیتے دیکھ کر وہ  
 مصومیت سے پوچھنے لگی۔

اور شان کو اپنا ارادہ ڈالناں ڈول ہوتا محسوس ہوا۔  
 اتنی چھوٹی سی چیز۔ اتنے بوجھل کاموں کا پوچھ رہی تھی۔ بس  
 م ہوتا ہے۔" اُس کی ہنڈ پھر اڑے آگئی۔

اور وہ لا جواب کی ایک نظر اُس پر ڈال کر آگے بڑھنے لگی۔  
 "دائیں کب جایش گئے۔؟" اُس نے ایک اور سوال کر دیا۔  
 اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ کیسے اُسے نارمل کرے۔  
 اُس نے چہرے پر تو ایک سختی تھی۔ چٹان جیسی۔  
 "جب کام ختم ہو جائے گا۔"

"کام کب ختم ہو گا۔؟" اُس کے لہجے میں بلا کی مصومیت تھی۔  
 اس سے کھل کر بات کر لینے کی اپیل تھی۔  
 "جلدی۔" اُس کا لہجہ اب بھی جذبات سے عاری تھا۔



زی کا خوب صورت چہرہ مایوسیوں کی زد میں تھا۔ کسی طرح

ٹھیک ہو ہی نہیں رہا تھا۔

”پھر چلے جائیں گے آپ؟“ ہجہ ملتے جلتے تھا۔

”OF COURSE“ وہ بے رحمی سے بولا۔

”اُن“ زی جلدی سے وہیں بیٹھ کر اپنا پاؤں دیکھنے لگی۔

شان نے دیکھا۔ اُس کے پاؤں کے تلوے سے خون کا فوارہ چھوٹ گیا تھا

شیٹ کے نوکیلے ٹکڑے سے اُس کا پاؤں زخمی ہو گیا تھا۔

لفافے ایک طرف رکھ۔ وہ اپنے پاؤں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ سینڈل

اتاری۔ خوب صورت گلابی نازک سے پیر سے سُرخ سُرخ خون ابل ابل کر

اُسے بھگوئے دے رہا تھا۔

غیر ارادی طور پر اُس کی نظریں شان کی طرف اٹھیں۔ تکلیف

شدت سے اُس کی خوبصورت آنکھوں میں کرب اتر آیا تھا۔

شان میں جیسے کسی مشینی قوت سے جنبش ہوئی۔ ساری رنجش بھول

بھال۔ وہ اُس کے قریب زمین پر دوڑا نہ ہو کر بیٹھا۔

تلوے کی طرف دیکھا۔ کافی گہرا زخم آیا تھا۔ اُس کا پاؤں اپنے زانو پر رکھ

ہوئے اُس نے اپنی ہتھیلی اُس کے تلوے پر سختی سے دبا دی۔

ایک نظر زی کو دیکھا۔

اُس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ درد کی شدت دبانے کی کوشش میں

اُس نے ہونٹ بھینچ لئے تھے۔



نقاہت سے بند ہوئی آنکھوں سے اُس کی تکلیف عیاں تھی۔  
 "زی۔ اُس نے اُس کا سراپے بازو کے حلقے میں لے لیا۔  
 "ورد ہو رہا ہے۔" زی نجیف آواز میں بولی۔ ساتھ ہی  
 آنکھیں نم ہو گئیں۔

"OH NO MY LOVE" ٹھیک ہو جائے گا۔ اُس نے  
 بے اختیار اپنے ہونٹ اُس کے ماتھے پر رکھ دیئے۔  
 شان نے دیکھا خون کسی طرح رُک نہیں رہا تھا۔ "گھر جاؤں گی۔"  
 "نہیں۔ پہلے ہاسپٹل جانا چاہئے۔"

اُس نے جلدی سے کوٹ کی جیب سے رومل نکال لیا اور  
 کس کر زخم پر باندھ دیا۔

"اتنی پریشان ہو رہی ہوں گی۔" زہینہ سر اٹھا کر بولی۔  
 "DON'T WORRY"۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" شان نے آہستہ  
 سے اس کا پاؤں اپنے زانو سے اٹھا کر نیچے ٹکا دیا۔ "میں ٹیکسی کی  
 کوشش کرتا ہوں۔" وہ اٹھنے لگا۔

"میں گھر جاؤں گی۔ وہ سامنے تو ہے۔" اُس نے پریشانی سے  
 سامنے دیکھا۔

ڈارلنگ۔ اُس نے اٹھتے اٹھتے اُسے اپنے پہلو سے لگاتے  
 ہوئے اس کے سر پر پیار کر لیا۔ "خون بند نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر کو  
 دکھانا ضروری ہے۔"



وہ اُٹھ کر تیزی سے سڑک کی طرف بڑھا۔ چند قدم پر تو تھا۔  
 زی کی محوسات عجیب سی ہو رہی تھیں۔  
 تکلیف کی اس شدت میں بھی جیسے دُنیا بھر کے خزانے اُس پر  
 پھراور ہو رہے تھے۔

پھر اُس نے دیکھا۔ شان ٹیکسی پالینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔  
 تیز قدم چلتا اُس کے پاس آیا۔  
 اصرار کر کے اُسے اپنے ہاتھ کا سہارا لینے پر مجبور کرتے ہوئے  
 ٹیکسی تک لے آیا۔

ایمر مبنی لے جا کر اُس نے اُسے ڈاکٹر کو دکھایا۔ زخم واقعی گہرا تھا۔  
 لوگوں انیسٹمینز یاد دے کر اُس کے ٹانگے لگے۔

اس دوران اُس نے ہوسپٹل سے ہی زی کے بتائے ہوئے اُن کے  
 پاس والی کوٹھی کے فون نمبر پر اُس کی اتنی کوساری بات بتا کر یہ  
 کہہ کر تسلی دی کہ ابھی چند منٹ میں ہی وہ اس کو لے کر پہنچنے والا تھا۔

ٹیکسی زرین کی انیکسی پر رُکی۔

اتنی گیٹ پر ہی پریشان حال منتظر کھڑی تھیں۔ انکس کی مدد  
 سے وہ زرین کو اندر اُس کے بیڈ روم میں بستر تک لایا۔ اُسے آرام  
 سے لٹایا۔ اوپر لحاف ڈالا۔

”آئی۔ زی کا واسطے گرم دودھ اور اوڈلیٹن چاہئے۔“

شان بالکل یوں یوں رہا تھا جیسے اس کا ہی فرد ہو۔ حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے تھے۔

”ابھی لاتی ہوں۔ بیٹا تم بیٹھو  
انٹی کچن چل دیں۔“

شان نے ادھر ادھر کسی مناسب جگہ کی تلاش میں نظر میں دوڑائیں۔ اور پھر وہ وہیں زری کی منہری کے پی پر بیٹھ گیا۔ یہی اُسے سوزوں جگہ معلوم ہوئی۔

زری کی آنکھیں نقاہت سے بند تھیں۔

”کیسا طبیعت ہے اب جان۔“ اُس کا بڑا ہلکا سا ہلکا ہوا آواز اُس نے اپنا بیت سے کہا۔

”ٹھیک ہوں۔“ اُس نے آنکھیں کھول دیں۔

شان کو اپنے سر پر ہاتھ بیٹھے۔ اپنی طرف غور سے دیکھتے پا کر اُس کی پلکیں تپک کر گر گئیں۔

اور شان کو اُس سے گلا۔

چھوٹا سا یہ خوبصورت شہر اُس کا اپنا تھا۔

”I LOVE YOU DEAR“ وہ اُس کے چہرے پر جھک آیا۔

باری باری اُس کی دواؤں آنکھوں کو ہونٹوں سے چھوتے ہوئے آہستہ آہستہ بولا۔

اور سیدھا ہوا۔ تو



جھٹ زی نے اپنی آنکھیں بازو سے دھک لیں۔

"NO" شان نے اُس کا بازو ہٹا کر پکڑ لیا۔ "SEE"

SHAAN IN THEM"

کیسی باتیں کر رہا تھا وہ۔ شرمناک اُس نے دوسرا بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔ چہرہ مٹھنچل ہوتے ہوئے بھی کانوں کی لوڈوں تک سرخ ہو گیا۔  
"یہ کبھی نہیں" اُس نے دوسرا بازو بھی گرفت میں لے لیا۔  
"چھوڑیں نا" بند آنکھیں کئے وہ بے بسی سے بولی۔

"نہیں" اُس نے کہا۔

"انجی آرہی ہیں" زی نے دھمکی دی۔

"آتے دو" اُس نے ایک نظر دروازے پر ڈالی۔

"آپ بہت ڈھیٹ ہیں۔"

وہ پشاشت سے ہنسا

"ہم ڈھیٹ نہیں ہے۔" ایک بار پھر اُس نے اُس کی بند آنکھوں پر پیار کر لیا۔

"آپ ہیں۔۔۔ وہ اپنے بازو چھڑانے لگی۔

بھئی کوریڈور میں انجی کے قدموں کی آہٹ ہوئی۔

اُس کے خوب صورت ماتھے کو اپنے لبوں سے چھوتے

ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

انجی ٹرے لئے اندر آئیں۔



کھڑکی کے پاس سے ہلکی سی مینر اٹھا کر زی کے بید کے پاس رکھتے ہوئے ٹرے اس پر رکھ دی۔

”تم ابھی تک کھڑے ہو بیٹا۔ بیٹھو نا۔ اُسے زی کے سر پر ہانے کھڑے دیکھ کر بولیں۔

شان نے ایک نظر زی پر ڈالی۔

گھبرا کر زی اتنی کو دیکھنے لگی۔

اتنی وہیں کھڑکی کے پاس رکھی کر سی بھی اٹھا لائیں۔

”بیٹھو بیٹا۔“ کرسی مینر کے قریب رکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔

”تم چائے پیو۔ میں زرین کو دودھ پلاتی ہوں۔“

”THANK YOU“ شان نے کہا۔

آگے بڑھ کر زی کے تکیے مسہری کی پشت سے ٹکائے اور اتنی

کی موجودگی کا احساس کئے بغیر اُسے با آسانی اوپر کھینچتے ہوئے اُس

کی پشت تکیوں سے ٹکا دی۔

زی کا رنگ سرخ ہو گیا۔

اور اتنی نے سوچا۔ کتنا نیک اور مخلص لڑکا تھا۔ اتنے بڑے

گھرانے کا تھا۔ مگر غرور اور تکبر نام کو نہ تھا۔

انہوں نے زی کی مسہری کی پیٹی پر بیٹھتے ہوئے اُسے دودھ

کا گلاس تھا دیا۔ اور شان۔ اُس کے مقابل کر سی پر بیٹھ کر اپنے

لئے چائے بنانے لگا۔



گاہے گاہے وہ نظریں اٹھا کر زی کو دیکھ لیتا۔

ادری کا رنگ عنابی ہو جاتا۔

کئی دنوں کی کچھ کہتی شان خوب صورت آنکھیں آج کھل کر  
بول رہی تھیں۔

چائے کا آخری گھونٹ لے کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”آنٹی۔ اگر زی کو ٹیپر پھر ہوتا ہے تو.....“ اُسے یاد آیا ڈاکٹر نے  
کہا تھا۔ ”ٹیپر پھر ہو تو کوئی بخار اُتارنے والی دوا دے جائے۔“ گھر  
میں ہے کوئی نارمل کرنے کا میڈیسن۔؟“  
”ہاں بیٹا ہے۔“

”اگر ضرورت پڑتا ہے تو دے دیں۔“

”اچھا بیٹا۔ خدا عمر داز کرے۔“

”او۔ کے آنٹی۔ اب ہم جاتے ہیں۔ کل شام کو آئے گا پھر۔“

خدا حافظ۔“

”خدا حافظ بیٹا۔ اتنی بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔“

”بائے میم۔“ اُس نے خوشگوار لہجہ میں زی سے کہا۔

اور۔ باہر نکل آیا۔

زکی۔ جو بھی تھی۔ جہاں کی بھی تھی۔

اُسے اچھی لگتی تھی۔ اُس نے اچھی طرح سوچ لیا تھا۔ وہ اُس کے علاوہ کسی اور کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

جہاں تک یہ سوال تھا۔ کہ گھرانہ کیسا ہے۔؟

توزرین اور اُس کی اتنی اچھے شریف لوگ معلوم ہوتے تھے۔ رہن سہن بلکہ انسان کے اٹھنے بیٹھنے سے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ کیسا ہے۔ پھر زرین آج کل لڑکیوں کی طرح ایڈوانس اور مودرن نہیں تھی۔

اُس کے برعکس اُس میں حیا کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

اور۔ یہی شاید وہ بات تھی۔

جس کی اُسے تلاش تھی اتنے عرصہ۔

مگر۔ بابا جان۔ اُن کو کیسے سمجھائے گا؟



وہ تو بال کی کھال اُرتاتے ہیں۔ اور پھر اس معاملے میں۔؟  
 اُس کے لئے لڑکی پسند کرنی تو اُہوں نے کچھ کافی عرصے سے  
 شروع کی تھی۔ اتنی ہی آسانی سے پسند آتی ہوتی تو وہ کبھی کی  
 پسند نہ کر چکی ہوتے۔

کون ہیں؟ کہاں کے رہنے والے ہیں؟ ذات کیا ہے۔؟  
 نسب نسب؟ باپ کون ہے؟ ماں کس خاندان کی ہے؟ لڑکی  
 کیسی ہے؟ سیرت کیسی ہے؟ آج کل لڑکیوں کی طرح  
 موڈرن تو نہیں؟ صورت کیسی ہے؟ یہ پوائنٹ بھی بہت اہم  
 ہے۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔

گھبرا کر اُس نے کروٹ بدلی۔

اور اگر ان میں سے ایک بھی چیز اُن کے معیار سے کم نکلی تو صاف  
 انکار کر دیں گے۔

مگر۔ وہ جھپٹا سا اٹھا۔

آخر وہ بھی بچہ تو نہیں تھا۔ رستائیں اٹھائیں کا سن تھا۔ کچھ  
 تو وہ بھی بُرا بھلا سمجھتا تھا اپنا۔ اور پھر۔  
 اُسے زہی پسند تھی۔ وہ مجبور تھا۔ اُس نے ہر پہلو سے اس بات پر  
 غور کیا تھا۔ اور پھر۔ اُس نے جیسے جتنی فیصلہ کر لیا۔

وہ اب کے گھاؤں جائے گا تو بابا جان سے اپنی خواہش کا  
 اظہار کرے گا۔



رات بیت گئی۔ صبح ہوئی۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر تیار ہوا۔  
 کچھ دیر فون پر بابا جان سے باتیں کیں۔ اور پھر مقررہ وقت پر  
 میننگ اٹینڈ کرنے ہال میں چلا گیا۔

گھنٹہ بھر کی بات چیت میں ہی تھوڑا سا خوارہ نتارچ برآمد ہوئے۔ باقی  
 تحریروں کی کارروائی رہ گئی تھی۔ اور گواہوں کے دستخط۔ وہ کوئی ایسا مسئلہ  
 نہ تھا۔ ہفتہ بھر میں سب ہو جاتا۔ البتہ کل کا دن باقی اشخاص کے ساتھ  
 اُسے بھی علاقے کے ہتھوڑی کا انتظار کرنا تھا۔

عام حالات میں اُسے ایک دن مزید رکنے پر سخت جھنجھلاہٹ  
 ہوتی۔ وقت ضائع ہونے کا شدید احساس ہوتا۔  
 مگر اب کے۔ پورا ایک دن ضائع ہو جانے کا احساس تو ضرور ہوا۔  
 لیکن یہاں رکنے پر جھنجھلاہٹ نہ ہوئی۔

وہ زرین کو مل لیتا۔ اُس نے سوچا۔  
 اُس کے پاؤں کی ڈرلنگ بھی تو کروانی تھی۔  
 اُس نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ کوئی اور ایسا پروگرام  
 نہیں تھا کہ مصروف ہو جاتا۔ کھانے کا وقت بھی نہیں ہوا تھا۔

ہوٹل سے نکل کر گاڑھی میں بیٹھے بیٹھے ہی وہ سوچ رہا تھا۔  
 دی رے یہاں جانے کو بھی اُس نے شام کو کہا تھا۔ مگر۔ اس وقت  
 ہی چلا جاتا تو کیا مریج تھا۔؟



اور مینٹوں ہی میں وہ اُن کے گیٹ پر تھا۔

چوکیدار نے مستعدی سے گیٹ کھولا۔ برآمدے کے آگے جیب روک کر وہ اُترا۔ بیل کی۔ کوئی جواب نہ پا کر ساتھ والا بٹن دبایا۔ بجلی نہیں تھی۔ گیلری کے دروازے پر ہلکی سی دستک کے ساتھ وہ اندر داخل ہو گیا۔ کزبین کی اتنی کچن میں تھیں۔ یا پھر کچھلی سائیڈ کی طرف۔ اُس نے بائیں طرف زکی کے بیڈروم کے دروازے پر دستک دی۔

”آجاؤ۔“ زکی کی کمزور سی آواز آئی۔ وہ اندر داخل ہو گیا۔

”آپ۔؟“ اُس نے حیرت سے دیکھا۔

”YES MAAM“۔ سر قدرے خم کرتے ہوئے وہ شرمیلے میں ہولا۔

وہ کچھ اُن اینری سی لگنے لگی۔

”میرا آنا تم کو اچھا نہیں لگا۔؟“ وہ پاس جا کھڑا ہوا۔

”نہیں تو۔ آپ بیٹھے۔“ وہ تکیے مسہری کی پشت سے لگانے لگی۔

”آئی کہاں ہے۔؟“

”بازار گئی ہوئی ہیں۔ ایک دور آئی تھیں۔ کسی ضروری کام سے لے گئیں۔“

”SEE I۔ اس لئے تم گھر آگئے۔“ وہ آرام سے اُس کے قریب مسہری

کی پیٹی پر بیٹھ گیا۔ ”ویسے گھر آؤ نہیں۔“ اُس کے ماتھے پر ہار کرتے ہوئے

وہ اپنا بیٹ سے ہولا۔ ”میں تم کو کچھ نہیں بولوں گا۔“

اور زکی بمشکل اپنا بوجھ اوپر کھیپتے ہوئے تیکوں سے پشت ٹسکا کر

اپنے ہاتھ کے ناخنوں کو تکتے لگی۔

یہ تو ابھی کچھ نہیں بولا تھا۔ بولتا تو پتہ نہیں کیا بولتا۔

وہ بے بہت بولڈ تھا۔ اور پھر پیار تو اُسے یوں آرام سے کر لیتا۔  
جیسے عین اُس کا جائز حق ہو۔ لیکن۔

وہ۔ بھی تو کچھ نہ بول پاتی۔ دم بخود سی رہ جاتی۔

"HOW DO YOU FEEL NOW" اُس کے خجل سے چہرے کو بغور  
دیکھتے ہوئے وہ دھیرے سے بولا۔

"ٹھیک ہوں۔" ناخن کو ہی تکتے ہوئے وہ بمشکل بول پاتی۔

شان نے اُٹھ کر اُس کے پاؤں سے لحاف سرکایا۔ پاؤں قدرے  
اوپر اٹھا کر دیکھا۔

"کل نیا ڈریسنگ ہو گا۔" شان دوبارہ اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔ "بخار  
تو نہیں ہوا تھا۔؟"

"ہوا تھا۔" سر جھپکائے وہ ہلے سے بولی۔

"ادہ لو۔ تم کتنا FRAGILE ہے۔" اُس کے چہرے پر جھپکے ہوئے  
اُس نے کئی پیار کر ڈالے۔ "گولی لیا تھا پھر؟"

اور کوئی جواب دئے بنا۔ زحیٰ نے چہرہ بازو سے دھک لیا۔

چند ثانیے وہ یوں ہی دل ہی دل میں اُس کے انداز سے محفوظ ہوتا رہا۔  
اُسے دیکھتا رہا۔

مختصر سے غرصہ میں وہ کس قدر بے تحاشہ چلنے لگا تھا اُسے۔



"زی۔ اُس نے اُس کے چہرے پر سے اُس کا بازو ہٹالیا۔  
 وہ چپ رہی۔ دراز پلکیں خوبصورت چہرے پر سایہ کئے تھیں۔  
 "ایک بات بتاؤں۔"  
 زی کی پلکیں اوپر اٹھیں۔

"میں تم کو بہت محبت کرتا ہوں۔ تم اندازہ نہیں کر سکتا۔ اس چھوٹے  
 سے وقت میں۔ ہم تم کو بہت...."  
 اور زین کو اُس کا معصوم لب و لہجہ بہت اچھا لگا۔ دلفریب  
 مسکراہٹ لئے وہ اُسے تنگ کرتی رہی۔

"ہم سچ تم سے لو کرنا ہے زین۔ کیا تم۔ بھی ہم کو اتنا ہی لو کرنا ہے  
 جتنا ہم۔ تم کو کرنا ہے۔؟" اُس کے بالوں کی لٹ سے کھینچنے لگا۔ اُس  
 نے اچانک سوال کر دیا۔

ایک پل کو تو زین گرہ بڑا گئی۔ مگر۔ پھر۔ سنبھل گئی۔  
 آنکھوں میں شرارت اُتر آئی۔ "نہیں۔"

"کیا۔؟" شان نے جیسے چونک کر اُسے دیکھا۔ "تم۔ ہم کو محبت نہیں کرتا ہے؟"  
 زین نے بمشکل اپنی مسکراہٹ پر قابو پایا۔  
 آنکھوں میں سنجیدگی بھرتے ہوئے نظریں جھکا لیں۔

"نہیں۔" اُس نے سر نفی میں ہلایا

"ادہ۔" اُس کا جیسے سارا رنگ کسی نے نچوڑ لیا۔ اُس کے بالوں میں

پھنسی اُس کی انگلیوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ "SORRY THEN"



زی نے چونک کر اُسے دیکھا۔

کتنا اُداس لگ رہا تھا وہ۔ وہ مذاق بھول بھال گئی۔

”اچھا۔ میں جاتا ہوں اب۔“ وہ اُٹھنے لگا۔

اوہ۔ اُس کا یہ تو مطلب نہیں تھا۔ کتنی جلدی تھا ہر جاتا تھا۔ وہ تو  
یہی بولی تھی اُسے تنگ کرنے کو۔ یہ تو مقصد نہیں تھا کہ وہ چلا جائے۔

”آئی آئے تو بتا دو کہ ہم آیا تھا۔“ وہ دروازے کی طرف بڑھتے  
ہوئے مزید بولا۔

زی اب بھی چپ چاپ اُسے دیکھ رہی تھی۔ روکنا چاہتی تھی اُسے۔  
مگر ایسا نہیں کر پارہی تھی۔ اور وہ۔ وہ تو جا رہا تھا۔  
پتہ نہیں۔ پھر آتا بھی یا نہیں؟ کیسی شکل میں پھنس گئی تھی وہ۔  
اُس کے بغیر رہ بھی نہیں سکتی تھی۔ مگر اُسے روک بھی تو نہیں  
سکتی تھی۔

کیسے کہتی۔ خود داری جو اُڑے آرہی تھی۔  
اور۔ مارے بے بسی کے اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔  
شان نے دروازے کے پاس پہنچ کر اُسے مڑ کر دیکھا۔  
جھٹ زی نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔  
وہ اپنی کمزوری بھی تو دکھانا نہیں چاہتی تھی۔  
شان واپس پلٹ آیا۔  
گھٹنے کے بل اُس کے سر ہانے۔ اُس کے قریب بیٹھا۔



”زی۔ جھکتے ہوئے اُس نے اُس کا ہاتھ ہٹایا۔“ زی۔ YOU

LOVE ME- YOU HAVE TO ADMIT IT- AND ONCE

YOU ADMIT YOU WOULD FEEL RELEXED, IT'S A FACT,

YOU CANT DENY IT AND.... AND I CANT HELP IT

TOO..... ”

شان دھیرے دھیرے بولتا گیا۔  
وہ اُس کے بے حد قریب تھا۔ اتنا کہ اس کی گرم گرم سانسیں اُس  
کی اپنی بے ترتیب سانسوں میں گھل رہی تھیں۔  
اور۔ پھر۔ اچانک ہی وہ۔

اُسے اپنی شہ رگ سے قریب تر محسوس ہوا۔

وہ اُس کا اپنا تھا۔ بالکل اپنا۔

غیر محسوس طریق پر اُس کے دونوں بازو بڑھے۔ اور شان کی گردن  
کے گرد حائل ہو گئے۔ ”شان۔“ اس کی مدھم سرگوشی ابھری۔

”MY DARLING MY LOVE“۔ مدہوش ہوتے ہوئے۔ اُن گنت

پیار کرنے کے دوران شان آہستہ آہستہ کہتا گیا۔ LOVE YOU

”I WOULDNT SURVIVE WITHOUT YOU“

نہم جاتے ہی اپنے با با جان سے بات کرے گا۔ تم میرا انتظار کرو.....  
بہت جلدی تم کو یہاں سے لے جائے گا۔

زرین اب واقعی پُرسکون لگ رہی تھی۔

نظریں جھکائے لیٹی تھی۔

کل کے سادے کے بعد سے بہت سا خون ضایع ہو جانے کی وجہ سے  
چہرہ سفید اور کمزور پڑ گیا تھا۔

شان اب بھی پاس بیٹھا تھا۔ مطمئن سرور سا۔

”شان۔ پانی پلینر۔“ زی نے اُس کی طرف نظریں اٹھائے آہستہ  
سے کہا۔ اور شان نے پاس کے بیڈ سائڈ ٹیبل سے جگ میں سے پانی  
گلاس میں ڈال دیا۔

”لو۔“ بازو سے سہارا دیتے ہوئے اُس نے گلاس اُس کے ہونٹوں  
سے لگا دیا۔

پانی پلا کر اُس کا سر دوبارہ آہستہ سے تکیوں سے ٹکاتے ہوئے  
اُس نے گلاس واپس ٹیبل پر رکھ دیا۔

”WHEN WILL YOUR MOTHER COME “

شان نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیوں۔ بلور ہو رہے ہیں۔؟“

”دل تو چاہتا ہے۔ اسی طرح بیٹھا ہے۔ مگر کیا کرے۔ بہتہ رانی

کیا سوچے گی۔“

”کچھ نہیں۔ یہی کہ آپ مجھے دیکھنے آئے تھے۔“

”انہی لوگ بہت ہوشیار ہوتا ہے۔ تم جیسا بیوقوف نہیں۔“ کہنی کے

بل اُس پر ٹھکتے ہوئے وہ خوب صورتی سے ہنستے ہوئے بولا۔

”میں۔ آپ کو بیوقوف نظر آتی ہوں۔“



"یکدم : انگلی سے اُس کی ناک پیارے سے چھوتے ہوئے اُس نے کہا۔  
"کیوں۔؟ اُس نے شان کی طرف دیکھا۔

"اب ایک آدمی کو تم LOVE کرتی ہو۔ اُس کو بھی معلوم ہے پھر بھی  
تم انکار کرتی ہو۔" وہ اُس کے چہرے پر انگلی سے لیکر بناتا ہوا ہنسا گیا۔  
"اور پھر روتا بھی ہے.... پاگل...." وہ جاندار ہنسی ہنسنے لگا۔  
"آپ پاگل ہیں۔"

"کیسا۔؟" وہ ہنسا۔

"ایسا۔" ذرین نے دونوں ہاتھوں سے اُس کے گھنے بال  
جھنجھوڑ دئے۔

"میرا شکل کیا بتا دیا ہے۔" اُس کی آنکھوں میں اپنا عکس ڈھونڈتے  
ہوئے اُس نے کہا۔ "تمہاری امی کو بتاؤں گا۔"  
"کیا۔؟ وہ چونکی۔

"کہ تم کو ہم سے پیار ہو گیا ہے۔" وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔  
"وہ کالوں کی لوڈوں تک سرخ ہو گئی۔

"اد۔ کے ڈیر۔ چلتا ہوں اب۔" وہ دروازے کی طرف  
بڑھا۔ "کل ملاقات ہو گا۔" ہاتھ ہلاتے ہوئے وہ دروازے  
سے باہر نکل گیا۔



فجر کی نماز کے بعد دونوں ہاتھ اٹھا کر اتنی نے بارگاہِ ایزدی میں  
 بی اور ناہر کی ڈھیر ساری عمر اور خوشیوں کی دعاؤں کے ساتھ ساتھ  
 اپنے لئے بھی اللہ تعالیٰ سے ان دونوں کی خوشیاں دیکھنے کی مہلت مانگی۔  
 پھر منہ ہی منہ میں آیتیں پڑھیں۔ رُخ پھیر کر ہنوز سوتی زرین پر  
 م کیا اور جائے نماز کا کونہ تہہ کرتے ہوئے تخت پر سے اتر آئیں۔  
 آہستہ قدم چلتیں دروازے سے باہر نکلیں۔ کچن میں آئیں۔ ادھر اپنے  
 لئے ایک پیالی چائے بنانے لگیں۔

نماز کے فوراً بعد وہ صبح ہی صبح ایک کپ چائے ضرور پیتیں۔  
 شام پھر بعد میں رُخ کے ساتھ کرتیں۔  
 کچن میں ہی ایک طرف انہوں نے دو کرسیاں اور ایک چھوٹی  
 سی میز رکھوائی تھی۔ وہیں وہ اور زرین مل کر کھانا کھایا کرتی کھتیں۔  
 چائے کیتلی سے پیالی میں انڈیل کر وہ وہیں کرسی پر بیٹھ گئیں۔



گھونٹ گھونٹ کر کے گرم گرم چائے حلق سے اتارنے لگیں۔  
 تو شان تصور میں ابھر آیا۔ نیک۔ محبت کرنے والا۔  
 مخلص لڑکا۔ کتنی خدمت کر دیا تھا۔ ان لوگوں کی۔  
 ابھی اُس کو یہ معلوم نہ تھا۔ کہ ان لوگوں کا اُس کے ساتھ رشتہ  
 بھی ہے۔ معلوم ہوا تو پہ نہیں کیا ردِ عمل ہو گا۔؟  
 اونچے لوگوں کی اونچی شان۔ پھر شاید دھڑکا رنج بھی نہ کرے۔  
 یکا یک۔ اُن کا دل دھڑک سا اٹھا  
 زی اُس کا ذکر کتنے چاؤ سے کرنے لگی تھی۔ کہیں... کہیں...  
 خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے انہوں نے یہ سوچ ہی ذہن  
 سے جھٹک دی۔

واپس کمرے میں آئیں۔

زمین کی آنکھیں اب بھی بند تھیں۔ کتنی کمزور ہو گئی تھی۔ دو ہی  
 دن ہیں۔ مگر کل شام سے بخار دوبارہ نہیں چڑھا تھا۔ آج اُس کی  
 ڈرلنگ ہوئی تھی۔ پانچویں دن ٹانگے کھلنے تھے۔ بیٹھے بٹھائے  
 بے چاری کو مصیبت نے آلیا تھا۔

اپنے بستر کے اوپر سے کبل سٹپتے ہوئے وہ دوبارہ تخت پر آئیں۔  
 اور کبل اپنے ارد گرد لپیٹ کر حسبِ معمول تسبیح کے دانے بھرنے لگیں۔  
 سارے ساتھ ساتھ زی کی آنکھ کھل گئی  
 ”صبح بخیر راتی۔“ زی بولی

”صبح بخیر بیٹے۔“ تسبیح کے آخری دانے پھیرتے ہوئے اُسے ایک طرف رکھ کر اُنہوں نے شفقت سے جواب دیا۔

”اُمّی ہاتھ روم جاؤں گی۔“ اور اُمّی اُٹھ کر پاس آگئیں  
زی نے بستر میں بیٹھ کر پاؤں نیچے لٹکائے۔ مگر ابھی وہ اس  
قابل نہ تھی کہ بغیر سہارے کے چل پھر سکتی۔

اُمّی نے بازو اُس کی کمر میں حائل کیا اور سہارا دیتے ہوئے  
ہاتھ روم لے جانے لگیں۔

مُنہ ہاتھ دھو کر وہ فارغ ہوئی تو اُمّی دوبارہ اُسے آئیں تکیوں  
کے سہارے اُس کی پشت لٹکائے ہوئے کبل اور صفا دیئے۔

”میں ناشتہ بنا کر لاتی ہوں۔“ اُمّی کچن چل دیں۔  
اور۔ زی سوچوں میں گم ہو گئی۔

کبھی کسی خوش آئند خیال کے تحت اُس کی آنکھیں جگمگا اٹھتیں۔  
اور کبھی وہی جگمگا بہت مسرور ہو جاتی۔ اُس کی جگہ تارک سائے  
پہرانے لگتے۔ تھک کر اُس نے آنکھیں موند لیں۔

سر مسہری کی پشت سے ٹکا دیا۔

”زی بیٹے۔“ ناشتہ کے بعد تیار ہو جاؤ۔ ذیشان ڈریسنگ  
کرنے لے جائے گا نا۔“ اُمّی نے ناشتہ کی ٹرے اُس کے بستر کے  
پاس میز پر رکھ دی۔

”اچھا اُمّی۔ ابھی تو وقت ہے۔“ اُس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔



توبہ میں پندرہ منٹ باقی تھے۔

”دس بجے آنے کو کہا تھا اُس نے۔ آج اُس کی داپھی بھی تو ہے۔“

”ایک گھنٹہ پورا ہے ابھی۔“ زرین نے تو س پر مکھن لگاتے ہوئے کہا۔  
”سوچتی ہوں۔ آج دوپہر کو اُس کو کھانے پر یہیں روک لوں۔  
بُرا ملتا ہے عین کھانے کے وقت چلا جاتا ہے۔“ اتنی نے کچھ  
سوچتے ہوئے کہا۔

”جیسا آپ بہتر سمجھیں اتنی۔“ جیم دگا کر چھری اُس نے واپس  
پلیٹ میں رکھ دی۔

”کرتی ہوں آج کچھ۔ قیمہ رکھا ہوا ہے کچھ گوشت بھی ہے۔ اُس کا  
روسٹ بنا لوں گی۔ قیمہ کے کوفتے بنا لوں گی۔ بھوڑے سے چاول بنا  
لوں گی۔ فاروق مرغی لے آئے گا۔ اللہ الذی خیر صلا۔“  
”آپ کو زحمت ہوگی اتنی۔ اکیلے کیے اتنا کام کریں گی۔“  
”کوئی اتنا کام نہیں ہے بیٹے۔ ہماری قسمت میں یہاں کہاں۔  
اور کام کہاں تھے؟“

”آپ خوش ہوتی ہیں اتنی تو ضرور کریں۔“ ردھہ کے گلاس میں  
اوڈو لیٹن ڈال کر چمچ چلاتے ہوئے وہ بولی۔

”سوچتی ہوں اُس کو پتہ چلے گا۔ کہ ہم کون ہیں۔ تو کیا ردعمل ہوگا۔ اُس کا۔  
چلے گا گھونٹ بھرتے ہوئے اتنی جیسے خود سے بولیں۔“

”زیادہ سوچیں ہی نہیں اتنی۔“



ماں کو متفکر وہ کبھی نہ دیکھ سکی تھی۔ آگے ہی کیا کم رکھا اٹھائے  
تھے کہ اب بھی سوچتی ہی رہتیں۔

”ویسے ہی خیال آجاتا ہے کبھی کبھی۔ پھر شاید ہم اسنے اچھے نہ  
لگیں اُسے۔؟“

”خود ہی آتا ہے۔ ہم نے نہیں بُلا یا۔ اچھے نہیں لگیں تو نہ سہی۔  
آن پھر آڑے آگئی۔“

”نہیں بیٹے ایسا نہیں کہتے۔“ اتنی مسکرا کر بولیں۔ لواب اندھا کھالو۔  
انہوں نے اندھے کی پلیٹ اُس کی طرف بڑھا دی۔

”امی۔ جیم ٹوسٹ کھا لیا ہے۔ اب پیٹ میں جگہ نہیں رہی۔  
”نہیں۔ اس کا بھی سینڈویچ بنا دیتی ہوں۔ کھانا ہوگا۔ آگے  
مکرور ہو رہی ہو۔“

”اچھا۔ سینڈویچ نہیں بنائیں۔ صرف ایک ٹوسٹ کے اوپر رکھ دیں  
ادراچی نے چھری سے اندھا۔ مکھن لگے ٹوسٹ پر رکھ دیا۔  
”لو۔ پلیٹ میں رکھ کر اُس کی طرف بڑھایا۔“ پھر دودھ پی لو۔  
میں کپڑے لاتی ہوں۔ یہیں بدل لو۔ کھڑے ہو کر بدلنا مشکل ہوگا۔  
”نہیں۔ امی۔ ڈرینگ روم تک لے جائیں۔ وہیں کر لوں گی۔  
سب۔“ اُس نے کہا۔

”کھٹیک ہے۔ میں نے تو تمہاری آسانی کے لئے کہا تھا۔“ اتنی باقی  
کے برتن ٹرے میں رکھ کر کچن چل دیں۔



ڈارک بلورنگ پر سفید چھوٹے چھوٹے پھولوں والی پرنسڈ قمیض  
 شلوار پہن کر اُس نے سفید سوائیٹر پہنا۔ لمبے خوبصورت بالوں کی ڈھیلی سی  
 چوٹی بنائی۔ شفون کا ڈارک بلود وپٹہ کندھوں پر ڈالا۔ اور اپنے پسندیدہ  
 کلون کی اسپرے کپڑوں پر کرتے ہوئے دیوار کا سہارا لیتی بمشکل کمرے  
 تک آ کر کھڑکی کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

شان مقررہ وقت پر پہنچا۔  
 کمرے میں داخل ہوا تو زری کو دیکھا۔  
 تو ایک لمحے کو اُسے احساس ہوا۔ اُس کا انتخاب کتنا حسین  
 تھا۔ کتنا مکمل تھا۔

ڈریسنگ کروانے کے بعد وہ اُسے اپنے بازو کا سہارا دیتا۔  
 جیب تک لایا۔ بٹھایا اور خود گھوم کر اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔  
 ”تم بہت اچھا لگ رہی ہو۔“ اُس نے بھرپور نظر اُس کے خوب  
 صورت سراپے پر ڈال کر کہا۔  
 ”شکریہ۔“ وہ اُس کے لب و لہجہ پر بمشکل منہی روک سکی۔  
 ”شام کو میں واپس جاتا ہوں۔“ قدرے توقف کے بعد  
 اُس نے کہا۔

زری کو معلوم تھا کہ اُس نے جانا تھا۔ اس کے باوجود وہ  
 اُداس نظر آنے لگی۔ ”پھر کب آئیں گے۔“

"اب تو جلدی آئے گا۔ جان جو ادھر ہے۔ خالی BODY کو لے جا کر ساتھ کیا کرے گا۔" وہ اٹک اٹک کر معصومیت سے بولا۔

اور زی نہ چاہتے ہوئے بھی دھیرے سے ہنس دی۔

"REALLY MAAM۔ تمہارا زبان بہت مشکل ہے۔ گزرا

کیسا ہو گا۔؟" وہ خود بھی خوش گواری سے ہنس دیا۔

"آپ مجھے پشتو سکھا دیں۔"

"THATS IT" وہ خوش ہو کر بولا۔ "بولو۔ ذہ تا سرہ مینہ کوم۔"

"ذہ تا سرہ مینہ کوم۔" زی نے دہرایا۔ "اس کا کیا مطلب ہے۔؟"

"I LOVE YOU" شان نے کہا۔

"اوہ۔" زی جڑبڑہاتے ہوئے بلس ہو کر رہ گئی۔

رُخ پھیر کر کھڑکی کی طرف کرنے لگی تو اُسے محسوس ہوا۔ اُس کی چوٹی کے بال پیچھے گردن کے اوپر لگے قمیض کی زپ کے ٹک میں پھنس گئے تھے۔

وہ دوبارہ سیدھی ہو کر بال نکالنے کی کوشش کرنے لگی۔

"کیا ہوا۔؟" اُسے پریشان دیکھ کر اُس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ یہ بال..... وہ اب بھی انہیں پھڑانے کی کوشش میں لگی تھی۔

"لاؤ۔ میں نکال دوں۔" اور پھر تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ اُس

کے بال ننھے سے ٹک میں سے چھڑانے میں کامیاب ہو گیا۔

"شکریہ۔" اُس نے کہا۔



"WELCOME" وہ خوبصورتی سے مسکرایا: "تم کو معلوم ہے۔"

بہت کام چور ہے۔ گاڑی دوبارہ چلاتے ہوئے اُس نے کہا۔

"شکل سے لگ رہا ہے۔" وہ شرارت سے بولی۔

"BELIEVE ME" ہم کو یا با جان نے نوکروں کے حوالے کر کے باہر

بے کار کر دیا ہے۔ دلنشینی مسکراہٹ لبوں پر لئے وہ بتانے لگا: "یہ تو میرا

ہمارا خاطر اتنا کام کرتا ہوں۔ ورنہ....."

"بہت اونچی شان ہے۔"

"شان ہے نا؟ وہ خوش ہو کر بولا۔

"کوئی شان نہیں ہیں سیدھا سیدھا ذیشان کہیں۔"

"وہ تو تم کہے گی اپنے کو؟" شیر نظر دلتے اُسے گھورتے ہوئے

شان خوبصورتی سے بولا۔

ادربات کی ہتھ تک پہنچ کر زی کی پلکیں گرنے لگیں۔

شان نے ایک نظر اُس کو دیکھا۔ اور پھر اپنا ہیئت سے اُس کا سر

اپنے پہلو سے لگا لیا: "شان کا سارا شان ختم ہو گیا ہے LOVE" اُس کے

ماں تھکے بہت سیار کرتے ہوئے وہ گہمیر لہجہ میں بولا۔ تم کو پتا کر اب وہ سارا

کچھ بھول گیا ہے۔"

واقعی آسان ٹھک آیا تھا۔ زی نے سوچا۔

زی کو سہارا دیتے ہوئے بیڈ روم تک سنے جا کر اُس نے کسی پر بھٹا

انجی فاروق کی مدد سے کچن میں اُس کے لئے کھانا تیار کر رہی تھیں



شان نے بھی زیادہ روکا۔ پتہ نہیں کیا بات تھی۔

وہ نادانستہ طور پر پہلے سے بہت بدل گیا تھا۔

کہاں کہ اُس کے لئے اُس کی مخصوص ڈشیں تیار ہوں۔ مخصوص

وقت و مخصوص جگہ اور مخصوص انداز میں سرو ہوں۔ اور کہاں کہ کچھ بھی۔

کسی بھی وقت۔ کہیں بھی۔ اور کسی طور بھی پیش کی جائیں۔

اُسے زلی کے یہاں آکر انجانی خوشی محسوس ہوتی تھی۔ چند گھنٹوں کو

جیسے وہ ہر قید و بند سے آزاد ہو جاتا تھا۔

"ڈرائیڈ کو بہر حال ساتھ رکھا کرو۔ ناظم اور کریم کو اپنی ڈیوٹی پوری

کرنے دو۔ اُن کو شکایت ہے کہ کچھ عرصہ سے تم ان کی پوری مدد نہیں دے

رہے۔" پچھلے دنوں بابا جان سے ملاقات ہوئی تھی۔ تو وہ بارغیب مگر

پُر خفقت لہجے میں بولے تھے۔ "KEEP UP YOUR OWN WAYS

SON" وہ دھیرے سے مکرادیا۔

پھر زلی کے پاس بیٹھ کر ڈھیر ساری باتیں کیں۔

ڈھیر سارا پیار کیا۔ اور پھر۔

اُس کی مخصوص ڈشیں نہ سہی۔ مخصوص وقت نہ سہی۔ مخصوص جگہ نہ

سہی اور مخصوص انداز نہ سہی۔ اُس نے معمول سے کہیں زیادہ پیٹ بھر کر کھایا۔

اُس کے کھانے میں زیادہ چکنائی نہ ہو۔ سٹارچ والی چیز نہ ہو۔

زیادہ تر اُبلے کھانے ہوں۔ یہ سب اب بھی بابا جان موقع ملنے پر خود کچن

جا کر چیک کرتے۔



”ثقیل چیزیں مدت کھایا کرو۔ ضرورت سے زیادہ بالکل نہیں کھانا  
.....“ وہ مزید مسکرا دیا

آج اُس نے یہ پابندی بھی توڑ دی تھی۔

”اور کے آنٹی۔ تھینک یو ویری لمچ۔ بہت مزیدار کھانا تھا۔“  
وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”جاری ہو بیٹا۔“

”ہاں آنٹی۔ میرا ضروری کام رکتا ہے اگر میں نہیں جاتا ہے۔ ورنہ  
میں زرین کا ٹانگا کٹوا کر جاتا ڈاکٹر سے۔“

”نہیں بیٹا۔ تم نے بہت کیا ہے۔ خدا تمہیں زندگی دے۔“

”ہم ٹیلی فون کرے گا NEIGHBOURS میں۔ زرین کا حالت  
معلوم کرنے کے واسطے۔“

”شکریہ بیٹے۔ خدا خوش رکھے۔“

”اچھا آنٹی۔ بہت شکریہ اتنا اچھا لچ کا۔“ ٹاپک بار اور شکریہ۔  
ادا کرتے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

”او کے زرین TAKE CARE“ وہ زرین سے مخاطب ہوا۔  
”بائے۔“

”بائے۔“ زین نے بھی کہا۔

اور بڑے بڑے قدم اٹھاتا شان کو ریڈور سے باہر نکل گیا۔

پہاڑ پر آئے آج اُسے تیسرا دن تھا۔  
 کنٹرکشن کا کام زور شور سے جاری تھا۔  
 تین سو بستروں کا سہ منزلہ ہوسپٹل۔ آپریشن تھیٹر۔ آفیسرز۔  
 اسٹاف کے لئے بیسٹل۔ لوڈ اسٹاف کے لئے کوارٹرز۔ سرونٹ کوارٹرز۔  
 لمبا چوڑا کام زوروں پر تھا۔ اُسے سر پیر کا ہوش نہیں تھا۔  
 صبح سے شام ہو جاتی تھی۔ پتہ بھی نہیں چلتا تھا۔  
 ہوش تھا تو بس اتنا۔

کہ زی کی بات یا بابا جان سے کیے ہو؟  
 کونسا طریقہ زیادہ بہتر تھا۔ بالواسطہ؟ بلاواسطہ؟.....؟  
 براہ راست۔ اُس کا دل کہتا تھا۔ بابا جان نہیں مانیں گے۔ پھر؟  
 کیا وہ ٹکڑے سکتا تھا۔ بابا جان سے؟ جو صرف اصول جانتے تھے۔  
 دل کے تقاضے؟ ہو نہ۔ اُس نے تلخی سے سوچا۔ بابا جان کیا جانتیں۔



اس سے قبل۔ وہ بھی تو اس "تقاضے" کو بیوقوفی کہتا تھا۔  
 پاگل پن تصور کرتا تھا۔

اب۔ اپنے اوپر آئی۔ تو یکساں بے بس ہو گیا تھا۔  
 سوچ سوچ کر وہ ہار گیا تھا۔

اُس نے سین اور پیڈ اٹھا یا۔ اور ناصر کے آگے دل کھول کر رکھ دیا

"I LOVE HER, I CANT EVEN THINK OF LEAVING HER,  
 YOU HAVE TO CONVINCE GABA JAN....."

چھ روز مزید گزارنے انتظار میں کہ ناصر کیا جواب دیتا ہے۔

مگر پھر نہ رہا گیا۔ یہ اُس کی زندگی کا سوال تھا۔

موت نہ جاتا اُس کے بغیر۔ مگر۔ زندہ لاش ضرور بن جاتا۔

اور۔ ایسی زندگی؟ زندگی تو نہ ہوئی نا۔

وہ کام چھوڑ چھاڑ۔ گاؤں چلا آیا۔ بابا جان وہیں تھے۔ اُس کی

بے وقت اور بغیر اطلاع آمد پر چونکے بھی۔

شام کی چائے پر اُن سے ملاقات ہوئی۔ مگر جانے کیوں؟

اتنی جلدی اچانک وہ حرفِ مدعا زبان پر نہ لاسکا۔

چند سرسری باتیں ہوئیں۔ وہی کچھ اس کی صحت سے متعلق۔ کچھ

کام سے متعلق۔ اور پھر۔ اُس نے ماما پر دھوا دابول دیا۔

"ماما۔ ہم نے لڑکی پسند کر لیا ہے۔" وہ بلا ہتھید بولا۔

"مہد قے جاؤں۔ کیسی ہے۔؟" ماما خوش ہو کر بولیں۔



"کیسا کو چھوڑیں۔ بابا جان کو راضی کریں" وہ مطلب آسم ہوئے بولا۔  
 "کون ہیں۔ کہاں کے ہیں رہنے والے۔" ماما کو بابا جان کے نکلوں کا  
 تہہ تھا۔ انہی کے انداز میں بات کو تولتے ہوئے بولیں۔  
 یہی سب کچھ تو جا کر بڑے صاحب سے کہنا تھا۔

"آپ بھی بابا جان جیسا بات کرتا ہے۔ کون ہے؟ کہاں کا رہنے والا  
 ہے؟ کیا صرف لڑکی کافی نہیں ہے۔ اُس کا خود کوئی شناخت نہیں  
 ہے۔" وہ تیز ہوتے ہوئے بولا۔

"بیٹا میرے لئے تو صرف لڑکی بھی کافی ہے۔ جہاں تم خوش۔ وہاں میں  
 خوش۔ مگر بڑے صاحب کا ہمتیں پتہ ہے۔۔۔۔۔"  
 "کیا بابا جان ایسا نہیں کہہ سکتا۔ جہاں ہم خوش۔ وہاں وہ خوش۔۔۔۔۔"  
 اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

"وہ بھی جو کرتے ہیں۔ ہمارے بھلے کے لئے کرتے ہیں بیٹا۔ تم کچھ تو بتاؤ۔  
 اس کے متعلق۔ میں پوری کوشش کروں گی۔ بڑے صاحب کو راضی کرنے کی۔"  
 "بس وہ اچھا شریف لوگ ہے۔ ایک ماں ہے۔ ایک بیٹی ہے بس۔ اور  
 کوئی نہیں ہے۔ باپ مر چکا ہے۔ اور۔ اور میر نہیں ہے۔۔۔۔۔"  
 اور۔ ماما کو۔ زرین کے گھرنے کی یہ تصویر کم از کم بڑے صاحب  
 کے لئے بہت نا کافی معلوم ہوئی۔

اور تبھی۔ وہ سمجھ گئی شان اتنا فکر مند کیوں تھا۔  
 ماما کو اُس پر ترس آگیا۔ ایک آہ بھری۔ "بیٹا ابھی سے دل چھوٹا



نہ کر د۔ انہوں نے شفقت سے شان کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے تسلی دی۔ گو  
اکھیں پورا یقین تھا۔ وہ یا شان اس معاملے میں کچھ نہ کر سکیں گے۔ میں  
بڑے صاحب سے بات کروں گی۔

اور شان مایوس سا وہاں سے اٹھ آیا۔

"بابا جان۔ آپ سونے جا رہا ہے۔؟" رات کے کھانے کی میز سے بابا  
جان اٹھنے لگے۔ تو اُس نے مودب لہجے میں کہا۔

"NO, NOT STRAIGHT AWAY۔ کیوں۔؟" وہ رک گئے۔

"ایک بات کرنا تھا۔ آپ سے۔"

"SURE۔ کھانے کے بعد آ جاؤ۔ ہم نے بھی ایک بات کرنی ہے تم سے۔"  
بات کرتے کرتے اُن کے لب دھیمے سے بستم ہو گئے۔ ایک نظر غور سے اُسے  
دیکھا۔ اور جانے کے لئے قدم بڑھا دیئے۔

اُس نے پڈنگ کا آخری تچ لیا اور نیپکن سے ہاتھ لہچھ لہچھ لئے۔  
ناظم نے آگے بڑھ کر بھاری سی کرسی پیچھے کھسکائی۔ اور شان  
اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ سوچتے ہوئے۔

امید و بیم کی حالت میں۔

اُس نے بابا جان کے بیڈ روم کے دروازے پر ہولے سے

دستک دی۔

"COME IN"۔ اُن کی بھاری۔ بارعب آواز آئی۔



اور شان کو۔ اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا۔

اُس نے آہستہ سے بھاری دروازہ داکیا۔

اندر داخل ہوا۔ اور پھر دروازہ برابر کر دیا دوبارہ سے۔

بابا جان اپنے شاندار بیڈ پر تکیوں کے سہارے لیٹے کسی کتاب

کی اسٹیڈی میں مصروف تھے۔ وہ آہستہ قدم آگے بڑھا۔

بابا جان نے کتاب ایک طرف رکھ دی۔ چشمہ اتار کر بیڈ سائیڈ

بلیٹ پر رکھا۔

"آؤ۔ بیٹھو۔ انہوں نے قریبی صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

شان مودب طریق سے بیٹھ گیا۔

"تم کچھ پریشان لگتے ہو۔ ہو گا کوئی کاروباری پروبلم۔ قبل اس کے کہ

تم اپنی بات بتا کر ہمیں بھی پریشان کرو۔ ہم تمہیں ایک اچھی خبر سناتے

ہیں۔" بابا جان اس وقت بڑے موڈ میں لگے رہے تھے۔ ایسی طمانیت

اس نے کم ہی اُن کے چہرے پر دکھی تھی۔ دھیرے دھیرے مسکرا بھی رہے

تھے۔ "ہم نے تمہارے لئے ایک بہت خوبصورت، بہت اچھی

لڑکی پسند کر لی ہے۔" اور شان کا۔

تھوڑی دیر قبل بیٹھتا محسوس ہوتا دل جیسے بیٹھ ہی گیا۔

"تمہیں معلوم ہے۔ ہم ایک عرصہ سے اسی کوشش میں لگے ہوئے

تھے۔ کبھی لڑکی اچھی ہوتی تو گھرانہ اچھا نہ ہوتا۔ کبھی گھرانہ اچھا ہوتا تو

لڑکی ہمارے معیار پر پوری نہ اُترتی۔ اب تو بس خدا نے جیسے بیٹھے بچائے



آرزو پوری کر دی۔ جیسے ہم چاہتے تھے ویسی ہی ہے۔  
 وہ دم لینے کو رُکے۔ ایک نظر شان پر ڈالی۔ سکرائے۔  
 "تم دیکھو گے تو داد دو گے۔ اپنے بابا جان کی پسند کی۔ وہ واقعی  
 اسے داد طلب نظروں سے دیکھنے لگے۔

شان نے نظریں اٹھا کر اُٹھیں دیکھا۔  
 "اب تم بتاؤ۔ کیا بات کہنی تھی۔ تم نے؟"  
 "کیا خوب۔ دل نے پھڑپھڑا کر کہا۔  
 "کچھ نہیں۔" وہ جلدی سے بولا۔  
 "تم کچھ کہنا چاہتے تھے نا ہم سے۔؟"  
 "بھول گیا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔  
 "تم تھکے ہوئے لگتے ہو۔ جاؤ آرام کرو۔ انہوں نے دوبارہ  
 ماب اُٹھالی۔

آرام۔؟ اُس کے لبوں پر تلخ تبسم ابھر آیا۔  
 "گڈ ٹائٹ۔ بابا جان۔!"  
 "گڈ ٹائٹ۔" ایک نظر اُسے جاتا دیکھنے کے بعد اٹھولنے کہا۔

رات۔ کریم بابا دودھ کا گلاس لئے اندر داخل ہوئے۔ تو  
شان کو بے قراری سے ہٹلتے پایا۔

بے چین آنکھیں۔ پریشان چہرہ۔ ہاتھ پیچھے کی طرف باندھے۔  
یہاں سے وہاں ہٹلتے۔ اُسے جیسے کریم بابا کے اندر آنے کا پتہ  
ہی نہیں چلا۔

کریم بابا کی بوڑھی تجربہ کار آنکھیں۔ شان میں بہت دنوں  
سے تغیر محسوس کر رہی تھیں۔

اور پھر۔ اس وقت یہ حالت۔ کریم بابا کا ماتھا ٹھنکا۔  
کوئی تو ایسی بات تھی۔

جو اُسے یوں بے قرار کئے ہوئے تھی۔

”چھوٹے صاحب! یہ دودھ پی لیجئے۔ ٹھنڈا ہو جائے گا۔“

چونک کر وہ رُک گیا۔ بابا کو دیکھا۔



”ماما کو بھیج دیں۔ بابا۔“

”اچھا صاحب! انہوں نے کہا۔

اور وہ اُلٹے قدموں واپس چلے گئے۔

اس وقت اُس سے مزید بات کرنے کی وہ اپنے میں ہمت

نہیں پا رہے تھے۔

شان صوفے پر جیسے گر پڑا۔

چند لمحے بے قراری سے سر صوفے کی پشت پر ادھر سے

ادھر ڈالتا رہا۔

پھر کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے ہوئے سر دونوں ہاتھوں

میں تھام لیا۔

”شان بیٹے! کیا بات ہے۔؟“ ماما پریشان سی اندر

داخل ہو گئیں۔

وہیں ہاتھوں میں سر تھامے اُس نے بے چین نظریں اٹھا کر

ماما کو دیکھا۔

”ماما صدقے جائے کیا ہوا۔؟“ ماما نے پاس آتے ہوئے اُس کا سر

اپنے پہلو سے لٹکالیا۔ ”بڑے صاحب نے انکار کر دیا۔

وہ چیپ چاپ اب بھی ماما کو گھورے جا رہا تھا۔

”مجھے معلوم تھا۔ بیٹے۔ بڑے صاحب اس لڑکی کو کبھی قبول

نہیں کریں گے۔ نیچے شاندار حویلی۔ نہ گھاؤں۔ نہ کھاڑیاں۔ نہ نوکر چاکر اور



پھر آج کل کی لڑکیاں اکھیں کب پسند آتی ہیں۔

”ماما۔“ اُس نے کرب سے سر ہلایا۔ ”ایسا بات نہیں ہے۔ میں نے تو ابھی اُن کو بتایا بھی نہیں۔“

”پھر کیا بات ہے۔؟“ ماما کا دل دھک سے رہ گیا۔  
کیا بات ہو سکتی تھی؟ وہ اُس قدر پریشان کیوں تھا۔؟ اُسے کیوں بُنا یا تھا۔؟

”بابا جان نے ہمارے لئے لڑکی ڈھونڈ لیا ہے۔“  
”لڑکی ڈھونڈ لی ہے۔؟“ وہ حیرانگی سے کہنے لگیں۔ پھر رُک سی گئیں۔  
”تو تم اپنی پسند کا بھی اظہار کر دیتے۔؟“  
”میں نہیں کر سکا۔ نہیں کر سکوں گا۔“ اُس نے بے قراری سے سر صوفے کی پشت پر ڈال دیا۔

”بات پکی کر لی ہے کیا۔؟“  
”کیا مطلب۔؟“ وہ عورتوں کی باتیں زیادہ نہ جانتا تھا۔  
”میرا مطلب ہے۔ لڑکی دانوں سے لڑکی کو مانگ لیا ہے؟ انھوں نے منظور کر لیا ہے۔؟“

”مجھ کو کچھ نہیں معلوم۔ مگر آپ کو بابا جان کا عادت معلوم ہے۔ وہ جو ارادہ کرتا ہے۔ پورا کرتا ہے۔“

”تم ذکر تو کر د اُس لڑکی کا جو تمہیں پسند ہے۔“ ماما نے تسکے کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔



”فائدہ۔“ اُس نے پوچھا۔

”آخر تم اُن کی اولاد ہو۔ اچھی عقل والی عمر ہے۔ شاید وہ سوچ لیں کچھ۔“

”مجھ کو کوئی امید نہیں ہے۔“ مایوسی کہتے ہوئے اُس نے سر دوبارہ ہاتھوں میں تھام لیا۔

”نہیں بیٹا۔ مایوسی گناہ ہے۔ میں بات کروں گی۔ بڑے صاحب سے۔“ اُکھوں نے اُس کا سر سہلاتے ہوئے اُسے تسلی دی۔

”اُن کا بات پتھر کی لکیر ہوتا ہے۔“

”میں بھی بات کروں گی۔ ناصر بیٹے کو بھی خط ڈلواتی ہوں۔ وہ بھی آکر صاحب کو سمجھائیں گے۔ مگر تم خود بھی بات کرنا۔ شان کچھ سوچ میں پڑ گیا۔“

ناصر کو تو وہ پہلے ہی لکھ چکا تھا۔ مگر ابھی تک ظاہر ہے۔ اُس نے بابا جان سے کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ اس معاملے میں۔ اور اب۔ اب تو ناصر کچھ کہتا بھی تو بے کار تھا۔ جانے کیوں اُسے سچا یقین تھا۔

”اس طرح اپنی جان ہلکان مت کر دے پہلے بات کر کے تو دیکھو۔“ ماما کی نظر میز پر رکھے دودھ کے گلاس پر پڑی۔ دودھ پڑے پڑے ٹھنڈا ہو گیا ہو گا۔“ آگے بڑھ کر اُکھوں نے گلاس کو ہاتھ لگایا۔ ابھی بھی پینے کے قابل تھا۔ مگر شان بہت گرم دودھ پیتا تھا۔

گرم کر لاؤں۔؟“ ماملے نے کہا۔

”نہیں بیویوں کا ماما۔ طبیعت نہیں چاہتا۔“ اُس نے سرانکار میں ہلا دیا۔

”پی لو بیٹا۔“ وہ گلاس قریب آئیں۔ ”کہو تو گرم کر دوں۔؟“  
 ”اچھا ٹھیک ہے۔ ایسا ہی دے دیں۔“ اُس نے گلاس تھام لیا۔  
 اور پھر۔ آنکھیں بند کر کے غٹا غٹ پی گیا۔ جیسے وہ کوئی  
 بد ذائقہ دوا ہو۔

”اب سو جاؤ بیٹا۔ میں کل بڑے صاحب سے بات کروں گی۔“  
 اور شان نے۔ ایک گہری سانس لی۔  
 پھر اٹھ کر باتھ روم چلا گیا۔ ماما وہیں رہیں۔  
 باتھ روم سے واپس آنے کے بعد وہ تھکا۔ مضمحل سا بستر میں  
 لیٹ گیا۔

”لائٹ آف کر دیں ماما۔“

اور۔ ماملے نے جی بچھا دی۔

”شب بخیر۔ ماما۔“ اُس نے تھکے سے لہجے میں کہا۔

”شب بخیر بیٹا۔“ ماما نے جواب میں کہا۔ اور

ماما اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے کچھ سوچتی ہوئیں۔  
 کوری ڈور میں نکل آئیں۔

ساری رات اُسے نیند ہی نہ آئی۔



کبھی اس کو دٹا۔ کبھی اُس کو روٹا۔

سوچ سوچ کر ذہن جواب دینے لگا تھا۔

• ٹن... ٹن... ٹن... ٹن... ٹن... اُس کی آنکھ کھل گئی۔

بڑے سے کو ریڈور کے آخری سرے پر لگے کلاکس نے پانچ

بجائے تھے۔

صبح کے قریب کہیں شاید اُس کی آنکھ لگی تھی۔

اور۔ آنکھ کھلتے ہی پہلا خیال اُسے پھر وہی آیا۔

کیبل پرے ہٹا کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

باتھ روم گیا۔ نیم گرم پانی سے نہایا۔

تیار ہوا۔ ناشتہ کیا۔

اور سوچوں کی ادھیڑ بن میں۔ چل پڑا۔

وہ ابھی ابھی کوکھی پر پہنچا تھا۔ تمکا تمکا۔ مفتحل سا۔  
 جسمانی طور سے کہیں زیادہ ذہنی طور پر۔  
 پہلے وہ سیدھا سائٹ پر چلا گیا تھا۔ کام دیکھا تھا۔ گھنٹہ بھر  
 وہاں رہا تھا۔ اور اب یہاں آ گیا تھا۔  
 ڈرائنگ روم میں بیٹھا ابھی کافی کا دوسرا گھونٹ ہی لیا  
 تھا۔ کہ ناظم ڈاکے کر آ گیا۔  
 ”آپ کی ڈاک ہے صاحب۔“ اُس نے ڈاک کی ٹرے اُس کے  
 سامنے میز پر رکھ دی۔  
 ”ٹھیک ہے جاؤ۔“ اُس نے کہا۔  
 کئی خطوط تھے۔ کاروباری و غیر کاروباری۔  
 ناصر کا بھی تھا۔ اُس نے فوراً اٹھالیا۔  
 ”..... چند ایک کام ہیں۔ ختم ہوں گے تو ماموں جان سے بات



کروں گا۔ ہمارے بارے میں ....“

ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد خط کے آخر میں ناصر نے اُس کی بات کالیوں ذکر کیا تھا۔ جیسے اُس کی بات کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔ اُسے غصہ آگیا۔

اُس نے کتاب بے قرار ہو کر، بے چین ہو کر بے بس ہو کر اُس کا سہارا لیا تھا۔ اور یہ جواب دیا تھا اُس نے۔

”ہو ہنہ۔“ وہ بڑبڑایا۔ خط ایک طرف پرے ڈال دیا۔ ”کسی میں بھی ہمت نہیں ہے۔ میں خود کروں گا بات۔“

کوئی پی کر اُس نے باقی کے خطوط بھی دیکھ ڈالے۔

بیڈ روم گیا۔ چند ضروری ٹیلی فون کا لڑکے۔

پھر اپنے آفس گیا۔ اور دیر تک لپٹ پی اے سے مختلف نوعیت کے خطوط ٹائپ کرواتا رہا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد اُس نے تھوڑا آرام کیا۔ اور دوبارہ سائیکل پر چلا گیا۔

شام گھر کا ہو چلی تو کوٹھی پر واپس آگیا۔

بالکونی میں آرام چیر پر بیٹھا۔ نواحی بستی کی جلتی بتیاں دیکھتا رہا۔ کچے پکے، اونچے نیچے۔ پہاڑی مکانوں کی بتیاں۔

جیسے۔ ڈھیر سارے رستارے بھٹک کر آسمان سے زمین پر اتر آئے ہوں۔

اُس کا تھکا ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

ناھرکار دکھا سا جواب۔

بابا جان کا اُس کے مستقبل اور اُس کی زندگی متعلق حتمی فیصلہ۔

پچھلی رات۔ اُس کی ماما سے بات چیت۔

اور آخر میں۔ زی۔ کتنا چاہتا تھا۔ وہ اُس کو۔

اُسے تو اب معلوم ہوا تھا۔ پیار ہوتا کیا چیز ہے۔؟ ناھر جی بھی تو

اتنا مارا مارا پھرتا تھا۔

مگر، ہونہ۔ اس کا کیا پیار ہوگا۔

آج ایک سے۔ کل دوسری سے۔ اُس کی چاہت میں کیا شدت

اور جی بھی تو۔

وہ صرف مارا ہی مارا پھرتا تھا۔

پاگل نظر نہیں آتا تھا۔

خود وہ تو پاگل تھا۔ زی کے پیار میں۔

کسی اور لڑکی کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو وہ چونکا۔

مینٹل پیس پر رکھے ٹائم پیس کی طرف دیکھا۔ پورے نو بجے تھے۔

اُس کے کھانے کا ٹائم ہو چکا تھا۔

”یس بابا۔“ یا بابا اندر آئے۔ پھر بالکنی میں۔

اور کھانا میز پر لگنے کی اطلاع دے کر واپس چلے گئے۔



اُسے بھوک ہی نہیں تھی۔ نڈھال سا محسوس کر رہا تھا۔

تھکے تھکے سے قدم اٹھاتا وہ ڈائننگ روم تک گیا۔ وہیں ناظم میز کے پاس کھڑا اُس کا منتظر تھا۔

مؤدب طریق سے اُس نے شان کی مخصوص کرسی پر بٹھکائی۔

”تھینک یو۔“ وہ بلیٹو گیا۔

ناظم نے بڑا سانسفید نیپکن اس کے آگے پھیلا دیا۔ اور پھر اُسے SERVE کرنے لگا۔

مگر سوپ پی کر ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کی بھوک ہی چند دنوں سے برائے نام رہ گئی تھی۔

واپس بیڈ روم میں آیا۔ کریم بابا وہیں تھے۔

رات کے کپڑے بدل کر وہ بستر پر چلا گیا۔

کریم بابا نے حسبِ عادت اُس کے اوپر کیبل درست کئے۔ نیلی جی جلاتے ہوئے دوسری لائن آف کر دی۔

”شب بخیر بابا۔“ شان نے کیبل کندھوں تک پہنچائے۔

”شب بخیر بیٹا۔“ بابا اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے کمرے سے چل دیئے۔

اُس نے سونے کی کوشش کی۔ مگر۔ نیند کہاں؟

اُسے تو ایک ہی فکر لگی ہوئی تھی۔ زی کی۔

اُس کو اپنانے کی۔



ہاتھ بڑھا کر اُس نے یمپ آن کیا۔  
 بیڈ سائیڈ ٹیبل کے دراز میں سے بین اور پیڈ نکالا۔ تکیوں کے  
 سپہارے بیٹھ گیا۔

اور بابا جان کو مخاطب کرنے لگا۔

..... ساری زندگی اکٹھی گزارنے کا سوال ہے۔ بابا جان۔ پلیر۔

یہ ایک درخواست ہے۔ آپ اپنے فیصلے پر دوبارہ غور کریں۔ میں نے  
 اُس لڑکی سے شادی کرنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ میرے ساتھ ساتھ کسی  
 اور کی زندگی خراب کرنے سے کیا فائدہ.....

لیپ لباب کچھ اسی قسم کا تھا۔

بہر حال۔ خط لکھ کر اُسے ایک گونہ سکون ملا۔

لفافہ میں بند کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔ یمپ آف کیا۔

اور صبح سویرے ہی ناظم کے ہاتھ اسے بابا جان کے پاس گاؤں بھیجنے

کا ارادہ کر کے لیٹے ہوئے پھر سے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

صبح آنکھ کھلتے ہی اُس نے گھنٹی بجائی۔

کریم بابا آئے تو اُن سے ناظم کو بھجوانے کو کہا۔

اور خود حسبِ عادت اپنی صبح کا آغاز نماز سے کرنے کی غرض سے

بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

ناظم کو خط دے کر روانہ کرنے کے بعد ہی اُس نے اپنی بیڈ ٹی۔

اور پھر۔ روزمرہ کے معمول میں مصروف ہو گیا۔



آج تیسرا دن تھا۔ ناظم کو یہاں سے روانہ ہوئے۔ اُسے شدت سے  
اُس کی واپسی کا انتظار تھا۔ وہاں رُکے بغیر جیسا کہ شان نے اُسے کہا  
تھا۔ چل پڑتا تو آج رات تک پہنچ جاتا۔

اب تک بابا جان کو اس کا خط تو دے چکا ہو گا۔ سائٹ پر  
کام کراتے کراتے اُس نے کئی بار سوچا۔

اور پھر رات وہ سونے کی تیاریوں میں مصروف ہی تھا کہ ناظم  
واپس پہنچ گیا۔

بابا جان تو وہیں تھا نا؟ شیچ کمرے میں کھڑے شان نے  
ناظم سے پوچھا۔

”جی۔ یہ خط دیا ہے بڑے صاحب نے۔“ اُس نے جیب سے  
خط نکال کر شان کی طرف بڑھایا۔

ادہ۔ تو اتنی جلدی جواب بھی دے دیا اہولانے۔

وہ تو دنوں بعد کسی جواب کی توقع رکھے ہوئے تھا۔

”کھٹیک ہے۔ تم جاؤ۔“ اُس نے کہا۔

اور ناظم واپس چلا گیا۔

خط کھول کر وہ سامنے رکھے سونے پر جا بیٹھا۔

”تم نے غلط جگہ درخواست دی ہے۔ شاہان احمد اپنے ایک بار  
کئے ہوئے فیصلے پر کبھی دوبارہ غور نہیں کرتا۔ کسی لڑکی سے شادی کا وعدہ

سنے سے پہلے تم نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ تمہارے لئے لڑکی پسند کرنا۔

عمار کا کام ہے۔ تمہارا نہیں.....“

ادر۔ اور۔ مزید پاگل ہوتے ہوئے وہ کوٹھی سے باہر نکل آیا۔

ہراساں ذہن لئے۔ کتنی دیر اندھیروں میں کھٹکتا رہا۔ سوچ

سوچ کر ہار گیا۔

خط سے صاف ظاہر تھا کہ بابا جان کے کئے گئے فیصلے میں کسی

بچک کی گنجائش نہ تھی۔

ادر مزید اُن سے کچھ کہنا۔

اُن سے ٹکر لینے کے مترادف تھا۔

اور۔ بابا جان سے ٹکر لینا۔

کیا ایسا ممکن تھا۔؟

نڈھال سا وہ واپس کوٹھی میں آیا۔

ادر بستر پر پڑ کر بے قراری سے کروٹیں بدلنے لگا۔



اگلے دن کا طلوع اُس کے لئے پریشانیاں ہی لایا۔  
 آنکھ کھلتے ہی اُسے اُن ہی سوچوں اور فکروں نے آن گھیرا۔  
 سائٹ پر کام کر داتے ہوئے بھی وہ بات بے بات غصہ ہو  
 جاتا تھا۔ جو اس جیسے کام ہی نہیں کر رہے تھے۔  
 اور پھر چار بجتے ہی وہ زی کی طرف روانہ ہو گیا۔  
 بے چین بے قرار سا۔ پہاڑی کی گول دار چکر دار سڑک پر اپنی  
 نئی مرسیڈز بھگائے چلا جا رہا تھا۔  
 ایسی وحشت سمانی تھی من میں کہ باوجود کریم بابا کے اصرار کے  
 انہیں بھی ساتھ لے کر آنے سے انکار کر دیا تھا۔  
 وہ۔ ہوٹل پہنچا۔  
 نیم گرم پانی کا شور لیا۔ طبیعت کچھ بحال ہوئی۔  
 بیرا چائے آیا۔ پی کر سکون سا ہوا۔



پھر وہ جلدی جلدی تیار ہوا۔

زی سے ملنے کے لئے۔

گو کہ دل مایوسیوں اور اُحاسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا

چلا جا رہا تھا۔

زی کے پاس جانا۔ اُس سے ملنا۔ مزید دکھوں اور پریشانیوں

کا پیش خیمہ تھا۔ وہ اُس کی بن تو نہ سکتی تھی۔

مگر۔ وہ اُس سے ملے بغیر بھی تو نہیں رہ سکتا تھا۔

موسم کافی بدل چکا تھا۔ سفید براق قمیض اور قمیٹی گریے پیٹیٹ

میں وہ خاصا اچھا محسوس کر رہا تھا۔

گاڑی میں بیٹھ کر وہ تیزی سے ہوٹل کے گیٹ سے نکلا۔

شام کے ملگجے سائے پھیلنے لگے تھے۔ موسم بے حد خوشگوار ہو رہا

تھا۔ سڑک کے کنارے لگے پھولدار درختوں میں کلیاں پھوٹ آئی تھیں۔

ٹپ پاؤں کے ساتھ ساتھ پودوں میں کھیلے شگوفے مدہوش کن جھلک

بکھیر رہے تھے۔

وہ موڑ کاٹتے ہوئے گولف کلب کے ساتھ ساتھ چلتی سڑک پر ہولیا۔

کلب کی گھنٹی باڑھ بنائے اُن گزت جنگلی گلاب شاہ کے پھیلنے

سایوں کی منگنی روشنی میں ستاروں کا روپ پُرائے لگا رہے تھے۔ مدہم

خرام ہوا۔ سامنے کی سرسوں کی کھیتی بہت چھوٹے تھول رہی تھی۔

یہ وہی کھیتی تو تھی۔



اُسے اب بھی اُس کا اُس کے ساتھ ساتھ چلتے اچانک ہی پاؤں  
میں زخم لگنا یاد آیا۔

اُداس سی مسکراہٹ اُس کے لبوں کو چھو گئی۔  
وہ اب بھی کھیتی کی اُسی پگڑنڈی کو دیکھ رہا تھا۔  
کھیتی اب اُس کے دائیں ہاتھ پر تھی۔ اور پگڑنڈی اُس کے متوازی  
معاً وہ چونکا۔ گولف کلب کے گیٹ سے زنی نکل رہی تھی۔  
اُس نے سر باہر نکال کر مڑ کر دیکھا۔  
زنی ہی تھی۔ !

اُس کے پیچھے۔ اُس کے دائیں۔  
کھیتی کے۔ پچھلے سرے پر کھلنے والے کلب کے گیٹ سے۔  
وہ ہی تو نکلی تھی۔

شام کے وقت۔ زنی گولف کلب میں۔ ؟  
اکیلی۔ ؟ ایک پل کو اُسے شکوک نے آن گھیرا۔  
اُس نے REVERSE گیمز لگا دیا۔

گاڑی بیک کرنے ہی لگا تھا۔ کہ  
اُسی گیٹ سے ناھر برآمد ہوا۔  
”ادہ۔ پروردگار۔“ اُس کا مہر جیسے چکر اکرا سپر فلک سے جالگا۔  
توزی اکیلی نہیں تھی۔  
ناھر تھا۔ اُس کے ساتھ۔

اور پھر۔ جیسے اُس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ چند لمحے تو اُسے کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔

پھر۔ حواس مجتمع کر کے اُس نے اسٹیزنگ سے سر اٹھایا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی۔ اُس نے دوبارہ دیکھا۔  
 ”اوہ گوڈ۔“ زرین پیچھے تھی۔ ناہرا ایک قدم آگے۔ کوئی رکاوٹ تھی شاید راستے میں۔ زرین وہیں رُک گئی تھی۔

ناہر پیچھے مڑا۔ ہاتھ بڑھایا۔  
 اور زرین نے بلا جھجک اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ رکاوٹ غور کر لی۔  
 اور پھر۔ ناہرا اپنا ہاتھ زرین کے کندھے پر رکھے۔ دونوں کندھے سے کندھا جوڑے۔ اُسی پگڈنڈی پر۔  
 جس پر جہینہ بھر قبل زرین اُس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔  
 ہنستے مسکراتے آگے بڑھ رہے تھے۔

شام کے سائے اگرچہ پھیلنا شروع ہو گئے تھے۔  
 مگر۔ اتنے بھی نہیں کہ۔ زرین اور ناہر کو چھپا سکیں۔  
 اُسے اچانک ہوش آیا۔  
 مبادا۔ اپنی مدہوشی سے چونک کر اُن کی نظر اُس پر پڑ جائے۔  
 اور یہ تذلیل۔!  
 اُسے کسی قیمت گوارا نہ تھی۔  
 آہستہ سے گاڑی اسٹارٹ کی۔ اور سیدھا آگے نکل گیا۔



اچھا تھا۔ وہ جیب نہیں لایا تھا۔ ادھر یہ گاڑی۔ یہ تو ابھی  
ناصر نے بھی نہیں دیکھی تھی۔ ابھی چند دن قبل پہنچی تھی۔ اُس کو  
ایک گونا اطمینان ہوا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی اُس نے دیو در میں سے دیکھا۔

دونوں مست تھے۔ اپنے حال میں۔

اُن کو اتنی فرصت ہی کہاں تھی۔ کہ اُس کی یا اُس کی گاڑی  
کی طرف توجہ دیتے۔

وہ سیدھا ہوٹل پہنچا۔

الٹا سیدھا سوٹ کیس میں سامان ٹھونسا۔

روم سروس کے نمبر ڈائل کئے۔

اپنے واپس جانے کی اطلاع کرنے ہی لگا تھا۔ کہ دروازے

پر دستک نے چونکا دیا۔

”یس“ وہ منتظر ساد بکھنے لگا۔

ادر۔ لمحوں میں ہی بھاری بھر کم جانِ عالم صاحب اندر

تشریف لائے۔

”تھوڑی دیر پہلے ہوٹل کے میجر سے معلوم ہوا کہ تم آئے ہو۔

مگر باہر نکلے ہو۔ لہذا میں نے انہیں کہہ دیا کہ جوں ہی تم آؤ

مجھے مطلع کر دیں۔ بیٹا۔ آتے ہو تو کم از کم اطلاع تو کر دیا کرو۔

بابا جان کیسے ہیں۔ تمہارے؟“

ادھیڑ عمر جانِ عالم صاحب نے لمبی چوڑی ہمتید کے ساتھ اس کے  
 بابا جان کی خیریت پوچھی تو وہ نام سا نظر آنے لگا۔  
 ریسورڈ واپس کر بیڈ پر رکھ دیا۔  
 ”تشریف رکھیں انکل“ وہ جلدی سے آگے بڑھتے ہوئے بولا۔  
 اور۔ جانِ عالم صاحب کھڑکی کے قریب رکھے گزار صرفے  
 پر بیٹھ گئے۔

”بابا جان ٹھیک ہے۔ آپ کیسا ہے؟“ بچھلے حادثے کی تلخی  
 ایک طرف جھٹکنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ مخلص سے جانِ عالم  
 کی طرف متوجہ ہوا۔

”ٹھیک ہوں بیٹا۔ بس گزر رہی ہے اب تو زیادہ کام فحسِ عالم  
 کے سپرد کر دیا ہے۔ وہ ہمت نہیں رہی اب۔“  
 اُن سے باتوں کے دوران ہی اُس نے چلنے کا آرڈر دیا۔  
 اور پھر تھوڑی دیر میں وہ پُرتکلف چائے میں نہ چاہتے ہوئے  
 بھی جانِ عالم صاحب کا ساتھ دے رہا تھا۔  
 باتوں ہی باتوں میں رات کے دس بج گئے۔  
 چونکہ کر جانِ عالم صاحب نے گھڑی دیکھی۔ تو جانے کے لئے  
 اُٹھ کھڑے ہوئے۔

”بیٹا۔ کل دوپہر کا کھانا ہمارے ساتھ کھالو۔“  
 ”منزور کھاتا انکل۔ مگر صبح سویرے واپس جانا ہے ضروری کام ہے۔“



میں نہیں کر سکتا۔ البتہ آپ دُنز ہمارے ساتھ کھالیں۔

”اوہ نہیں۔ نہیں شکریہ اب تو گھر جا کر بھی نہیں کھاؤں گا۔ آنا کھا لیا ہے یہاں۔“ انھوں نے میز پر سہوڑے لگے لوازمات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

جانِ عالم صاحب چل دیئے تو۔ شان سوچ میں پڑ گیا۔ رات فامی گھر آئی تھی۔

اور۔ کچھ حادثے کی جان یوں تلخی میں بھی جانِ عالم صاحب کی۔ اچانک آمد پر عارضی طور پر سہی، مگر بیک گراؤنڈ میں چلی ضرور گئی تھی۔ اور۔۔۔ پھر رات وہ ادھر رہا رہ گیا۔

ساری رات دہکتے انگاروں اور لپکتے شعلوں میں لوٹ پوٹ ہوتے گزری۔

صبح کے پانچ بجے تھے۔ دھند لگا ابھی چھٹا نہیں تھا۔ کار میں بیٹھا راستے کی پُرتیچ گولائیاں گھومتا۔ وہ۔ چھوٹے سے اس خوبصورت شہر کو۔

کوسوں پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

بائیں طرف گہری کھائی تھی۔ دائیں طرف پہاڑ پر سر بفلک پائینٹر کے نیچوں پر ادھر ادھر بکھرے کچے پکے۔ چھوٹے بڑے مکانات۔ اب بھی دھند میں لپٹے نظر آ رہے تھے۔



ناصر۔ تم کتنے ظالم ہو۔ تمہیں تو کوئی اور بھی مل سکتی تھی۔ کیا ضروری تھا کہ میری ہی چیز پر ہاتھ ڈالتے۔؟ اُس نے دُکھ سے سوچا۔ تمہیں معلوم تھا اچھی طرح۔ میں زندگی میں جس لڑکی سے متاثر ہوا تھا۔ وہ یہی تھی۔ میری خوشی کا تمہیں اتنا بھی خیال نہیں آیا۔؟

اور۔ پھر۔

پہلی پہلی بار حیب شان اور ناصر موٹر بائیک والے حادثے کے بعد زی کو گھر چھوڑنے جا رہے تھے۔ تو ناصر اُس سے ایک لفظ بھی بولے بغیر اُتر کر اُس کے ساتھ ہولیا تھا۔ زی کو گھر تک چھوڑنے گیا تھا۔ اُس کی اتنی سے بھی ملا تھا۔

پھر اگلے دن ہوٹل میں زی کا فون۔؟

”ناصر صاحب ہوں گے۔؟“ اُس کی آواز اس وقت بھی بہت واضح طور پر اُس کے کانوں میں گونجی۔ اُسے اپنی تپ کی مایوسی بھی صاف یاد آگئی۔

پھر ناصر کا زک کے گھر جانا اور تقریباً سارا دن وہاں رہنا۔

”اچھا بتاؤ۔ اتنا دیر کیا کرتا رہا وہاں۔؟“ اُس نے پہاڑ پر جاتے ہوئے راستے میں ناصر سے کچھ کچھ لہجے میں پوچھا تھا۔

”وہ..... وہ..... بس ڈاکٹر لایا۔ اتنی کو۔ میرا مطلب ہے۔۔

زین کی اتنی کو دکھایا.....“

”پھر۔؟“ اُس کے اس چھوٹے سے لفظ میں بلا کی بے چینی تھی۔



”پھر کیا۔ بس گپ شپ کرتے رہے۔“

”کیسا لڑکی ہے۔؟“ وہ بے بس سی مسکراہٹ سے بولا تھا۔

اس سوال پر ناہرنے چونک کر شان کو دیکھا تھا۔

بولا کچھ نہیں تھا۔

”چپ کیوں ہو گیا۔؟“ اب کے اُس کے لہجے سے سمجھنا صاف عیاں تھی۔

”سوچ رہا تھا۔“

”کیا۔؟“

”کہ.....“

”کہ کیا جواب دو۔“

”ہاں۔“ ناہرنے کہا تھا۔

”جواب دے بھی کیا سکتے ہو۔؟“ وہ دُکھی تھا۔

”تم یوں جرح کر رہے ہو۔ جیسے میں نے تمہاری کوئی چیز لے لی ہو۔“

”تم یوں جرح کر رہے ہو۔ جیسے میں نے تمہاری کوئی چیز لے لی ہو۔“

تمہاری کوئی چیز لے لی ہو تمہاری.....

صدائے بازگشت بن کر بار بار یہی جملہ بگھلے سسے کی طرح اُس

کے کانوں میں پڑنے لگا۔

”کسی اور کا لیا ہو تو لیا ہو۔ میرا چیز کوئی نہیں لے سکتا۔“ اُسے

اچانک اپنا جواب یاد آ گیا۔

مگر۔ اُسے یاد آیا۔ ناہرنے جواباً یہ نہیں کہا تھا۔ کہ وہ اُس





اور اُس نے سر جھٹکا۔

کسی لڑکی کے لئے اتنی گندی بات خواہ وہ کیسی بھی ہو۔ سوچتے ہوئے اُسے اپنا آپ ذلیل لگنے لگا۔

دائیں طرف۔ پہاڑ کے عقب سے۔ سدا بہار پائینز کے بیچوں بیچ سورج نے جھانکنا شروع کر دیا تھا۔

ہر سو اچالا ہونے لگا تھا۔

درختوں پر اچانک سینکڑوں پرندے ایک ساتھ چھپانے لگے تھے۔

بائیں ہاتھ ڈھلان پر بنے۔ چھوٹے سے کچے مکان کے آئینے میں ایک

عورت گھاس پھوس کی بنی چھپر میں بندھی بھیر کا دودھ دوہ رہی تھی۔

کھوڑی دیر کی خوابیدہ وادی میں زندگی کے آثار جاگ اٹھے تھے۔

وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔

پھر اُس نے دیکھا۔

قدوے فاصلے پر۔ اُس کے بالکل سامنے۔

سڑک سے نیچے گہرائی میں۔

ایک ہی کمرے پر مشتمل ایک چھوٹا سا کچا گھر تھا۔ چھوٹا سا برآمدہ

تھا۔ برآمدے کے ایک سرے پر بنے ایک چوڑھے سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔

ایک جوان لڑکی چوڑھے کے پاس بیٹھی مصروف تھی۔ پاس ہی بان کی

چارپائی پر ایک مرد بیٹھا تھا۔

اُن پر نظریں جمائے وہ آہستہ آہستہ اسی سمت آ رہا تھا۔



لڑکی نے جو لھے پر سے کتلی اٹھائی۔

مرد کے ہاتھ میں پیالی تھی

وہ پیالی میں چائے ڈالتی گئی

مرد اُسے اپنائیت سے دیکھ دیکھ کر مسکراتا گیا۔ اور لڑکی مارے

حیا کے سر پر اور اُڑھی چادر مزید سنوارنے لگی۔

اُس نے ایک گہری اُداس سانس لی۔

کتنی پاکیزگی تھی لڑکی کی ادا میں۔

اُسی کے اُسے انوکھی سی خواہش ہوئی۔

حویلی، کوٹھیاں، ملیں، دھن دولت۔ سب چھوڑ چھاڑ دہا بہی

کچے، مٹی کے بنے گھر وندوں میں بسر کرے۔

ابہی لوگوں میں گھل مل کر رہنے لگے۔

غریب۔ سیدھے سادے لوگ۔

جھوٹا دریا سے دور۔

قدرت کے قریب۔

اور۔ خدا کے قریب تر شاید۔

کوئی پیدا ہوا تو بھی خدا کی مرضی تھی۔

کوئی چل بسا۔ تو بھی قدرت کو منظور تھا۔

نہ پیدائش کے پس پردہ کوئی سائینٹفک اصول کارفرما تھا۔

نہ موت کا سبب کوئی اور شے تھی۔



ہر بات، ہر کام خدا کی مرضی اور قدرت کی منظوری تھی۔  
 ہر کام کو خدا نے لاشریک کا "کُنْ فَنُکُنْ" سمجھ کر کتنے بے غم  
 تھے یہ لوگ۔ کتنا مقبوض عقیدہ تھا ان کا۔  
 اور مزید آگے بڑھتے ہوئے۔

پہلی بار اپنی مرضی سے۔ اُس نے چھوٹی سی کچی سی چائے کی دکان  
 کے آگے گاڑی رک لی۔

چھوٹی سی، میلی سی پیالی اُسے بہت اچھی لگی۔  
 "ڈبل روٹی ہے۔؟" آج جانے اُسے کیا ہو گیا تھا۔؟ اُس نے  
 دکان کے چھوٹے سے رُکے سے پوچھا۔

"ہنیں صاحب روٹی ہے۔" اُس نے کہا۔  
 "اے آؤ۔" اور گرم نرم تندور کی روٹی دودھ پتی چائے کے  
 ساتھ کھاتے ہوئے اُس نے سوچا۔

وہ آج تک اس نعمت سے کیوں محروم رہا۔؟  
 ناشتہ سے فارغ ہو کر وہ آگے۔ اور آگے بڑھنے لگا۔  
 دُکھی۔ اُداس۔ بکھرا ہوا۔ لُٹا ہوا۔  
 چور چور۔ ریزہ ریزہ۔

وہ مرد ہے۔ اپنا دکھ چپ چاپ سمیٹ لے گا۔  
 زرین اُس کی تھی ہی نہیں۔ اُس کے لئے کڑھنا کیسا؟ وہ کسی  
 قسم کی کوئی کمزوری کبھی نہیں دکھائے گا۔  
 ”ذیشان کنٹرکشنز“ کے بڑے سے بورڈ کے پاس کارپارک کرتے  
 ہوئے اُس نے عزم سے سوچا۔  
 اُس کے پی اے نے آگے بڑھ کر اُس کا دروازہ کھولا۔  
 نپے تلے قدم اٹھا تا وہ ابھی ابھی کام شروع کرنے والے مزدوروں  
 کی طرف بڑھنے لگا۔  
 دوپہر تک اُسے سر کھجانے کی بھی فرصت نہ ملی۔  
 کتنی ساری فائلیں چیک کیں۔ کئی ٹیلی فون کئے۔ درجن بھر  
 خطوط ٹائپ کروائے۔ اور پھر  
 پنج کے لئے کوٹھی پر آنے لگا تو اُس نے سوچا۔



پچھلے چند ماہ سے وہ پاگل تو نہیں ہو گیا تھا۔ ؟  
 کھانے سے فارغ ہو کر وہ تھوڑی دیر آرام کرنے کے لئے لیٹا تو۔  
 اُسے اپنا آپ خاصا ہلکا محسوس ہوا۔  
 تھکا ہوا تو تھا ہی۔ خود بخود آنکھ لگ گئی۔ اور پھر جاگا تو سرے  
 میں ملگیا سا اندھیرا ہو رہا تھا۔

اُس نے چونک کر گھڑی دیکھی۔ چھ بج چکے تھے۔  
 ”اوہ۔“ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

چار بجے تو اُسے سائٹ پر جانا تھا۔ منیجر کیا سوچتا ہوگا۔  
 اس سے قبل ایسا شاذ ہی ہوا تھا۔ وہ وقت کا بہت پابند تھا۔  
 کوئی اور ایسا کرتا تھا تو اُسے غصہ آجاتا تھا۔ کہلا کہ وہ خود ایسی  
 عفت برتا۔

کوئی ملازم ہی اُسے جگا دیتا۔  
 مگر۔ کس کی جرأت تھی۔ اُس کے آرام میں مداخلت ہو۔  
 وہ بستر سے نکلا۔ کال بیل بجائی اور باتھ روم چل دیا۔  
 منہ ہاتھ دھویا۔ تولیہ سے پونچھا۔ ڈرینگ روم میں آیا۔  
 قد آدم آئینے میں اپنے سراپے پر نظر پڑی۔

خوبصورت آنکھیں اب بھی۔ کچھلی پریشانیوں کا پتہ دے رہی  
 تھیں۔ اُس نے سر جھٹکا۔

کمرے میں آیا۔ نرم دبیر قالین پر الٹ لیٹے ہوئے کئی  
 لئے۔



اٹھ کر سیدھا کھڑا ہوا۔

تو طبیعت ہلکی محسوس ہونے لگی۔

آگے بڑھ کر وہ خوبصورت بالکنی میں جا نکلا۔

مطلع صاف تھا۔ نیلگوں آسمان پہاڑ کی حقیر سی آبادی کو۔

پتھری کی طرح گہرے میں لئے تھا۔ دور پہاڑ کی سرئی چوٹی کے پیچھے

ب بھی نارنجی رنگ بکھر نظر آ رہا تھا۔ سرئی چوٹی کے عین اوپر سرئی

دل کا چھوٹا سا ٹکڑا۔ اپنے دامن میں تاریخی کنکرا سجائے جلنے کہاں

سے کھٹک کر آنکلا تھا۔

دادی کے دامن میں۔ پانی کے تلبے کے کنارے کنارے چھوٹا سا

لا ریا۔ دن بھر کا تھکا تھکا یا۔ اپنی بھیڑوں کے ریوڑ کو چھوٹا سا کنکر

ر کر منظم کرتا۔ اُن کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ سامنے ہی ڈھلان پر

نئے چھوٹے سے کچے گھر میں ایک عورت تندور میں گھاس پھوس چلا کر

بلکے شعلوں کو دیکھ رہی تھی۔

اُس نے اوپر نگاہ کی۔

پہاڑ کی چوٹی پر بنے کھلونا نما گھر سے اٹھتا دھواں۔ شام کی پکوان

پتہ دے رہا تھا۔ اور۔ نظریں مزید ادھر اٹھیں۔

پرندوں کا پہلا غول۔ اپنے آشیانوں کی طرف رواں دواں تھا۔

اُس نے ایک گہری سانس لی۔

سوزدہ ماحول اُس کی آنکھوں کے راستے دل میں اترنے لگا۔ تو۔



وہاں ایک ٹھیس سی ابھری۔

نڈھال ہو کر اُس نے ریلنگ کے قریب رکھی آرام چیر کو کھام لیا۔

کریم بابا چائے دیں لے آئے تھے۔

شان نے اُکھیں روک لیا۔

تہنائی سے اُسے خوف آنے لگا تھا۔

بابا نے چائے دیں چھوٹی میز پر رکھ دی۔

آرام چیر پر وہ نیم دراز۔ چائے پینے کے دوران بابا سے اُکا

دکا سوال کرنے لگا۔

تو۔ دور خلاؤں میں گھورتے ہوئے اس نے بابا کا ایک بھی

جواب نہیں سنا۔

اور۔ اپنی چائے کا ہراکلا گھونٹ بھول بھول گیا۔

”بابا۔ ذرا میرا گن لائیں۔ بارہ بور۔ صاف کروں گا۔“

”اس وقت۔؟“ بابا نے حیرت سے کہا۔

”ہاں۔“ اس نے کہا۔

”بہتر صاحب۔“ اور بابا باثرے میں چائے کے برتن سمیٹنے لگے۔

”صاحب۔ ڈنر پر کوئی اسپیشل چیز۔؟“ چلتے چلتے بابا پوچھنے

لگے تھے۔

”نو۔ بابا۔“ باوجود ضبط کی کوشش کے اُسے پھر افسردگی نے آ لیا تھا

”کوئی ہلکی سی چیز کھالیں بیٹا۔ میں دیکھ رہا ہوں کئی دن سے

آپ کی طبیعت کچھ سُست لگتی ہے۔" بابا سے بولے بنانہ رہا گیا۔ آخر  
ان کا بھی کچھ فرض تھا۔ یوں اُسے پریشانی اور مضمحل وہ بھی تو نہ  
دیکھ سکتے تھے۔

"اچھا بابا۔ پکالیں جو آپ کی مرضی ہو۔" وہ بابا کی خاطر ریشاش  
بننے لگا۔ "لیکن گن لادیں۔"  
"ابھی لایا سرکار۔" آگے بڑھ کر کمرے کی بتیاں جلاتے ہوئے  
وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔

ایک اپنا اسلم ہی تو تھا۔ جس کی صفائی وہ خود کیا کرتا تھا۔ تیل  
میں نرم فلتیں بھگو کر وہ بندوق صاف کرنے لگا۔ پھر اندر کی نالیاں  
ریش سے صاف کر لیں۔  
کارٹوس بھر لئے۔

بندوق کا رخ کمرے کی طرف کرتے ہوئے ایک آنکھ میچ کر،  
وہ نالی میں سے دیکھنے لگا۔  
اور پھر۔ ایک لمحے کو۔

اُسے عجیب سی خواہش ہوئی۔  
نشانے کی زد میں بجلی سے روشن دیوار نہ ہو۔  
ناہر ہو۔ وہ ٹریگر دبا دے۔ زور کا دھماکہ ہو۔  
اور بارود اُس کا سینہ چھلنی کر دے۔ اور پھر۔



اُس چھوٹے دائرے میں اُسے ناصر اپنے نشانے کی زد میں نظر آنے لگا۔

"ہو نہہ" اُس نے بندوق آنکھ سے ہٹالی۔ تلخی سے بڑبڑاتے ہوئے اُسے اندر مہری کی طرف اُچھال دیا۔ "اس پر کیا اپنا کار تو اس مصالح کرنا۔ شوٹ تو اُس بے حیا کو کرنا چاہئے" مزید کہتے ہوئے وہ چیر پیر سے اُٹھ آیا۔

"ہیلو شان" اُس کے بیڈ روم کے بچوں بیچ کھڑا ناصر کھا۔ لہجے میں کچھ خفت سی تھی۔

"تو واقعی تم کھا" شان کمرے میں قدم رکھتے ہوئے بولا۔ لہجے کی تلخی صاف واضح تھی۔

"میں تو سمجھا تھا۔ مجھے ہی نشانہ بنانے لگے ہو" بشارت سے کہے گئے اس جملے میں بھی ندامت کی جھلک تھی۔

"ارادہ تو ہی تھا۔" ہاتھ دھونے وہ ہاتھ روم کی طرف بڑھا۔ اور شان کی بے رخی محسوس کر کے۔ زندگی میں پہلی بار۔ ناصر کے چہرے پر تاریک سایہ سا ہرا گیا۔

ماٹا کہ شان کو اُس سے گلہ تھا۔

اُس نے، اُس کے بہت بے چین۔ بے حد بے قرار حفظ کا جواب سرسری سادیا تھا۔ بلکہ جو کلام شان نے اُس کے پیر کیا تھا۔ اُس کا ذکر مائوں جا مے کرنے کا اُس کتاب تک سرچا بھی نہیں تھا۔



مگر۔ وہ شان کے پاس اُس کے گھر چل کر آیا تھا۔  
 کیا گھر آئے شخص کو اس طرح ریسو کیا جاتا ہے۔؟  
 اور۔ پھر ناھر کو۔؟ ناھر کو تو شان پر بہت مان تھا۔  
 وہ تو خود بھی شرمندہ تھا شان سے۔ مگر۔ کس طرح کرادہ  
 بات ماماں جان سے۔؟

اول تو اپنی بہن کی بات ہوتے ہوئے اُس کا منہ ہی نہیں بنتا  
 تھا کہ خود ماماں سے اپنی بہن کی بات کرے۔  
 دوئم۔ اگر بات رشتہ کی تھی۔ تب بھی بھائی ہونے کے ناطے خود  
 بات کرتے ہوئے شرم آڑے آتی تھی۔

تیسرے یہ کہ بعد میں راز کھلتا کہ زین اُس کی بہن تھی اور سب  
 اُسے پہلے سے معلوم تھا۔ اُس کے باوجود ماماں سے راز پوشیدہ رکھتے  
 ہوئے رشتہ کی بات کر دیا تھا۔ تو اکیس یہ سوچی سمجھی ہوئی اسکیم  
 معلوم ہوتی۔

اور پھر راز کو اُن سے پوشیدہ رکھنے پر اکیس دکھ الگ ہوتا۔  
 یہ سب سوچ کر ہی وہ خاموش تھا۔

اور اسی لئے خط میں بھی شان کو ٹالا تھا۔  
 مگر۔ وہ یہ سب شان کو بھی تو نہیں بتا سکتا تھا۔  
 کم از کم یہ وقت نہیں تھا۔

ابھی کچھ عرصہ اور رازداری رکھنی تھی۔ بہر حال۔!



”کہاں سے آرہے۔“ وہ واپس کمرے میں آکر صوفے پر نیم دراز  
ہوتے ہوئے وہ معنی خیز انداز میں پوچھنے لگا۔  
”وہ.... اپنے پیڈ کو ارٹ سے... کیوں؟“ نادر کو راز بہر حال  
رکھنا تھا۔

”پیڈ کو ارٹ نیچے شہر میں شفٹ ہو گیا ہے۔“ دونوں  
ہاتھ سر کے پیچھے باندھ کر اُن پر سر لگاتے ہوئے وہ اُس کی آنکھوں  
میں جھانک کر بولا۔

”کیا مطلب۔“ نادر کا رنگ بدل سا گیا۔  
”میں تک میں بھی اُدھر تھا۔“ اُس کا جھوٹا غماںپا کر سامنے  
دیکھتے ہوئے نشان تلخی سے بولا۔

اور نادر نے اُن سنی کرتے ہوئے کال بیل اٹھ کر دبا دی۔  
”اتنی دیر سے آیا ہوں۔ تم چائے کو بھی نہیں پوچھ رہے۔“ نادر  
وہیں ٹک کر بالکنی کے اُس پار۔ اندھیرے میں چلتے جگنوؤں جیسی  
جگمگ کرتی بستی کو دیکھنے لگا۔

”سوری۔ خیال نہیں آیا۔“ نشان نے کہا۔ اُس کے تلخ دُستد پہلے  
میں اُداسی اور دُکھ خود کر آئے۔

”نشان؟“ نادر ایک قدم چل کر اُس کے قریب آ بیٹھا۔  
”ہوں۔“ اُس نے صرف اتنا کہا۔

”خفا ہو مجھ سے۔“ نادر بولا۔



”ہو نہہ“ ہاتھ سر کے پیچھے سے نکالتے ہوئے وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

”اچھا۔ اب کے میں ضرور مالوں جان سے بات کروں گا“ ناصر سے اتنا دکھی بھی تو نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اور پھر۔ یہی دُکھ تو اُس کے غصے میں ڈھلا تھا۔

”I DON'T WANT TO HEAR A WORD ABOUT IT“

سختی سے کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”شان ہمیں کیا ہو گیا ہے۔؟“ ناصر کو حیرانگی ہوئی۔ شان تو بیٹی کیٹس ہی بھول گیا تھا۔

”FOR GOD SAKE NASIR STOP IT“ پریشانی سے

ماٹھا دباتے ہوئے وہ ملتی لہجہ میں بولا۔

اور ناصر کو اُس کی حالت دیکھ کر تشویش کی ہونے لگی۔

”شان۔ تم چند دن کے لئے یہاں سے کہیں اور چلے جاؤ.....“

”کہاں چلا جاؤں۔؟“

”کہیں بھی۔ نیچے شہر ہی سہی۔“

”وہ کس واسطے۔؟“ رخ اُس کی طرف پھرتے ہوئے شان

جیسے اُسے کاٹ کھلنے کو دوڑا۔

اُس کی سُرخ آنکھوں میں وحشت اُتر آئی تھی۔

”میرا مطلب ہے۔ وہاں.....“ وہ زرین کا نام براہِ راست

زبان پر نہ لاسکا۔



”ادہ گاڈ۔“

تھیں دروازے پر دستک ہوئی۔

”آجاؤ۔“ ناصر نے کہا۔ اور کریم بابا چلے گئے ساتھ نہر بیف اور  
پلیس سینڈویچ لئے اندر آ گئے۔

میز صوفے کے قریب کر کے انھوں نے اُس پر برتن رکھ دیئے۔  
اور خالی بڑے واپس لے جانے لگے۔

”بلیٹھیں بابا۔ کہاں جا رہے ہیں؟“ ناصر نے بابا کو روک لیا۔ اُن  
کی موجودگی میں شاید شان بہتر محسوس کرتا۔  
اور واقعی شان بھی آہستہ سے واپس صوفے پر بیٹھ گیا۔  
ناصر چائے بنانے لگا۔

”لو شان! اُس نے پیالی اُس کی طرف بڑھائی۔  
”نہ کھینکس۔ ابھی پیاسا ہے تمہارے آنے سے پہلے۔“ اُس کا ہجہ  
قدرے نرم پڑ گیا تھا۔

”اچھا یہ لو۔“ اُس نے چائے واپس رکھ کر اُسے نہر بیف پیش کیا  
بالکل یوں جیسے ناصر نہیں، شان باہر سے آیا ہو۔  
اور شان نے کانٹے سے ایک پیس اٹھا کر منہ میں ڈال لیا۔  
کچھ وہ ابھی چند لمحے پہلے کی اپنی وحشت پریشیمان سا تھا۔  
کچھ بابا کی بھی موجودگی کا پاس تھا۔

”چھوٹے صاحب کئی دن سے ایسا کر رہے ہیں۔ کھانا پینا برائے



نلام رہ گیا ہے۔ نافر بیٹا۔“ بابا نے نافر سے شان کی شکایت کر دی۔  
 ”کھٹیک ہو چلے گا بابا۔“ نافر نے سینڈوچ کی پلیٹ بابا کی  
 طرف بڑھائی۔ ”لیں بابا آپ بھی۔“  
 ”ارے نہیں بیٹا۔ یہ کھسکی کھسکی چیزیں آپ ہی لوگوں کا دل گردہ  
 ہے کھانے کا۔“ مسکراتے ہوئے اکھنول نے انکار کر دیا۔  
 اور یہ ”اب کے اُس نے ہنڑ بیف کی پلیٹ آگے کی۔  
 ”بیٹا کیوں مذاق اڑاتے ہو۔ یہ اُبلّا اُبلّا گوشت.....  
 کھسکی دوا ہو جیسے۔“

اور اُن کی بات پر ایک پل کو شان کے لب بھی متہم ہو گئے۔  
 ”شان پلیر۔ ہنسو بولو۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔؟“ نافر سے مسکراتے  
 دیکھ کر اپنا نیت سے بولا۔

اور شان اپنا انچلا ہونٹ دانتوں تلے دباتے ہوئے ایک گہری  
 سانس لے کر رہ گیا۔

”اچھا بابا آپ شان کو اپنی جوانی کا کوئی رومانس سُنا دیں۔“  
 کریم بابا جوانی تو کیا بڑھاپے میں خالص رومان پر و رواج  
 ہوئے تھے۔

گاؤں میں حویلی کی ملازماؤں کے علاوہ حویلی سے باہر بھی  
 اُن کے کئی معاشقے چلے تھے۔

اور بابا کو ہنسنے ہنسنے کھانسی نے آیا۔



”آپ بہت شریع ہیں ناصر بیٹا۔“

شان دونوں کی نوک جھونک سن سن کر نہ چاہتے ہوئے بھوک  
زیر لب مسکراتا رہا۔

پھر شان اور ناصر کھانے کی میز پر آئے۔ تو شان کے ہلکے سے  
ڈنر کے علاوہ میز کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک  
الواغ و اقسام کے کھانوں سے سجا ہوا تھا۔

شان سمجھ گیا۔ یہ اہتمام ناصر کے لئے ہی تھا۔  
”مزہ آگیا۔“ شان کے دائیں بیٹھتے ہوئے وہ کھانے پر پل پڑا۔  
شان نے سوپ پیا۔ اور دو چمچ پڈنگ باؤں میں نکال  
کھانے لگا۔ مگر ناصر نے خوب سیر ہو کر کھایا۔

”بابا صبح تین بجے جگائیں۔“ ڈیوٹی پر پہنچتا ہے۔ کہتے ہوئے نا  
اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھا۔

شان بھی اپنے کمرے میں آگیا۔

سامنے ہی اُس کے بیڈ کے قریب نیچے قالین پر ناصر کا بیگ تھکا  
ساز کھا تھا۔ نظریں پھلیں تو صوفے پر بڑے اُس کے والٹا پر جا پڑیں  
غیر ارادی طور پر اُسے جنبش ہوئی۔ دو قدم آگے بڑھا۔

جانے کس جذبے کے تحت اُسے کھولا۔

ایک پل کو اُسے ہلکا سا آگیا۔

زرین کی تصویر سامنے تھی۔

معاذِ دروازے پر دستک ہوئی۔ بابا تھے۔ وہ چونکا۔

”آجائیں۔“ اور ساتھ ہی اُس نے والٹا حقارت سے ناکھڑکے  
کھلے بیگ میں اُچھال دی۔

ناھر صاحب کپڑے بدلنے لگے ہیں۔ بیگ مانگ رہے ہیں۔ اپنا۔  
”اے جائیں۔“ نشان نے بیڈ کے قریب رکھے بیگ کی طرف اشارہ کیا۔

اور پھر صبح کریم بابا اُسے بیڈ ٹی دینے آئے۔ ناھر کے جانے کا  
بتایا۔ تو اُسے ایک گونہ اطمینان ہوا۔

رات ڈنر پر جو اُسے ناھر کے ساتھ اپنے رویے پر تھوڑی بہت  
پشیمانی ہوئی تھی۔ اُس کی والٹا دیکھنے کے بعد جاتی رہی تھی۔ اُس کی  
جگہ پھر وحشت نے لے لی تھی۔

رات کروٹیں بدل بدل کے گزری تھی۔

صبح کے قریب ہی شاید آنکھ بند ہوئی تھی۔ مگر۔

کھلتے ہی۔ وہی وحشت۔ رقابت۔ غصہ۔ بے قرارگی واپس  
لوٹنے لگی تھی۔



ابھی ابھی ہیڈ کوارٹر پہنچے ہی فلائنگ آفسر فریڈ نے اُسے  
ایک ماہ ٹریننگ کورس کے سلسلے میں اُس کے امریکہ روانگی کی  
خبر سنائی۔

"YOU ARE GOING NEXT WEEK" کل دننگ کمانڈر  
نفیر احمد سے صبح انفارمیشن مل جائے گی۔ "فلائنگ آفسر فریڈ نے  
مزید بتایا۔

بیس سے واپس آتے ہوئے برآمدے میں سے گزرنے لگا۔ تو  
نظر میں بائیں طرف لگے۔ بچن ہول پر گئیں۔  
"N" کے خانے میں کئی خطوط اٹکے ہوئے تھے  
رک کر وہ دیکھنے لگا۔

اُس کے بھی چند خطوط آئے تھے۔ سیمتہ کا خط تھا۔ ایک بینک  
سے آیا تھا۔

ایک اور تھا۔ اوپر اس کا پتہ لکھا تھا۔ کونے میں لکھا تھا۔  
 "از طرف ماما بقلم خود" اُس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔  
 ماما کا بہت کبھی کبھی خط آتا تھا۔ یا تو جب ماما اُس کی یاد  
 میں بہت بے قرار ہو جاتی تھیں۔ یا پھر جب ماماوں جان سے کوئی  
 زوردار قسم کی جھاڑ پڑ جاتی تھی۔  
 اور ہر لفافے پر اور ہر خط کے آخر میں "بقلم خود" ضرور لکھا ہوتا  
 تھا۔ جب کہ ہر خط میں یہ کبھی ضرور لکھا ہوتا تھا۔ کہ یہ خط فلاں فلاں  
 سے لکھوا رہی ہوں۔

کتنا پیار تھا۔ ماما کو اُس سے اور شان سے۔  
 یونیفارم تبدیل کیا۔ آرام کی غرض سے بستر پر لیٹا تو بیڈ سائڈ  
 ٹیبل پر رکھے خطوط اٹھائے۔

پہلے سمینہ کا پڑھا۔ پھر ماما کا پڑھنے لگا۔

"..... ناہر بیٹا۔ شان بہت پریشان ہیں۔ بڑے صاحب کسی  
 طور اُن کے پسند کی لڑکی سے، اُن کی شادی کرانے کو تیار نہیں ہیں  
 میں نے بھی بڑے صاحب سے بات کر کے دیکھی۔ کریم بھیا نے بھی بہت  
 مغز ماری کی۔ شان بیٹے نے خود بھی خط بھیجا تھا۔ اُن کے خط پر  
 تو چراغ پا ہو گئے۔ کہ اکھوں نے لڑکی خود پسند کرنے کی گستاخی  
 کی کیسے۔ ہ ہ بھہ بھی ڈانٹا۔ سچ پوچھو بیٹا۔ میں تم دونوں کی خاطر  
 پڑی ہوں یہاں۔ آج کو بیگم صاب زندہ ہوتیں تو کاہے کو اپنی



بے عزتی کیوں ہوتی۔" ناصر کو اچانک سنہی آگئی۔

خط لکھواتے لکھواتے یہاں آکر ضرور ماما نے نظر کا پتہ اتار کر  
آنسو صاف ضرور کئے ہوں گے۔  
وہ آگے پڑھنے لگا۔

"شان کے دشمنوں کا منہ اتنا سا تکل آیا ہے۔ جب سے پھر آیا  
ہی نہیں۔ اور ہاں یہ تو لکھنا بھول ہی گئی۔" جیسے ماما واقعی خود نکھر  
رہی ہوں۔ وہ مزید ہنسا۔

"بڑے صاحب نے شان کے لئے دلہن پسند کر لی ہے۔ اٹھو اس  
نے شان کو بھی مطلع کر دیا ہے۔ اب تم ہی کچھ کرو بیٹا۔ تمہاری ہی  
آس ہے۔ خط لکھنے میں دیر ہو گئی۔ کیوں کہ ناظم شان بیٹے کے ساتھ  
پہاڑ پر تھا۔ آج تھوڑی دیر کو آیا۔ تو بھٹا دیا خط لکھنے کو۔ تم جاؤ  
بیٹا۔ میں جاہل خط لکھنا کیا جاؤں ہوں۔"

دعا گو تمہاری

ماما۔ بقلم خود

نوٹ :- اپنی صحت کا خیال رکھنا۔ خیریت کا خط جلدی ڈالنا۔  
اور بڑے صاحب سے شان بیٹے کی سفارش فورا کرنا۔  
کوئی اور موقعہ ہوتا تو وہ حسب معمول ماما کا پیارا سا خط  
پڑھ کر زوردار قہقہہ لگاتا۔

ماما بیگم دوستوں میں اُس کی چڑبن گئیں تھیں۔ مگر۔

پتہ نہیں کیوں؟

”بڑے صاحب نے شان کے لئے لڑکی پسند کر لی ہے۔“ پڑھ کر اُسے دکھ سا ہوا۔

”بڑے صاحب کسی طور اُن کی پسند کی لڑکی سے اُن کی شادی کرانے کو تیار نہیں ہیں۔“ اُس نے دوبارہ خط پر نظر ڈالی۔

اور پھر نہ جانے کہاں سے۔

ایک طنز یہ مسکراہٹ اُس کے لبوں پر آگئی۔

ماموں جان نے شان کے لئے کسی بہت ہی اونچے گھرانے کی لڑکی پسند کی ہوگی۔

اونچا گھرانہ۔ ہر لحاظ سے اونچا۔

اسی لئے تو اتنا عرصہ کوئی گھرانہ اور کوئی لڑکی اُن کے معیار پر پورا نہ اُترتے تھے۔

شان کی پسند۔ ذرین۔۔۔

ایک مچھولی سی انیکسی میں ایک غریب ماں کے ساتھ گذر بسر کرنے والی۔ اُن کی نظروں میں کہاں چج سکتی تھی۔

اور پھر اُسے اچانک۔ زندگی میں پہلی بار۔

ماموں جان کی آن سے نفرت سی ہوگئی۔

وہ کسی لڑکی کو اُس وقت ہی قابلِ توجہ سمجھتے تھے کہ۔ پہلے

گھرانے کی تسلی کر لیں۔



”گھرانہ کیسا ہے۔؟ میرا مطلب ہے اچھے لوگ ہونے کے علاوہ اُن کا گھرانہ۔ طور طریقے ہمارے اسٹینڈر کے بھی ہونا چاہئیں۔“ اُسے سمیٹنے کے سلسلے میں کہے گئے ماموں جان کے الفاظ یاد آ گئے۔

پھر گھرانہ اچھا تو تھا۔ مگر بقول اُن کے۔ اُن کے معیار پر صحیح نہیں بیٹھتا تھا۔

اس پر خاصی کش مکش ہوئی تھی۔ اور پھر۔ ماما کی ہی رفتار پر وہ مان گئے تھے۔

پھر وہ اچانک چونکا۔

شاید اس لئے کہ وہ شان نہیں تھا۔ اُن کی اپنی اولاد نہیں تھا۔ اسی لئے شاید۔ انہوں نے۔ زیادہ پروا نہیں کی۔

خط ایک طرف ڈالتے ہوئے وہ دونوں بازوؤں میں سر چھپا کر ٹکیوں پر اونڈھا ہو گیا۔

زرین۔ تم غریب ماں کے بطن سے کیوں پیدا ہوئیں؟

ابو۔ اپنی خوشیوں کی تسکین کے ساتھ ساتھ آپ نے کبھی یہ بھی سوچا تھا۔ کہ زرین کا کیا ہوگا۔؟

دنیا تو پیسہ دیکھتی ہے۔ ماموں جان تو پیسہ کبھی خالص دیکھتے ہیں۔ جو پشتوں سے چلا آ رہا ہو۔

باپ کے علاوہ لڑکی کی ماں کی رگوں میں بھی بولتا نظر آتا ہو۔

زرین۔ میری بہن۔ تو باری بھی تو کہاں؟

"SHE LOVES ME TOO" شان نے اپنے کچھے فط میں  
وضاحت کر دی تھی۔

مانا کہ۔ غریب تم بھی نہیں ہو۔ ابو کا سب کچھ تمہارا بھی تو  
ہے۔ مگر۔ اپنی اتنی کو۔ اُن کی غربت کو۔ اُن کے آبائی کچے گھر کو  
کہاں چھپاؤ گی؟

اُن کو پشتوں سے کیسے مالا ماں کر دی۔؟  
"اپنی اتنی۔" اپنی سوچی بات پر اُسے مذمت سی ہوئی۔ اُس نے یہ  
کیوں نہیں سوچا کہ وہ اُس کی بھی ماں ہے۔

ابو کی بیوی۔ اُس کی ماں۔ جیسی بھی ہے۔ جہاں کی بھی ہے۔ اُس  
کے باپ نے اُس کے ساتھ نکاح کر کے اُسے اپنے ساتھ ایک براہِ رُک لیا  
ہے۔ وہ انہی میں سے ایک حصہ ہے۔ وہ انہی کی ہے۔

وہ سیدھا ہو کر لیٹ گیا۔ دونوں ہاتھ سر کے نیچے باندھ کر وہ  
چھت کو گھورنے لگا۔

اور پھر۔ اُس نے زرین کو جنم دیا ہے۔ اُس کے ابو کی بیٹی کو۔  
اُس کی خیر خواہ کو۔ اوہ۔

"امی۔" وہ اٹھ کر بستر میں بیٹھ گیا۔ "آپ نے مجھے اس دنیا میں اکیلے  
ہونے سے بچا یا ہے۔ آپ بہت عظیم ہیں۔ آپ کی کوئی بے عزتی کرے  
گا۔ تو ناصر جان سے گزر جائے گا۔" اُس نے عزم سے سوچا۔

اور اٹھ کر۔ ہاتھ روم چل دیا۔



صبح اندھیرے میں وہاں سے نکلا تھا۔ آکر سیدھا حاضری دی کھئی۔  
 دو بجے فارغ ہو کر میس میں کھانا کھانے گیا۔ واپسی میں خطا لیتے ہوئے  
 کمرے میں آیا تھا۔ آرام کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔  
 ٹھنڈے پانی کا شاور لیتے لیتے۔

اُسے دو دن قبل انکل و آنٹی ماجد کی آمد کا خیال آیا۔  
 ”ہم آپ سے زرین کی بھیک مانگنے آئے ہیں۔ بھابی ہمیں مایوس نہ  
 کیجئے گا۔“ انکل ماجد نے کتنے ملتجی انداز میں کہا تھا۔  
 ”ناہر بیٹے۔ ہمیں خالی ہاتھ نہ لوٹانا۔ آنٹی ماجد کتنی آس  
 سے بولی تھیں۔“

اُس نے سوچ کر جواب دینے کا کہہ کر ٹال دیا تھا۔  
 شان کی پسند بہر حال اُسے زیادہ عزیز تھی۔ مگر۔  
 ”بڑے صاحب نے شان کے لئے دلہن پسند کر لی ہے۔۔۔ بڑے صاحب  
 اسی طور اُن کے پسند کی لڑکی سے اُن کی شادی کرانے کو تیار نہیں ہیں۔“  
 ماموں نے ایک تلخ اُداس سانس لی۔

جیسے ماموں جان کے بیٹے کے علاوہ اس دنیا میں لڑکے ختم  
 ہو گئے ہیں۔ اُس نے تلخی سے سوچا۔

اور پھر۔ اُس نے سوچا۔ اچھا ہوا۔ اُس نے انکل و آنٹی ماجد کو  
 مایوس نہیں لوٹایا تھا۔

ساجد اچھا اور قابل لڑکا تھا۔ سب سے بڑھ کر جانا بچہ پانے لوگ تھے۔

اتر کے وقت کی دوستی تھی آپس میں۔

ہنا دھو کر اس نے کپڑے پہنے۔ بالوں میں برش کیا۔ اور کمرے میں آگیا۔ چائے منگوائی۔ اور خود اتنی کو خط لکھنے بیٹھ گیا۔

..... اتنی! اگلے ہفتہ امریکہ جا رہا ہوں۔ ایک ماہ کے لئے۔

خرچے کے لئے رقم کل منی آرڈر کر دوں گا۔ باقی اگر ضرورت پڑے تو وہیں بینک سے زرین اپنے اکاؤنٹ سے نکلوائے۔ جانے سے پہلے ملنے بہنیں آنکھوں لگا۔ فون ضرور کروں گا۔ کوئی چیز منگوائی ہو تو۔ پھر بتا دیں۔ انکل و آنٹی ماجد اگر پھر بات کریں زرین سے متعلق۔ تو اکیس کہہ دیں میرا انتظار کریں۔ امریکہ سے واپسی پر جواب دوں گا۔ ویسے بڑا کچھ پسند ہے اور کوئی خاص بات نہیں ہے۔ چوکیدار امیر ہے۔ صبح ڈیوٹی دیتا ہوگا۔ اپنے لئے نوکر کا بند ورت ضرور کریں۔ کچھ تو آرام لے لیں آپ کو۔ پتہ نہیں کیوں۔ آج آپ بہت یاد آرہی ہیں۔ زرین سے کہیں زیادہ۔

زرین کو پیار۔ آپ کی دعاؤں کا طالب۔

آپ کا اپنا۔ ناصر

خط ختم کرتے کرتے اس نے زور سے آنکھیں میچ لیں۔ پھر پلکیں جھپک لیں۔

بیڈ سائیڈ ٹیبل کے دراز سے لفافہ نکال کر اس میں خط بند کرتے ہوئے اوپر پتہ لکھ دیا اور کمرے سے باہر نکل سامنے والے



لیٹر بکس میں ڈال دیا۔

مختلف سوچیں ذہن میں لئے وہ چائے پیتا رہا۔

اور پھر۔

صبح ڈیوٹی پر جلتے ہی پہلے اپنے ونگ کمانڈر سے ملا۔ ضروری

معلومات اور ہدایات حاصل کیں۔

ماہوں جان کو فون پر مطلع کیا۔

باقی کے دن ضروری تیاریوں میں لگا رہا۔

رات زرین سے فون پر بات کی۔

اور صبح دس بجے امریکہ کے لئے چل پڑا۔

لیٹر بکس میں ڈال دیا۔

مختلف سوچیں ذہن میں لئے وہ چائے پیتا رہا۔

اور پھر۔

صبح ڈیوٹی پر جلتے ہی پہلے اپنے ونگ کمانڈر سے ملا۔ ضروری

معلومات اور ہدایات حاصل کیں۔

ماہوں جان کو فون پر مطلع کیا۔

باقی کے دن ضروری تیاریوں میں لگا رہا۔

رات زرین سے فون پر بات کی۔

اور صبح دس بجے امریکہ کے لئے چل پڑا۔



شرار کی سرچتا تھا۔

اُس نے گھڑی دیکھی۔ شام کے تین بج رہے تھے۔

”کل میری برتھ ڈے ہے۔ آپ ضرور آئیے گا، اُسے اچانک یاد آیا۔

کل یینا اور سینڈھامد علی گارڈن آئے تھے۔ بلکہ بقول سینڈھامد صاحب کے

یینا کے گارڈن دیکھنے کا شوق ہی اکھیں اس بار یہاں کھینچ لایا تھا۔

اُن کے کہنے پر شان یینا کو اُس کی دلچسپی کے مقدمات مختلف دکھانے

بھی لے گیا تھا۔ پھر آخر میں اپنے فارمز۔ پولٹری سے ہوتا وہ اُسے اپنے

اصطیل لے آیا تھا۔ یینا بہت متاثر نظر آرہی تھی۔

پھر واپس جانے لگے تو یینا نے اُسے اپنی برائے فکرہ پر انوائٹ کیا۔

اُس وقت اگرچہ اُس نے بلباہان کی مترشح آمد کا کہہ کر ٹال دیا

تھا اُسے۔ مگر اس وقت نہ جانے کیوں اُسے خیال آیا کہ چلا جائے۔

دو چوں سے فرار کا اُسے ہی ایک راستہ نظر آیا۔

“HAPPY BIRTH DAY TO YOU”

بھٹی کی نظریں اٹھیں۔ تو پھر چند ثانیے بے لفتی کے عام میں اٹھی

پہلے گئیں۔ لمبا قدر چوڑے شانے۔ پُرکشش نقوش۔ بہترین۔ قیمتی

سوٹ میں میونس۔

ایک بار پھر وہی گریک گورڈ اُس کے سامنے تھا۔ مگر۔

اُس نے پلک پر چمکائیں۔ آج اُس کے لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ تھی۔

تس کا سا خد اُس کی بے حد خوبصورت آنکھیں بھی دے رہی تھیں۔

"THIS IS FOR YOU MAAM" تحفے کا مٹیلیس پیکٹ اُسے

پکڑاتے ہوئے اُس کی مسکراہٹ قدرے گہری بھی ہو گئی تھی۔

"اوہ۔ ذی شان تھینک یو۔ سونا لیس آف یو مجھے یقین نہیں آرہا کہ یہ واقعی آپ ہیں۔" گفٹ کھاتے ہوئے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کہے۔

"بالکل ہم ہے۔ ذیشان۔ شاہان احمد۔" سر قدرے خم کرتے ہوئے اُس نے کہا۔

تو یٹنا کو لگا۔ آسمان جھک آیا ہے۔ اور پھر۔ وہ توجہ لپتے آپ کو بھی بھول گئی۔

اور کیوں نہ ہوتا ایسا۔ شان بھی تو تمام وقت اُس کے ساتھ ساتھ رہا۔ باتوں میں، مسکراہٹوں میں۔ اُس کا ساتھ دیتا رہا۔ یہاں تک کہ اُسے الوداع کہنے وہ ہال سے یا پھر اُس کے ساتھ گاڑی تک آئی۔

اُسے اگلی شام اکٹھی گزارنے مقامی ہوٹل میں مرغوخ کیا۔ تو وہ بھی اُس کے خوشی خوشی قبول کر لیا۔

گاؤں پہنچا تو رات غاصی ہو گئی تھی۔ تھکے کا ہوا تو کھتا ہی پکڑے بدلتے ہی بستر پر پڑ رہا۔

ایک بل کو زری کا خیال آیا۔ حقارت سے جھٹک دیا۔



آج شام اُس کی اچھی گزری تھی۔ عرصہ بعد ذہن پر کا گراں  
 بوجھ کچھ ہلکا ہوا تھا۔

مدتوں بعد لگا۔ ابھی دنیا آیا دے۔ اور بھی رونقیں ہیں اس  
 میں۔ زمانہ بعد احساس ہوا تھا۔ وہ بھی زندہ ہے۔ زندہ رہ سکتا ہے۔  
 خواہ مخواہ ہی اُس نے سمجھ لیا تھا۔ اُس کے بغیر وہ نامکمل ہے۔  
 زندہ نہ رہ سکے گا۔

”اوہ“ اُس نے کرب سے کروٹ لی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ پھر  
 وہی سب کچھ سوچنے لگا تھا۔

ٹینا سے باتوں میں وہ پچھلی باتیں بھول گیا تھا۔ جیسے۔

ٹینا اچھی تو تھی۔ کتنی خوش رنگ لگ رہی تھی۔ اُس کی قربت  
 سے۔ وہ مزید سوچنے لگا۔ اور پھر۔ آہستہ آہستہ نیند کی دادیوں  
 میں جا اتر۔

صبح ہوئی آنکھ کھلی۔ جب معمول پھر۔ زی۔ جیسے پلکوں پر  
 ہی تو رہتی تھی۔ سامنے آگئی۔

مزید سوچے بنا ہی اُس نے خیال جھٹک دیا۔

کوشش کی ٹینا کو سامنے لایا۔ مگر دل جیسے بیٹھ ہی تو گیا۔

کتنی کھوکھلی تھی کل کی شام۔ ٹینا۔ سب۔ کیسے اُس نے ساتھ

دیا تھا اتنی دیر۔ کیا تھا۔ وہ رب۔ بے حد اجنبی لگا۔

زی۔ پھر دھیرے سے درآئی۔ کتنی اپنی تھی زی کی یاد دہانی دنیا۔

اُس کی سوچوں میں کتنی یگانگت تھی۔ اپنائیت تھی۔ گو کہ درد  
 تھا بے پایاں۔ تڑپ تھی بے پناہ۔ مگر اس درد میں بھی اس تڑپ  
 میں بھی ایک الٹا کھاسا سکون تھا۔ عجیب سا قرار تھا۔  
 یہ درد، یہ تڑپ اُس کے اپنے تھے۔ کل شام کی دُنیا اُس  
 کی اپنی نہیں تھی۔

سوچیں خرید آگے بڑھیں۔ بارہا سوچی ہو سوچیں بالترتیب  
 سامنے آنے لگیں۔ تو اطمینان سے سوچتے اُس نے سردوٹوں بازوؤں  
 میں لے کر اُلٹی کروٹ لے لی۔

تبھی سر ہانے پڑی ونی والٹ سے ہاتھ ہٹا کر آیا۔  
 نامہ کی والٹ میں زی کی تصویر۔ زی کے متعلق ایسی کون سی  
 بات تھی جو سیکنڈز سے پہلے ہی اُسے یاد نہیں آجاتی تھی۔  
 والٹ اٹھا کر اُس نے قالین پر دے ماری۔ وحشت پھر سے  
 طاری ہونے لگی تھی۔

کبل پرے ہٹایا۔ ہاتھ روم گیا۔  
 فارغ ہو کر تو لیے سے سر رگڑ رہا تھا۔ آئینے پر نظر پڑی۔  
 اپنی آنکھوں میں جھانکا۔

نامہ اپنا ہاتھ زرین کے کندھے پر رکھے۔ دونوں کندھے سے کندھا  
 جوڑے۔ پگڈنڈی پر ہنستے مسکراتے چلتے نظر آئے۔ اور نڈھال  
 ہو کر اُس نے آنکھیں میچ لیں۔



بے قراری سے سرا دھرم سے اُدھر مارا۔ اور تولیہ ڈرلینگ روم  
میں پٹختے ہوئے کمرے میں آگیا۔

وہ تو اپنے آپ کو بہت خود دار سمجھتا تھا۔ کہاں گئی اس کی خود  
داری؟ اُس کے اندر کا شان بولا۔ اور پھر اُسے جیسے ہوش آگیا۔  
وہ اُسے آئندہ کبھی یاد نہیں کرے گا۔ بیچ کمرے میں کھڑے کھڑے  
اُس نے فیصلہ کر لیا۔

معا فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ بابا جان تھے، شاید۔ لپک کر اُس  
نے ریسور اٹھا لیا۔

”یس ذیشان اپیلنگ۔ ادہ“ اُس کی آواز پھسکی پڑ گئی۔  
”ہاؤ آر یو۔ آئے سی۔ ILL TRY TO COME۔ ادہ“ اُس کی  
ہنسی کھوکھلی تھی۔ ”ادہ کے I WILL COME“ اور ندھنا سا اُس نے  
ریسور کریڈل پر ڈال دیا۔

کل شام تو ایک کوشش تھی۔ دانتہ یا نادانتہ۔ فرار کی۔  
زی کی یادوں سے۔ زی۔ اُسے غصہ آگیا۔  
کیا سمجھتی تھی اپنے آپ کو؟ ہو نہ۔ مٹا ڈالے گا اُس کے ہر نقش  
کو وہ۔ اُس نے حقارت سے سوچا۔

ٹینٹے آج شام ہوٹل میں اکٹھے گزارنے کی یاد دہانی کرائی تھی۔  
ہزد رہائے گا۔ دُنیا صرف زی ہی کے دم سے تو آباد نہ تھی۔  
اور پھر۔ شام ٹھیک ساڑھے سات بجے ٹینا کی منتظر نگاہیں چمک

ہوٹل کا مستعد بیرا شان کی بھرپور شخصیت سے مرعوب اُس کے  
 لئے دروازہ کھائے کھڑا تھا۔  
 گریک گود آہستہ آہستہ اُس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ خدوخال  
 میں وہی بے پناہ کشش تھی۔  
 ڈارک براؤن گھنے بانوں کا وہی مخصوص انداز تھا۔ لباس معمولی  
 سویرا در قیمتی تھا۔ مگر چال نڈھال تھی۔  
 'ہیلو، کہا۔ تو مسکراہٹ نے ساتھ نہیں دیا۔ نظر میں تو تنگ  
 معدوم ہو گئی۔ ٹینا بچھو سی لگی۔ شان کل شام کی طرح ہشاش  
 بشاش نہیں تھا۔

"YOU ARE NOT FEELING WELL" جو کس پیٹے پیٹے  
 ٹینا نے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔  
 "I'M QUITE ALLRIGHT"  
 "پھر چپ کیوں ہیں۔؟" ٹینا نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں  
 لے لیا۔

"ہتیس ایسا نہیں ہے۔" اُس کا ہاتھ ٹینا کے ہاتھ میں ان ایئر کی  
 محسوس کر رہا تھا۔

"COME ON SHAAN" اُس کا ہاتھ دباتے ہوئے ٹینا نے  
 بغور اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔  
 شان نے خاموشی سے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔



جوس کا خالی گلاس میز پر رکھا۔ ٹانگیں میز کے نیچے ہی پھیلائی۔  
سرکری کی پشت سے ٹکایا۔ اور آنکھیں موند لیں۔

”کچھ بولیں نہ“ بیٹا نے کہا۔

”کیا بولے“ شان نے تھکی تھکی آنکھیں اٹھائیں۔

ہمیشہ کی طرح بخون زدہ لہجے۔ اور اسٹون گرے کرسٹل کا تھکا  
تھکا انداز۔ آج پھر قاتلانہ تھا۔

”الذمیاں نے آپ کو بہت محنت سے بنایا ہے۔“

”سب پر محنت کیا ہے“ اُس کی مسکراہٹ بھی تھکی تھکی تھی۔

”آپ پر خالص غناایت ہے۔“ ادا شان نے اک گہری ادا اس سالن لی۔

”شاید۔“ خوبصورت آنکھوں میں کرب جھلک آیا تھا۔

”جبھی تو آپ پراؤڈ ہیں۔“

”لوگ کہتا ہے۔“

”میں بھی کہتی ہوں۔“

”آپ کے ساتھ ہم نے کیا کیا ہے۔“ بیدھا بیٹھتے ہوئے وہ لہجے میں

بشاشت پیدا کر کے بولا۔ جب مجھوں اُس کا لب لہجہ ٹینا کو مسحور کر گیا۔

”مجھے لگتا ہے کہ I AM FALLING IN LOVE WITH YOU

اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ بولی۔

شان نے ایک نظر اُسے دیکھا۔ اور پھر اُسے اچانک خیال آیا۔

”کل شام آپ نے مجھ کو بتایا تھا۔ کہ کوئی مسٹر نعیم آپ کا بوائے

فرینڈ ہے۔

”ہاں۔ کیوں۔؟“

شان نے پھر ایک نظر اُسے دیکھا۔ ”کچھ نہیں۔“

”آپ سے ملواؤں گی کسی دن۔ HE IS A NICE GUY“

”SEE I“ شان کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”اس وقت ہوتا تو بیئر چلتی۔ مگر جیسے اُسے یاد آیا۔“ گورمنٹ

نے بند بھی تو کر رکھی ہے۔ STUPID“ وہ بڑبڑائی۔

”ہوں۔“ مینر پر رکھی اُس کی سگریٹ کی ڈبیہ کو گھورتے ہوئے

وہ دھیرے سے بولا۔

”آپ بھی یقیناً پیتے ہوں گے۔“

”نہیں۔“ اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”REALLY“ ٹینا کو یقین نہیں آیا۔

وہ خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔

”IT IS ALWAYS WONDERFUL“ آپ بھی پی کر دیکھیے۔

”کبھی چکھا ہے۔“ شان نے ازراہ مذاق کہا۔

”YES۔“ میں پیتی ہوں۔“ ہاتھ بڑھا کر مینر پر سے سگریٹ کی ڈبیہ

اٹھاتے ہوئے وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

شان اب بھی اُسے دیکھ رہا تھا۔

اُسے یاد آیا۔ ایک بار لندن سے پیرس جاتے ہوئے ٹرین میں اُس نے



اپنی سالتھی الزبتھ کو بار بار میز پر پینے پر ٹوکا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس چیز کے بارے میں وہ پابند نہیں تھے۔

"سگریٹ" ٹینا نے ڈبیہ اُس کی طرف بڑھائی۔

اور اُسے این یاد آگئی۔ جس سے اُس نے ایک دن باقاعدہ بائیکاٹ کر لیا تھا۔ اُسے سرے سے وہ لڑکی ہی ماننے کو تیار نہیں تھا۔ وہ چین اسکو کرتھی۔ اور یہ خصوصیت اُس کی نظروں میں ایک مرد کی ہی ہو سکتی تھی۔

"تو تھینک یو۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجہ میں بولا۔

"اوہ۔" سگریٹ نکال کر لپ اسٹک لگے ہونٹوں میں اٹکاتے ہوئے اُس نے حیرت سے آنکھیں پجائیں

IT KEEPS MY MORALY UP - لائبرٹ کا شوہ سگریٹ کو دکھاتے ہوئے اُس نے مزید کہا۔

اور۔ تھک کر شان نے دوبارہ سرکری کی پشت سے ٹکا لیا۔

تیم وا آنکھیں اب بھی ٹینا پر جمی ہوئی تھیں۔

مختصر سیولیس بلاؤز۔ بہت گہرا گھلا۔ گود میں سے ہو کر نیچے

قالین پر ڈھیر ہوتا ساڑھی کا پلو۔ عریاں پیٹ۔ عریاں کمر۔

چہرے پر گہرے میک اپ کی تھیں۔ ہونٹوں میں سگریٹ۔ اور پاؤں

ہوٹل میں بختی دھن پر رقصاں۔

اُس کی آنکھیں مٹ گئیں۔

سادہ قیمہ من۔ شلوار۔ بڑا سا دوپٹہ۔ نیلی چوٹی۔ میک اپ







گہرا کر سر گھٹنے پر ٹکیٹی یا شرمنا کر آنکھیں بازو سے ڈھکتی زی اُس کے تصور کے پردے پر ابھر آئی۔

”پروردگار۔ اُسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔

”یولیس گے نہیں۔“ پاؤں کے دباؤ میں جیسے صلیب تھا۔

”I SAY THIS IS NOT FAIR“ پاؤں اٹھ کھینچتے ہوئے

اُس نے اپنا غصہ ٹینا پر اتار دیا۔

”کیا ہو گیا ہے ڈارلنگ۔“ اُس کی بے باک نگاہیں شان

کے چہرے پر گر گئی تھیں۔ اور شان کا دل چاہا۔

سب چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جائے یہاں سے۔ یہ اُس کی دنیا

نہیں تھی۔ یہ مامول اُس کے لئے اجنبی تھا۔ اتنا کہ اُسے اپنا دم

گھٹنا محسوس ہو رہا تھا۔

فسرار کی راہ جو اُس نے اختیار کی تھی۔ اُس کے بس کا روگ

ہیں تھی۔ تاہی وہ فرار میں کامیاب ہو پا رہا تھا۔

ہر پن۔ ہر لمحہ۔ زی اس پاس ہی کہیں موجود رہتی تھی۔

کیا اسے فسرار کہتے ہیں۔

اگر یہ فسرار ہے۔ تو باز آیا وہ۔

”دیٹر“ اُس نے اشارے سے دیٹر کو پاس بلایا۔

”WE MUST PUSH OFF NOW“ اُس نے بڑے ضبط سے کہا۔

”ابھی تو صرف نو بجے ہیں۔“ ٹینا کا ابھی جانے کا کوئی ارادہ

نہیں لگ رہا تھا۔

”سوری۔ مجھے گاؤں بھی پہنچنا ہے۔“ گھڑی دیکھتے ہوئے وہ

قدرے نرمی سے بولا۔

شان کے کندھے پر بازو ٹکائے وہ بادلِ نخواستہ ہٹل

سے باہر نکل آئی۔

پھر دونوں کی گاڑیاں آگے پیچھے چلتی ٹینا کی کوکھی کے

گیٹ تک آئیں۔

شان نے ”گڈ نائٹ“ کہا۔ گاڑی رُخ موڑا۔ گاؤں کی

راہ لی۔ تصور میں زی ابھری۔

تو۔ اُس نے سوچا۔

اس کا توڑ ہونا چاہئے۔ مردانہ دار۔

قرار نہیں۔ اور وہ پُر عزم لگ رہا تھا۔



دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ جمعہ کا دن تھا۔ نورینے  
 کمروں کی صفائی کرنے کے بعد کچھلی طرف چھوٹے سے صحن  
 میں سیب کے درخت کے نیچے نئی کونپلیں پھوٹی شاخوں کے  
 تلے کرسی ڈالے باربرا کا رٹ لینڈ کا "OUT OF REACH"  
 پڑھنے میں مہلک تھی۔

انی ضروری کا مول سے فارغ ہو کر سامنے کے مختصر سے لان میں  
 نکل کر چوکیدار کو گیارہ بجے کوڑی کرتے دیکھتے ہوئے موسم کے لحاظ سے  
 مزید پھولدار پودے لانے کی ہدایات دے رہی تھیں۔  
 شیگنوں آسہان یا اگل صاف تھا۔ کچھ غرہ قبل کی لرزئی کا بستی  
 دھوپ میں اب حرارت کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ آبادی کو گھیرے میں  
 نئے اونچی سرنگی پہاڑ جیسے برف جھاڑ کر ڈھل کر نکھر آئے تھے۔ درختوں  
 میں نئی کونپلیں پھوٹ آئی تھیں۔

اور پاس ہی خوبانی کے درخت پر بیٹھی بیل ایک شاخ سے  
 دوسری شاخ پر لپکتی۔ داویلا حیا مچا کر پہاڑ کی بے ثباتی کا اعلان  
 کر رہی تھی۔ اتنی نے ایک گہری سانس لی۔  
 بیل سے نظریں پھیر کر وہ ٹان میں لگی گھاس کو دیکھنے لگیں۔  
 جگہ جگہ سے ہری ہو رہی تھی۔

اور پھر گیٹ پر ہلکی سی پارس پر چونکیں۔  
 ”دیکھو۔ کون ہے؟“ اتنی نے چوکیدار سے کہا۔ اور خود رخ پھیر کر  
 اندر برآمدے کی طرف آنے لگیں۔  
 گیارہویں میں داخل ہوتے ہوئے اقبول نے دیکھا۔ لمبی سیاہ  
 قیمتی گاڑی گیٹ کے اندر داخل ہو رہی تھی۔  
 وہ کھٹک کر رہ گئیں۔

گھاڑی برآمدے کے آگے آکر رکی مستعد باوردی ڈرائیور  
 اُترا۔ اور تیزی سے گھوم کر کار کا پچھلا دروازہ کھولا۔  
 ادنیٰ باقر۔ چوڑے شانے۔ کھلتا گندھی رنگ۔ صحت مند جسم۔  
 بڑی بڑی بارعقب موٹھیں۔ مدبر چہرہ۔ بچاس کے لگ بھگ سن۔  
 موٹم اور عمر کے لحاظ سے بہترین قیمت سوٹ میں ملبوس۔ وہ  
 جاگیر دارانہ انداز میں اُتارے۔

”بیگم یا سر علی ہیں؟“ وہ بارعقب۔ جاگیر دارانہ شان سے گویا  
 ہوئے۔ تو اندر سکینہ بیگم کا دل دھک دھک کر نہ لگا۔



”جی صاحب اندر ہیں۔ چوکیدار نے مرغوب ہجہ میں جواب دیا۔  
 ”اطلاع کر دو۔ شان احمد آئے ہیں۔“ انھوں نے مزید کہا۔  
 اور سکنہ بیگم پتے کی طرح کانپتے دل کو مضبوط کرنے کی کوشش  
 کرتے لگیں۔

چوکیدار نے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر انھیں بچھایا۔  
 ڈرائیور کے لئے باہر لان میں کرسی ڈال دی۔  
 سکنہ بیگم نے اندر جا کر دھڑکتے دل سے زرین کو شان کے  
 والد کے آنے کی اطلاع دی۔

”اتنی۔ جا کر مل آئیں۔ اگر وہ اچھی نیت سے آئے ہیں تو سر  
 آنکھوں پر۔ در نہ گھبرائیے بالکل نہیں۔ آپ کسی کی محتاج نہیں ہیں  
 ہمارا اقداس ہے۔ اور پھر اللہ نافر بھائی کو رکھے۔ ماں کی حالت دیکھ  
 کر اس نے ان کی ڈھارس بندھائی۔“

”ہاں بیٹا۔ ٹھیک کہتی ہو۔“ وہ سفید ملل کا بڑا سا سفید دوپٹہ  
 سر پر اچھی طرح جھاتے ہوئے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھیں۔  
 اندر داخل ہوتے ہوئے دل ایک بار پھر دھڑکا۔  
 کیا کہنے آئے تھے۔ ۹ وہ۔

ادرا کھیں۔ اندر داخل ہوتے دیکھ کر شاہان احمد تعظیماً  
 کھڑے ہو گئے۔

”السلام علیکم بہن۔“ دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف باندھے۔ سر قندے

جھکائے وہ دھیمے لہجہ میں بولے۔

”وعلیکم السلام“ پتہ نہیں کیے سکیںہ بیگم نے جواب دیا۔ اور ڈرائنگ روم کے پرے سرے پر جا کر آہستہ سے کرسی پر بیٹھ گئیں۔  
تجھی شاہان احمد دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

”ہن! ہم آپ سے گلہ کرتے آئے ہیں۔ یا سر علی کے نکاح میں ہوتے ہوئے آپ نے ہمیں بے خبر رکھا۔ اُس کی بیٹی کو جنم دیا۔ پھر بھی ہمیں غیر سمجھا۔ بیوگی کا دکھ اٹھایا۔ کمپرسی کی حالت میں زرین کی پرورش کی۔ ہمیں خبر نہ کی۔ آپ دونوں نے رکھی سوکھی کھائی۔ ہم عیش کرتے رہے۔۔۔۔۔“ اُن کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔ ہنوز سر جھکائے وہ غرارادی طور پر دونوں ہاتھ مل رہے تھے۔ سکیںہ بیگم نے نظریں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ بھی نہیں سمجھ پا رہی تھیں۔

”آپ نے جوانی میں بیوگی کا دکھ اٹھایا۔ کسی نے نہ دیکھا۔ نہائی کا زہر پیتی رہیں۔ کسی کو خبر نہ ہوئی۔ اوہ۔ پروردگار۔۔۔۔۔“ انھوں نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ ”ہم کتنے گنہ گار ہیں۔ آپ کے۔ چاہیں بھی تو پچھلا وقت نہیں لا سکتے۔۔۔۔۔“ وہ قدرے رُک گئے۔

اور پھر جیسے انھیں اچانک یاد آیا۔ ”اور پھر ہیں۔ آپ نے مابعد کو بھی منع کر دیا تھا۔ بر رقت بتا کر وہ ہمیں اس ندامت سے تو بچا سکتے تھے۔ اور۔ اور۔۔۔۔۔ نامہ کو دیکھیں۔۔۔۔۔ اُن کے لہجہ میں تیزی آگئی۔  
ہم سے ہمارا ہی راز چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔“ وہ تاسف سے سر



ہلاتے ہوئے یو لے۔ پھر ایک گہری سانس لی۔

آہستہ۔ آہستہ وہ دوبارہ گویا ہوئے۔ "سلمیٰ بیگم جب تک زندہ تھی۔ ٹھیک ہے چھپائے رکھا۔" وہ دُکھ سے مسکرائے۔ "پھر تو دونوں چل دئے۔ کون بتاتا ہے؟" ایک پل کو خاموش ہو گئے۔ اُداس چہرہ دلی جذبات کا غماز تھا۔ "لیکن ماجد کو چاہیے تھا۔ کہ فوراً ہمیں مطلع کرتے۔ آخر آپ کا اضافہ ہمارے خاندان میں ہو چکا تھا۔ زرین ہمارا خون تھی۔ مگر آپ۔ آپ اُن کو رد کرتی رہیں۔ آپ کو ڈر تھا۔۔۔" وہ کچھ جھجکے۔ "معاف کریں آپ کو خدشہ تھا کہ آپ غریب ماں کی ہیں۔ وہ غریب ہی تھیں نا۔ پر تھیں تو غیرت مند۔ اور ہمارے دل میں غیرت مندوں کے لئے ایک خاص مقام ہے بہت اونچا۔۔۔"

"آپ کو یہ سب ماجد بھائی نے بتایا ہو گا۔" سکینہ بیگم کی قوت گویائی نے ساتھ دیا۔ وہ تو کچھ ادنیٰ سمجھ رہی تھیں۔

چند پل سکھ کے آخری تھے۔ شاید آج۔ انھوں نے سوچا۔ مگر یہ یہ تو دیوتا نکلے۔ سگی بہن کی سوتن کی کتنی حوصلہ افزائی۔ کتنی عزت افزائی کر رہے تھے۔

"ہاں۔ عجیب اتفاق ہوا۔ ہم اچانک ماجد کے یہاں جانا پڑے۔ نامر کچھ عرصہ سے پریشان گم صُم سا نظر آتا تھا۔ ہم سے بھی ملاقات برائے نام ہی ہوتی۔ ہمیں کچھ تشویش ہوئی۔ اس کے ہیڈ کوارٹر سے جب بھی پتہ کیا غائب۔ اُس کے شسرال پوچھتا۔ وہاں بھی نہ ملتا کچھ شلوک۔ کچھ



پریشانی۔ کچھ خوش بختی۔۔۔“ وہ اب بھی نظریں نیچی رکھے دھیرے سے مسکرائے۔ ”ہمیں ماجد کے یہاں لے گئی۔ ناصر کے متعلق ہی لڑچھو کچھ کرنے۔ شاید وہ ہی کچھ تسلی کر دیتے ہماری۔

گاڑی رکتے ہی ہماری نظر سامنے لان میں کرسی پر بیٹھی ایک لڑکی پر پڑی۔ ہمیں دیکھتے ہی جھٹ سر پر دوپٹہ ڈال وہ کوٹلی کے پچھواڑے چل دی۔ ناک نقشہ اتنا مناسب اور خوبصورت تھا لیے بالوں کی خوبصورت لمبی چوٹی تھی۔۔۔“

موصوع سے ہٹتے دیکھ کر سیکنہ بیگم انھیں حیرت سے ٹک لے ہی تھیں۔ ابھی چند لمحے قبل تو وہ اتنے سنجیدہ اور بردبار لگ رہے تھے اور اب۔ کسی لڑکی کا حلیہ بیان کرتے ہوئے۔ دھیرے دھیرے زیر لب مسکراتے۔ خوش خوش بالکل معصوم سے لگ رہے تھے۔

”اس پر وہ سر پر دوپٹہ ڈال۔“ سر پر دوپٹہ ڈال۔“ پر زور دیتے ہوئے اُن کی نظریں اوپر اٹھیں۔ زرین بادانی رنگ کے پھول دار خوبصورت کپڑے پہنے۔ ہمرنگ شفون کا دوپٹہ سر پر جلے دونوں ہاتھوں میں بڑے لئے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ وہ بات کرتے کرتے رگ گئے۔ زرین نے انھیں آداب کیا۔ بڑے میز پر رکھی۔ شاہان احمد نے اٹھتے ہوئے شفقت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

زرین نے برتن میز پر رکھے۔ خالی بڑے ایک طرف رکھی۔ اور شاہان احمد کے آگے۔ چھوٹی تپائی پر خالی پلیٹ رکھ کر گرم گرم کیباب



پیش کرنے لگی۔ لیکنہ بیگم نے دیکھا۔

شاہان احمد اُسے دیکھ دیکھ کر یوں خوش ہو رہے۔ جیسے وہ کئی بہت بڑا خزانہ ہو۔ دونوں کو چائے کی بیالیاں دینے کے بعد وہ باہر نکلی تو۔ شاہان احمد دھیرے سے مسکراتے ہوئے کوٹ کی بائیں جیب میں ڈالے ہاتھ سے شان کے ابھی چند دن قبل وصول کئے گئے خط کو محسوس کرنے لگے۔ جس میں اس نے۔ انھیں مکمل اختیار دے دیا تھا۔ وہ جہاں چاہیں اُس کی بات پکی کر دیں۔ اُسے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔۔۔۔۔ اس وقت کے شاہان احمد کچھ دیر قبل کے شاہان احمد سے بالکل مختلف لگ رہے تھے۔ ”ہاں تو۔ بہن ہم کہہ رہے تھے کہ۔۔۔۔۔“

”جی۔ آپ ماجد بھائی کے گھر جانے کی بات بتا رہے تھے۔“

”ہاں۔ تو۔ سر پر دوپٹہ ڈال جب وہ کوٹھی کے پچھاڑے چلی۔ تو

ہمیں اپنا مدراج بنا گئی۔ اُس کی لمبی ہراتی چوٹی تو۔ وہ سر لائے۔ اب تک ہمارے ذہن میں محفوظ ہے۔ ہاں۔ تو آج کل کی کوئی اور لڑکی۔ ہوتی تو۔ پاس آتی۔ ہمارا تعارف پوچھتی۔ اپنا کرداتی۔ ہمیں اندر۔ بٹھاتی۔۔۔۔۔ خیر پھر چھوٹتے ہی ہم نے ماجد سے پوچھا۔

”کون تھی یہ لڑکی۔ جو ابھی باہر لان میں بیٹھی تھی۔“

”کون۔؟“ وہ چونکے۔

”ابھی باہر لان میں تھی۔ اندر گئی ہے ابھی ابھی۔“

”ہو گی کوئی۔“ معلوم نہیں کیوں ہمیں لگا وہ بتانا نہیں چاہتے۔

پیش کرنے لگی۔ لیکنہ بیگم نے دیکھا۔

شاہان احمد اُسے دیکھ دیکھ کر یوں خوش ہو رہے۔ جیسے وہ کئی بہت بڑا خزانہ ہو۔ دونوں کو چائے کی بیالیاں دینے کے بعد وہ باہر نکلی تو۔ شاہان احمد دھیرے سے مسکراتے ہوئے کوٹ کی بائیں جیب میں ڈالے ہاتھ سے شان کے ابھی چند دن قبل وصول کئے گئے خط کو محسوس کرنے لگے۔ جس میں اس نے۔ انھیں مکمل اختیار دے دیا تھا۔ وہ جہاں چاہیں اُس کی بات پکی کر دیں۔ اُسے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔۔۔۔۔ اس وقت کے شاہان احمد کچھ دیر قبل کے شاہان احمد سے بالکل مختلف لگ رہے تھے۔ ”ہاں تو۔ بہن ہم کہہ رہے تھے کہ۔۔۔۔۔“

”جی۔ آپ ماجد بھائی کے گھر جانے کی بات بتا رہے تھے۔“

”ہاں۔ تو۔ سر پر دوپٹہ ڈال جب وہ کوٹھی کے پچھاڑے چلی۔ تو

ہمیں اپنا مدراج بنا گئی۔ اُس کی لمبی ہراتی چوٹی تو۔ وہ سر لائے۔ اب تک ہمارے ذہن میں محفوظ ہے۔ ہاں۔ تو آج کل کی کوئی اور لڑکی۔ ہوتی تو۔ پاس آتی۔ ہمارا تعارف پوچھتی۔ اپنا کرداتی۔ ہمیں اندر۔ بٹھاتی۔۔۔۔۔ خیر پھر چھوٹتے ہی ہم نے ماجد سے پوچھا۔

”کون تھی یہ لڑکی۔ جو ابھی باہر لان میں بیٹھی تھی۔“

”کون۔؟“ وہ چونکے۔

”ابھی باہر لان میں تھی۔ اندر گئی ہے ابھی ابھی۔“

”ہو گی کوئی۔“ معلوم نہیں کیوں ہمیں لگا وہ بتانا نہیں چاہتے۔



ماجد کا رنگ کچھ بدل سا گیا۔

”اوہ۔ چھوڑیں بھی ماجد صاحب۔ ہم خود پتہ لگالیں گے۔“ ہمارا لب و لہجہ شاید اکھنیں چونکا گیا۔ تھوڑی دیر کچھ سوچتے رہے۔ اور پھر۔ وہ آہستہ آہستہ کہنے لگے۔

”میرا خیال ہے شاہان صاحب۔ آج وقت آ گیا ہے۔ اس راز کو مزید راز رکھنا اب ناممکن نظر آتا ہے۔ یہ لڑکی اپنے یا سرِ علی کی دوسری بیوی سے ہے۔ اپنے ناصر کی بہن ہے۔۔۔۔“

اور ہم۔ ناصر کی مصروفیات جان گئے۔  
”مجھے آپ کا خوف ہے۔ بھائی جان کی فکر تھی۔ کہیں آپ لوگ اُسے ہی مجھ سے نہ لے لیتے۔۔۔۔۔“

”وہی تو لینے آئے ہیں ہم۔“ خالی پیالی میز پر رکھتے ہوئے وہ آرام سے بولے۔

”بخدا۔ بھائی جان! میرا زرین کے سوا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ جس کا خدا ہوا اس کو ایسا نہیں کہنا چاہئے۔ زرین ایک نہ ایک دن آپ کو چھوڑ کر چلے گی ہی۔ سو ہمارے گھر کیوں نہ آ جائے۔ ہمارے شان کی دُہن بن کر۔“

سکینہ بیگم پر تو آج حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹنے کا دن تھا۔ ”ہم آپ سے ندین کو مانگنے آئے ہیں۔ بہن! انکار کر کے ہمیں مایوس نہ کریں۔“ وہ ملیجی نظروں سے سکینہ بیگم کو دیکھ رہے تھے۔



کچھ دیر قبل کاشاندار گاڑی سے اترنے والا شاندار آدمی۔  
اس وقت کتنا عاجز۔ کتنا منکر لگ رہا تھا۔  
وہ کچھ گونگو کی حالت میں تھیں۔

”ہم جلدی کر کے آپ کو برا بھلا نہیں کریں گے۔ آپ بے شک سوچ کر ہمیں مطلع کر دیں۔“ انھوں نے سکینہ بیگم کو تذبذب میں پڑتے دیکھ کر مزید کہا۔ اور جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔  
”اور۔ بہن چند دنوں میں ہمارے آدمی آجائیں گے۔ آپ کو یہاں سے یا سر کے گاؤں میں لے جانے میں مدد دیں گے۔ سردست زرین دہاں شہر ہوسٹل میں چلے گئے۔ امتحانوں کے بعد پھر آپ کے پاس پہنچ چلے گئے۔ یہاں سیکرٹوں میل دور آپ کا یوں لکھے رہنا مناسب نہیں ہے۔ جو ہو گیا۔ سو ہو گیا۔ آئندہ ہم چاہیں گے کہ آپ ہماری نظروں کے سامنے رہیں۔ اپنا گاؤں آباد کریں جا کر شادی وہیں سے ہوگی انشاء اللہ۔“ گیلری کی طرف بڑھتے ہوئے وہ یوں گویا ہوئے۔ جیسے ساری بات طے کر گئے ہوں۔ سکینہ بیگم چپ سی رہ گئیں۔

”ہاں۔ تو آپ ہمیں کب تک مطلع کریں گی۔؟“ وہ رک کر پھر پوچھنے لگے۔

وہ سوچ میں پڑ گئیں۔  
سامد کی بھی بات چل رہی تھی۔ گو کہ انھیں یقین تھا کہ نامر،



شان کو ہی ترجیح دے گا۔ اور پھر ہونا بھی ایسے ہی چاہیے تھا۔  
 شان زیادہ نزدیک تھا۔ رشتے کے لحاظ سے بھی۔  
 مگر۔ وہ مختار کل تو نہ تھیں۔

”وہ۔ اپنے ناصر کو خط لکھوں گی۔ اُس کا جواب آنے پر ہی  
 کچھ کہہ سکوں....“

”خوب۔ بے شک بے شک۔ اچھا بہن۔ ہمیں ایک نظر اپنی  
 بہو کو تو دکھا دیں۔“ وہ بہر حال زرین کو اپنی بہو سمجھنے پر مہر تھے۔  
 اور بے چاری سکیٹہ بیگم کچن کے راستے اُسے باہر صحن سے  
 لے آئیں۔

”ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ۔“ سر پر دوپٹہ ٹھیک کرتی ہوئی وہ  
 سامنے آئی۔ تو اُس کا سر سے لے کر پاؤں تک چمکتی مشتاق نگاہوں  
 سے جائزہ لیتے رہے۔ زیر لب مسکراتے۔ وہ بے اختیار بولے۔  
 ”امتحان میں کتنے دن ہیں۔ بیٹا۔؟“ انھوں نے براہ راست  
 زرین کو مخاطب کیا۔

”جی تقریباً دو مہینے۔“ وہ اُن کے لب دلیم۔ انداز گفتگو  
 سے بوکھلائی سی بولی۔

”اوسو۔ ابھی تو بہت دن ہیں۔“ جیب میں ہاتھ سے محسوس  
 کرتے ہوئے۔ شان کے خط کی موجودگی کی ایک بار پھر تصدیق کر کے  
 وہ بچوں کی سی بے تابی سے بولے۔ ”اچھا بہن۔ خدا حافظ۔ وہ سکیٹہ

بیگم کی طرف مڑے۔

"خدا حافظ" انہوں نے بھی کہا۔

"خدا حافظ بیٹے۔" انہوں نے زرین کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"خدا حافظ۔ انکل۔"

"ناہر ہمیں ماموں جان کہتا ہے۔" انہوں نے تصویر کر دی۔

"خدا حافظ ماموں جان" وہ نام کی بولی۔

کتنے اچھے تھے ماموں جان۔

اتنی نرمی۔ اتنی اپنائیت کا تو وہ اُن سے خواب میں بھی

گمان نہیں کر سکتی تھی۔

"SEE YOU" دروازے سے نکلتے نکلتے وہ پھر سنجیدہ ہو گئے

تھے۔ باوردی ڈرائیور اُن کے بے کار کا پچھلا دروازہ کھولے

مؤدب کھڑا تھا۔

اُن کے پیٹھے ہی دروازہ بند کیا۔ گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ

پر آیا۔ گاڑی اسٹارٹ کی۔

ادر کھلے گیٹ سے باہر لے گیا۔







نوکر چاکر۔ سب انھیں ایک خواب لگ رہا تھا۔

چھوٹا سا گاؤں۔ چھوٹا سا مکان۔ اُن کی والدہ۔ وہ خود۔ چھوٹا سا اسکول  
 سلائی کر رہائی کرتی اُن کی والدہ۔ چھوٹے سے اسکول میں پڑھائیں وہ خود۔  
 یا سر علی کا اچانک آنا۔ بار بار اُن کا اُن کے ساتھ نکاح۔ ڈیڑھ دو  
 سال امید و بیم کی زندگی۔ انتظار کا عالم۔ زرین کی پیدائش۔ یا سر علی کا آخری  
 بار آنا۔ ایکسٹنٹ کی خبر۔ اخبار میں۔ اُن کا بے سرو سامانی کی حالت  
 میں بچی کو لے کر گاؤں چھوڑنا۔ دوسری جگہ اسکول سے ملحقہ کوارٹر میں رہنا۔  
 اور پھر برسوں بعد ناصر کا آنا۔ سب اُن کی نظروں کے آگے کسی متحرک  
 فلم کی طرح یکے بعد دیگرے آتا اور جاتا رہا۔

یہاں سے اُن کی زندگی نے ڈرتے ڈرتے نئی کروٹ لی تھی۔ یا سر علی  
 کے رشتہ داروں نے انہیں قبول کر لیا تھا۔ کوارٹر سے وہ انیسویں میں گئیں۔  
 اور پھر اب۔ اس وسیع و عریض حویلی میں شفٹ کرادی گئی تھیں۔

مانا کہ یہ سب اُن کا حق بھی بنتا تھا۔ مگر نہیں۔ یہ لوگ نہ چاہتے۔  
 ناصر انہیں اپنی ماں کی سوکن اور زرین کو جائیداد کی شریک سمجھ کر بھڑکا  
 دیتا۔ تو وہ اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھیں۔ کسی قانون کا دروازہ غریب  
 کا ہاتھ نہیں کھٹکھٹا سکتا۔

شاہان احمد۔ اپنی بہن کی سوکن اور زرین کو اپنے کلوٹے بھانجے  
 کی جائیداد کی دشمن سمجھ کر نیست و نابود کر دیتے۔ تو شاید کسی کو  
 خبر بھی نہ ہو پاتی۔ !



بے شک اُن کی ادر زرین کی بقدر خدائے برتر نے ہلٹی تھی ناہر  
ادر شاہان احمد کو فرشتوں کی صورت میں بھیج کر۔ وہ ان دونوں کی احسان مند  
تھیں۔ باہر بارن پر وہ چونکیں۔

زرین پہنچ گئی تھی شاید۔ آج جمرات تھی۔ اُس نے ہوسٹل سے آنا  
کھا۔ ڈرائیور صبح کا گیا ہوا تھا اُسے لینے۔ وہ سیدھی ہو بیٹھیں۔  
ایک ایک پل تو گنتی تھیں وہ زی کی آمد میں۔ پہلی پہلی بار جو اُن  
سے الگ ہوئی تھی۔

ادر پھر۔ زی ڈیوڑھی سے لمبا راستہ طے کرتی اُن کے پاس تک  
پہنچ ہی گئی۔ ملازمہ سے چائے کے ساتھ تلنے کو کہہ کر وہ زی کے ساتھ  
صحن میں رکھی کر سیوں پر آکر بیٹھ گئیں۔ شام ہونے کو بھی۔ گرنی خامی تھی۔  
مگر کھلے صحن میں تکلیف دہ نہیں تھی۔

”اتنی ناہر بھائی کا خط آیا ہے۔“ ملازمہ چائے رکھ کر جانے لگی  
تو زینے پوچھا۔

”نہیں بیٹا۔ ابھی تک تو نہیں آیا۔ پتہ نہیں کیا دیر ہے۔“

”مصرف ہوں گے بہت۔“

”ہاں۔ لیکن میں نے بہت ضروری بات لکھی تھی اُسے۔ جواب تو  
دینا چاہئے تھا۔“ پیالی میں چیمہ چلاتے چلاتے وہ کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔  
”کیا پکلی ہے اتنی۔“ وہ حسبِ عادت پوچھنے لگی۔

”مٹر چاول اور سادہ گوشت۔“ کھانا پکانا اور کچن کا انتظام اب بھی

امی نے ہی سنبھال رکھا تھا۔

”پہلے کیوں نہیں بتایا۔ تیار ہی ہے بس۔ روٹیاں پک جائیں کوکھا لینا۔“ امی تند در کی طرف نظر ڈالتے ہوئے بولیں۔  
”ماموں جان آئے تھے۔؟“

”چند دن قبل آئے تھے۔ اور کل سے تو برابر پوچھ رہے ہیں ناھرکتے سب کو۔“

”کیوں۔ برابر کیوں؟“ کیا بکھلتے کھاتے دھڑک گئی۔  
”ماموں نہیں ہیں کیا۔ اور پھر ایسے ویسے ماموں۔“ آخری جملہ جیسے دہ خود سے بولیں۔“ میں نے اتنے فحش اور محبت کرنے والے لوگ کم دیکھے ہیں۔“

یہ تو آپ ٹھیک کہتی ہیں۔“ وہ پھر سے کیا بکھانے میں مصروف ہو گئی۔  
اور سکیئر بیگم زی پر ایک نظر ڈال کر سوچ میں پڑ گئیں۔  
ابنیں زی کی بھی تو رائے لینی تھی۔ اب وہ سمجھ رہی تھی۔ ساجد کو بھی جانتی تھی۔ اور ذیشان سے بھی مل چکی تھی۔ اس کی رہنا تو بہر حال شامل ہونی چاہئے تھی۔

”تمہیں کیسے لگتے ہیں شان بھائی۔؟“ وہ زی کے لئے پیالی میں چائے دانی سے چائے ڈنڈیلے ہوئے دھیرے سے بولیں۔

”بہت اچھے ہیں۔ کیوں؟“

اور زی کے چہرے پر گلابی رنگ بکھر گیا۔ امی نے اُسے بغور دیکھا۔



”بیٹے۔ شاہان بھائی۔ ذیشان کے لئے ہمارا کہہ رہے ہیں۔ تمہا بکھ  
دار ہو۔ اس لئے تم سے ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔۔۔“

انہی بولتی گئیں۔ اور زی کا سر جھکتا گیا۔

کیا بچھوڑ چھاڑ۔ وہ پلیٹ میں آج سے دھیرے دھیرے لیکر  
کھینچتی گئی۔ چہرے پر سوتلی دور گئی تھی۔ اور نظریں اوپر اٹھنے کا نام  
نہ لیتی تھیں۔

انہی کے کچھ غرہ قبل کے دوسرے کو تقویت مل گئی۔

”اور ساجد کے لئے ماجد بھائی اور ان کی بیگم کی بات بھی تمہارے  
سنی ہوگی۔ وہ تو تمہارے سامنے بھی کہہ رہی تھیں۔ ناصر نے انہیں اپنی  
والہی کے انتظار کا کہہ رکھا ہے۔ اگر ہی جواب دے گا۔

”کیا جواب۔؟“ وہ سب بھول بھال۔ سر جھکا کر ہر سال  
سی پوچھنے لگی۔

”ہاں۔ یا۔ نہیں۔“

”نہیں۔ ساجد تو میرے بھائی ہیں۔“ اور انہی اُس کے معصومیت  
سے کہنے لگے انکار پر زیر لب مسکرائیں۔

”اور ذیشان۔؟“

زی نے ایک نظر انہی کی طرف دیکھا۔

چہرہ ایک بار پھر سُرخ ہو گیا۔

پلکیں ایک بار جھلکیں۔ اور۔

تو جی بھی ماموں جان اُسے ہر بار معنی خیز نظروں سے دیکھتے چلیچلتے  
اور زیر لب مسکراتے رہتے۔

اور پھر اُسے اتنی کی ضروری بات نامہر کھائی کو لکھنے کا بھی اندازہ  
ہو گیا۔ اور۔ کل سے برابر ماموں جان کا فون پر نامہر کھائی کے جواب  
کے بارے میں پوچھنا بھی سمجھ میں آ گیا۔

اور پھر۔

کھانا کھاتے کھاتے اُسے بھی تشریش ہوئی۔

نامہر کھائی کا خط ابھی تک نہیں آیا تھا۔ پتہ نہیں کیا  
وجہ تھی۔ ؟



دن کے گیارہ بج رہے تھے۔

زرین کمروں کی صفائی میں لگی تھی ملازمہ چھارٹ پونچھ تولیتی تھی روز  
مگر زرین کو تسلی نہ ہوتی تھی۔ چھٹی کے روز ضرور کو نہ کو نہ جھارتی تھی۔  
سکینہ بیگم ضروری کاموں سے نمٹ کر برآمدے میں تخت پر آ بیٹھی تھیں  
وہیں میٹرپوسٹ میں لیٹی زرین کی یونیفارم کی شرٹ تھی۔ ایک سا کالا دھڑا  
تھا۔ اور دوسری کے بٹن غائب تھے۔ نکال کر درست کرنے لگیں۔

”بیگم صاحب! بڑے صاحب کا ٹیلی فون ہے“ ملازمہ نے کمرے میں  
سے باہر آتے ہوئے بتایا۔

قمیض چھوڑ چھاڑ دہ اندر کی طرف لپکیں۔

”ابھی ابھی ناصر کا فون آیا ہے۔ کل پاکستان پہنچ رہا ہے۔“

شاہان احمد اکھنڈ خوشی خوشی بتانے لگے۔

”شکر ہے اللہ کا۔ خیریت تو ملی۔ نہ کوئی خط ڈالا تھا۔ نہ خیریت کی

اطلاع کی تھی جب سے گیا تھا“ سکینہ بیگم ہنسا ہوتے ہوئے بولیں۔

”کہتا تھا۔ آپ کو ٹیلی گرام دیا ہے۔“

”ہمیں تو کوئی نہیں ملا۔“

”شاید آج مل جائے۔ بہر حال میں کل ایئر پورٹ پر اُسے لینے جا رہا ہوں۔ آپ کے پاس آئیں گے تو باتیں ہوں گی۔ پھر اچھا خدا حافظ۔“

”خدا حافظ۔“ اور پھر سلسلہ منقطع ہو گیا۔

”زی۔ زی کہاں ہو۔؟“ وہ اندر کمروں میں اُسے ڈھونڈنے لگیں۔

”یہاں اتنی سیاتھروم میں ہمار ہی ہوں۔“ وہ پاس ہی اپنے کمرے کے غسل خانے سے بولی۔ اتنی پلٹ کر وہاں آگئیں۔

”ناصر آرہے کل۔ شاہان بھائی کا فون آیا ہے۔ ابھی ابھی۔“

”اوہ۔ اچھا۔ تو پھر شام کو میں نہیں جاؤں گی ہوٹل۔ کل کی میری چھٹی۔۔۔۔“ وہ دس سے خوشی خوشی بولی۔

”میں بھی ہی کہنے والی تھی۔“

واپس آکر انہوں نے سلامتی کا کام دوبارہ نکال لیا۔ ساتھ کام میں لگے تھے۔ مگر ذہن مختلف سوچوں کی اوجھار بنا ہوا تھا۔ ابھی باہر گھنٹی بجی۔

تھوڑی ہی دیر میں بیگم ماجد و ماجد صاحب دونوں ڈیوڑی سے اندر داخل ہوئے نظر آئے۔ کتنے پر خلوص دوست تھے انہوں نے سوچا۔ اور اب تو ایک اور آس بھی لگائے بیٹھے تھے وہ۔

قریب ہی کپڑوں پر استری کرتی ملازمہ کو چائے بنانے کا کہہ کر خود وہ کام ایک طرف بڑا آدے کی سیڑھیاں اُترتی وہ اُن کی پذیرائی کو برٹھیں۔



وہی مطالبہ تھا۔ وہی ناہر کا انتظار۔ وہی امید و بیم کی کیفیت۔  
 ”ہماری بیگم تو پل پل گن رہی ہیں۔ ناہر کے آنے کے۔“  
 ”ارے ہاں۔ ابھی ابھی شان بھائی کا فون آیا تھا ناہر کل پہنچ رہا  
 ہے۔ میں تو بتانا ہی بھول گئی۔“

”واقعی۔“ بیگم مجاہد خوش ہوتے ہوئے بولیں۔

”ہاں۔ بھابی جان۔“

”کل کس وقت پہنچ رہا ہے۔؟“

”شام کو۔“ انہوں نے بتایا۔

”بس تو ہم بھی آجائیں گے“ وہ جلدی سے بولیں۔

”سر آنکھوں پر۔“ اتنی نے کہا۔

”دیے تو ضرور آؤ۔ لیکن مجاہد والی بات کل نہیں برسوں آکر کریں گے۔“

تسلی سے۔ کل تھکا ہوا ہو گا ناہر۔“ مجاہد صاحب نے کہا۔

”میں مجاہد ہی کئی بات کے لئے آرہی تھی کل شام کو۔“ تو پھر برسوں

ہی آئیں گے۔ تسلی سے بات چیت ہو گئی۔ کل شام تو وہ تھکا ہوا پہنچے گا۔

آرام کر لینے دوں سے۔ برسوں آئیں گے انشاء اللہ۔“

اور سلینہ بیگم کی غیب کی حالت تھی۔ یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا تھا کہ  
 زرین کی قسمت کہاں لکھی تھی۔ مگر یہ لوگ تو بہت اس لکائے بیٹھے تھے۔  
 کہیں انکار ہوا تو کتنا دکھ ہو گا انہیں۔؟

زرین چلائے کر آگئی تھی۔ اپنائیت بھری گفتگو کے دوران سب نے



چائے پی۔ دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھایا گیا۔ اور پھر کچھ دیر اور ٹھہر کر  
 ماجد صاحب جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”بھابی جان! اب اجازت  
 دیں پرسوں حاضر ہوں گے۔“

”بھری دوپہر میں اس قدر گرمی میں کہاں جائیں گے۔ بھائی جان۔!  
 شام تو ہو لینے دیں۔ کچھ تو شدت کم ہو گرمی کی۔“ سکینہ بیگم بولیں۔  
 ”پھر رات بہت ہو جاتی ہے پینچتے پینچتے۔ اب اجازت دے ہی دیں۔  
 بھابی جان۔“ بس آپ ہماری مراد پوری کر دیں۔ آنا جانا تو لگتا ہے گا۔“  
 بیگم ماجد بھی اٹھتے ہوئے بولیں۔

شام کے بعد چائے کے پھر انہوں نے زرین کی قیمن نکال لی۔  
 کل ہی کچھ نہ کچھ فیصلہ ہو جانا تھا۔ کام کرتے ہوئے پھر ان کا ذہن  
 اُس طرف چلا گیا۔ نامہ نے ذیشان کے متعلق ان کے خط کا جواب کیوں نہیں  
 تھا۔ کیا اُس کے ساتھ زرین کا رشتہ نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو بہت  
 اچھا تھا، اُس کا ماموں زاد بھی تھا۔ پھر؟ کہیں۔ کہیں ایسا تو نہ تھا۔  
 کہ وہ زی کو اُس کے قابل نہ سمجھتا تھا۔

نہیں۔ نہیں۔ انھیں اس خیال پر کبھی نزاعت ہوئی۔ ناصر ایسا نہیں  
 تھا۔ وہ تو سگی اولاد سے بڑھ کر تھا۔ کہیں بڑھ کر۔ کوئی اور وجہ ہوگی۔  
 مصروفیت بھی تو ہو سکتی ہے۔ باہر ایک بار پھر گھنٹی ہوئی۔  
 ”جاؤ۔ دیکھو کون ہے؟ چائے کی ٹرے لاتی ملازمہ سے ٹرے  
 ہاتھوں میں تھام کر انہوں نے اُسے بھگا دیا۔ اور پھر تھوڑی ہی دیر میں



وہ تار کا لفافہ لئے آگئی۔

”ڈاک خانہ کے بابو تھے کہتے تھے جھٹی تھی پر کال لایا کہ بیگم صاحب کا ضروری پیغام ہو گا۔ باتو فی ملازمہ انہیں لفافہ نکھاتے ہوئے بولی۔  
ناھر کا ہو گا۔ انہوں نے سوچا۔ جلدی سے کھول لیا۔ ناھر کا ہی تھا۔  
کل پہنچ رہا تھا۔ ”ٹیلی گرام کس کا ہے۔“ ”زرین کی نظر شاید اندیکرے  
سے ہی پڑ گئی تھی۔ قریب آتے ہوئے پوچھنے لگی۔  
”ناھر کا ہے۔ کل پہنچ رہا ہے۔“ انھوں نے لفافہ اُسے دیتے  
ہوئے خوشی خوشی بتایا۔

”ادہ شکر ہے۔“ وہ جلدی جلدی تار کے مضمون پر نظریں دوڑانے  
لگی۔ ”اچھی طرح پوچھوں گی۔ جا کر غیریت کے دو لفظ تک نہ لکھے۔“  
”مصرف ر ہا ہو گا بے چارہ۔“ انی نے ناھر کی تائیدی۔ باقی کا  
وقت دونوں ماں بیٹیاں پروگرام ہی بناتی رہیں۔

کل رات کے کھانے پر ظاہر ہے شاہان احمد بھی وہیں ہوتے۔ شاید  
ذیشان بھی ہوتا۔ اُن کے نوکر چاکر بھی ضرور ہوتے تھے۔ اور پھر ناھر  
بھی تو آ رہا تھا ساتی دور سے۔ کتنا خوش ہو گا دیکھ کر۔ کہ اُس کے ماموں  
نے خلاف توقع انھیں ہاتھوں لے لیا تھا۔

اگلے دن صبح سے ہی گھر میں کہا گئی تھی۔ انی اور زرین سارا وقت  
مصرف رہیں۔ حویلی کی صفائی کر دانی۔ رات کے کھانے کے لئے ملازموں  
کی مدد سے کسی طرح کے کھانے تیار کروائے۔ مشکل سے تین بج کر سیدھی کی



اور پھر کام میں لگ گئیں۔ زرین برابر مدد دے رہی تھی۔ اتنی محسوس کیا۔ وہ بے انتہا خوش تھی۔ تبھی گیٹ پر ہارن ہوا۔ زرین کا دل بے ترتیبی سے دھڑک اٹھا۔ شاید شان بھی ساتھ ہو۔ کیسا بے مروت تھا۔ مگر کبھی نہیں لی تھی۔ کیسے بڑے بڑے دعوے کر رہا تھا جب آخری بار ملا تھا تو۔

مگر پھر ایک دلنشین مسکراہٹ اُس کے خوبصورت لبوں پر چھا گئی۔ ماموں جان کو رام بھی تو اُسی نے کیا تھا۔ شان کو پیار نہ ہوتا اس سے تو شاید۔ ان لوگوں کو ماموں پوچھتے بھی نہیں۔ ڈیوڑھی میں شور ہوا تو وہ کمرے سے باہر نہیں آئی۔ ناہر سے پیٹ جانے کو دل چاہتا تھا۔ مگر۔ شان کا سامنا۔ جو اتنے دن بعد اور اتنے سارے لوگوں کے سامنے نہیں کر پاری تھی۔

وہ کھڑکی کے پرٹ میں سے دیکھتی رہی۔ اور۔ پھر وہ بھجھ کر رہ گئی۔ صرف ناہر اور ماموں جان ہی اندر داخل ہوئے تھے۔ شان نہیں تھا۔ "تو ابھی سے چھپنے لگی ہے تو۔" اچانک ناہر نے پیچھے سے آکر اسے پہلو سے لگاتے ہوئے شرارت سے کہا۔ زرین سُرخ ہو گئی۔ "بھیا۔" اُس کے بازو بھی اُس کے گرد لپٹ گئے۔ "میں آپ سے بات نہیں کرتی۔"

"کیوں؟ فوراً وہاں سے" ہاں "ہیں لکھدی اس لئے۔"

"چھوڑیں بھیا۔ یہ کاریاں کرتے ہیں۔ آپ نے اپنی خیریت کی دُور



سطر تک نہ لکھیں۔ ہم لوگ اتنے پریشان رہے۔

"بہت کام تھازی۔ واقعی وقت نہیں ملا۔ اور پھر اتنی کے خط کا جواب  
درا۔۔۔۔۔" جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑتے ہوئے وہ مسکراتے رہا۔

"بس کریں اب۔ میں خیریت کے خط کی بات کر رہی ہوں۔

"اچھا لڑو بعد میں۔ اب آؤ۔ سب ماموں جان کے ساتھ بیٹھتے ہیں۔

چل کر۔" اور پھر سبھی ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گئے۔ "شان کہاں ہے  
ماموں جان۔؟" سکولیش پلٹے ہوئے ناہرے پر چھا۔

"کل تک تو وہیں پہاڑ پر تھا۔ کنٹرکشن کے سلسلے میں۔ رات گاؤں آیا  
تھا۔ آج ہم نے کہا ایئر پورٹ پر ساتھ آنے کو۔ ٹال گیا۔ ہمیں اُس کی مصروفیت  
اور اس کا عادت کا پتہ ہے۔ پہلے کام۔ پھر کچھ اور۔ آج واپس گیا ہو گا۔

زرین کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ مگر ناہرہ دھڑکے سے مسکرا دیا۔ شان  
کی مصروفیت اور عادت کی بات تو درست تھی۔ پر اصل وجہ کچھ اور تھی۔  
اس کا مطلب تھا شان کو ابھی تک کچھ معلوم نہیں تھا۔ نہ ائی اور نہ زرین  
کے بارے میں۔ نہ ہی یہ کہ ماموں جان نے جوڑی اس کے لئے پسند کی ہے  
وہ زرین ہی ہے۔

ندین آہستہ سے اٹھ کر وہاں سے چل دی۔ "میں ذرا کھانا دیکھ  
آؤں۔" سکینہ بیگم بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"شان کو ابھی تک یہ علم نہیں ہے۔ کہ ہم نے جوڑی اُس کے لئے پسند  
کی ہے۔ وہ یا سرغلی کی دوسری بیوی سے ہے۔ یا تمہاری بہن سے ہے۔ وہ بہت

ڈکٹیٹوری طبیعت کا ہے۔۔۔۔۔ ہر بات میں REASON ڈھونڈتا ہے۔  
عین وقت پر گرہ بڑ کر سکتا تھا۔ پھر ابھی کچھ غرصہ قبل۔۔۔۔۔ شاہان احمد صوفی  
کی پشت سے سرٹکے آہستہ آہستہ نافر کو بتا رہے تھے۔

یہ بات وہ سکینہ بیگم کے سامنے نہیں کرنا چاہتے تھے۔ نافر کو ہی  
بتا سکتے تھے۔ اُن کا۔ شان کا۔ نافر کا۔ راز ایک ہی ہو کرتا تھا۔

”بقول اُس کے اُسے ایک لڑکی پسند آگئی تھی۔ اور وہ اُسی۔ سے  
شادی بھی کرنا چاہتا تھا۔ ہمیں لکھ بھیجا۔ تب تک ہم زرین کو اُس کے لئے  
پسند کر چکے تھے۔ ہم نے سختی سے انکار کر دیا۔“ وہ قدر کے۔ تھوڑی دیر  
سوچتے رہے۔ پھر سیرھے ہو بیٹھے۔

”سمجھ دار ہے۔ ہر اد پنچ پنچ سمجھتا ہے۔ کافی انیشی جینٹ ہے۔  
I MOST SAY۔ پہلی بار ایک لڑکی کو پسند کیا ہے۔“ شادی کا فیصلہ کیا  
تھا تو سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا۔ ہمیں کچھ فوس بھی ہوا اپنی سختی پر۔ مگر یہ  
سوچ کر کہ زرین ہر لحاظ سے بہتر ہے۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اپنے  
یا سر علی کی بیٹی ہے، اپنا خول ہے، یغروں میں نہ جانے پائے۔ ہم اپنے فیصلے  
پر مطمئن ہیں۔ جوانی کی بات ہے۔ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا سب۔۔۔  
سردست ہم نے اُسے کچھ نہیں بتایا۔ یہی کہا ہے کہ ہمیں ایک لڑکی اُس کے  
لئے پسند آئی ہے اور بس۔ صرف ماما اور کریم ہی اس راز سے واقف ہیں۔  
ہم نے انہیں بھی تاکید کر دی ہے۔ کہ شان کو غلم نہ ہونے پائے۔ ہم چاہتے ہیں کہ  
یہ راز ہم خود اُس پر عیاں کریں۔ نی الحال تم بھی ذکر نہ کرنا۔ دیکھتے ہیں۔ بات



ہو جائے گی تو.... پھر.... ہم خود اسے بتائیں گے۔ حقیقت تسلیم کر ہی لے گا.... آہستہ آہستہ۔“

ماموں جان کتنے عظیم تھے۔ کچھ عرصہ قبل اُس نے کتنا غلط سوچا تھا۔ اُن کے متعلق۔ جھکا سر اٹھا کر اُس نے اس غلوں والی سائیت پیکر کو دیکھا۔  
”سوچنا کیا ہے ماموں جان آپ ناصر کا سر مانگ کر دیکھیں اُس کا سب کچھ آپ کا ہے۔“

”ناصر بیٹے۔ انہیں سلی بیگم یاد آگئی۔ اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اُداس سے بولے۔“ تم نے یا سر علی کی بیوہ اور اُس کی بیٹی کو تحفظ دیکر ہمارا سر فخر سے ادبجا کر دیا ہے ہمیں تم پر فخر ہے۔“ اُن کا لب و لہجہ ان کی اندرونی کیفیت کا آئینہ دار تھا۔

”اور زرین کو شان کے لئے لینے پر مجھے ڈر ہے۔ میں اپنے ماموں پر مغرور نہ ہو جاؤں۔“ ناصر نے اُن کا ہاتھ عقیدت سے اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔  
”جاؤ۔ اپنی والدہ کو بلاؤ۔ ہم انہیں یہ خوشخبری خود سنائیں گے۔“  
ناصر اٹھ کر چل دیا۔ اور شاہان احمد نے دوبارہ سر صوفہ کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں بند لیں۔ اس وقت اُن کے جذبات ملے جلے تھے۔  
انہیں اپنی مرحومہ بہن بھی یاد آرہی تھی۔ مگر ساتھ ہی جو ذمہ داری یا سر علی اپنی زندگی میں نہ نبھاسکے تھے۔ اُس کا امداد کرنے پر مطمئن بھی تھے۔  
زرین بذاتِ خود ان کے دل کو بھاگتی تھی۔

اور آج وہ شان کے لئے اپنی مرضی کی لڑکی سے بات چلی کر گئے تھے وہ یقیناً خوش تھے۔



ہاتھ بڑھا کر انہوں نے میرے گلاس اٹھایا۔ اور سکولش کا آخری گھونٹ بھی پی لیا۔

”بہن مبارک ہو۔ ندین ہماری ہو گئی“ سکینہ بیگم کے اندر آنے پر وہ تعظیماً اٹھتے ہوئے بولے۔ ”آپ بھی منہ میٹھا کریں“ گلاس میں سکولش انڈیل کر انہوں نے انہیں تھما دیا۔ سکینہ بیگم نے ایک لمحہ کو ناصر اور پھر شاہان احمد کو دیکھا۔

”آپ کو بھی مبارک ہو شاہان بھائی۔“ آخر انہوں نے کہا۔ اور۔ گلاس میں سے گھونٹ پی لیا۔

رات کو شاہان احمد۔ ناصر اور سکینہ بیگم نے مل کر پرتکلف کھانا کھایا۔ رزین نے ساتھ نہیں دیا۔

اندھیرے میں ادھر چھت پر کھڑی۔ سامنے کچے پکے مکانوں میں ہلتی بٹیوں پر نظریں جملے جانے کیا کیا سوچتی رہی۔

جمعہ کا دن تھا۔ صبح کے دس بج رہے تھے۔ مختصری تیاری مکمل تھی۔

ناصر کے یہاں آنے کے بعد شاہان احمد اپنے ضروری کاموں میں مصروف ہو گئے تھے۔ دوبارہ جا نہیں سکے تھے۔ فون پر ہی آج کا مبارک دن منگنی کی انگوٹھی پہنانے کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔



بڑے سے پورچ میں اُن کی سیاہ درسیڈیز اور پھر جیب یکے بعد  
دیگر جانے کے لئے تیار کھڑی تھیں۔ وہیں گاڑی کے پاس اُن کا مستعد  
بادردی ڈرائیور منتظر کھڑا تھا۔

شاہان احمد، ماما اور کریم بابا نے کار سے جانا تھا۔ جب کہ چند معتمد  
ملازموں نے مٹھائی کے ٹوکڑے اور باقی لوازمات اپنی ہمراہی میں جیب میں  
لے جانے تھے۔ شاہان احمد حسب معمول قیمتی لباس میں ملبوس تھے۔

کریم بابا شان کے ساتھ پہاڑ پر بخار ہو جانے کی وجہ سے نہ جانے  
تھے۔ مگر اس وقت بادانی رنگ کی بھاری شلوار پر قمیض اور نئی سیاہ  
ڈاسکٹ پہنے۔ سر پر نئی چمکتی کالا اور لٹکی سجائے تیار کھڑے تھے۔ اور ماما  
سبز رنگ قیمتی جلمکاتا جوڑا پہنے۔ گونا گونا ہمرنگ دوپٹہ سر پر لئے سفید پراں  
برقعہ پہنے نقاب پلٹائے وہیں کھڑی تھیں۔ مٹھائی کے بڑے بڑے کئی  
ٹوکڑے رنگدار کاغذوں سے ڈھکے گٹوں سے بندھے پاس ہی رکھے تھے۔  
”بسم اللہ“ کہہ کر شاہان احمد آگے بڑھے۔ ڈرائیور نے مستعدی سے  
اُن کے لئے اگلا دروازہ کھول دیا۔

پچھلی سیٹ پر کریم بابا کے ساتھ چھپاتی ماما جھلملا دوپٹہ سنبھالتی  
بیٹھنے لگیں تو۔ مدیر اور بارعب شاہان احمد زیر لب مسکرا دئے۔

بیٹھنے سے قبل۔ انھوں نے اپنی رائفل سے یکے بعد دیگرے فضا میں  
کئی فائر کئے۔ ادویوں اپنے روائتی انداز میں اپنے بیٹے کی سنگنی کا اعلا  
کرتے ہوئے گاڑی میں جا بیٹھے۔

گاڑی کو حرکت ہوئی۔ اور آہستہ آہستہ حویلی کی فصیل کے ساتھ ساتھ  
چلتی بھری کی سڑک پر ہوئی۔ جیپ ڈرائیور نے بھی تقلید کی۔ اور یوں یہ  
چھوٹا سا قافلہ۔ اپنی منزل مقصود کی طرف روانہ ہوا۔  
”ماما۔ ہماری بہو دیکھو گی تو داد دو گی ہماری پسند کی۔“ چہرے پر  
لازوال خوشی لئے شاہان احمد گو یا ہوئے۔

”وہ تو مجھے اب بھی انداز ہے بڑے صاحب۔ لاکھوں میں پسند  
کی ہو گی آپ نے۔“ وہ برقعے کا کریم بابا کی طرف گھونگھٹ کرتے ہوئے  
بولیں۔ شاہان احمد کے لب ایک بار پھر متبسم ہو گئے۔  
ناظم سبے پردہ۔ ہارون سے کوئی حجاب نہیں۔ نذیر اور مجید کو  
گالی گلوچ۔ ایک بے چارہ بوڑھا کریم ہی رہ گیا تھا۔ پردہ کرنے کو۔  
گاڑیاں سروسوں کے پہاڑاتے کھیتوں کے بیچوں بیچ سرسئی سڑک پر  
ایک دوسرے کے آگے پیچھے درمیانہ رفتار سے چلی جا رہی تھیں۔  
معا کریم بابا کی نظر نیچے گری اپنی نسوار کی ڈبیہ پر پڑی۔ قدیم  
پرے تھی۔ ماما کے پاؤں کے پاس۔ ہاتھ بڑھا کر اٹھانے لگے۔  
”ادئی اللہ۔ موا بدھا۔“ ماما یوں جھٹ منہ پر نقاب ڈال۔  
دور سے ہونے کھڑکی سے جا چکیں۔ جیسے خود سولہ سالہ کنواری ہی تو ہوں۔  
گھبرا کر کریم بابا نے ہاتھ فوراً پیچھے کر لیا۔  
شاہان احمد دھیرے سے مسکرا دئے۔

جوانی کے عاشقوں میں سے کریم بابا کا ایک عاشقہ ماما کے



ساتھ مشہور تھا۔ گو کہ اس معاشرے کا اقرار آج تک ماما نے کبھی  
کیا نہیں تھا۔

گاڑی چلتی رہی۔ کریم بابا نے ایک نظر عقب میں دیکھا۔  
جیب کافی پیچھے رہ گئی تھی۔ واپس رخ موڑ کر کھڑکی میں سے  
باہر دیکھنے لگے۔

دقت گذرتا رہا۔ اور کریم بابا کی سواری کی طلب بڑھی رہی۔  
مزید صبر نہ کر سکے۔ رخ اندر کی طرف کر کے ڈرتے ڈرتے اہولہ نے  
پھر ہاتھ بڑھایا۔

شومی قسمت۔ اُن کا ہاتھ ڈیبہ کے ساتھ ساتھ ماما کے  
پاؤں سے جا لگا۔

"ہائے بکھت! ہوش کی دو اکریں ماما زور سے اُچھلیں۔  
"کیا ہوا۔؟" سامنے سڑک پر نظریں جمائے شاہان احمد نے  
اُن سے پوچھا۔

آج تو شاہان احمد بھی ان دونوں کی نوک جھونک سے محفوظ  
ہو رہے تھے۔

دلی آرزو کی تکمیل ہو جانے کا احساس ہو رہا تھا شاید۔  
"میں اس کم بخت کا سامنا ہی نہیں کرتی۔ آج خوشی کا موقعہ تھا۔  
اس لئے ساتھ بیٹھ گئی۔ دردہ....." ماما نے گھونگھٹ میں سے قدرے  
جھانک کر کریم بابا کو دیکھا۔



اور۔ شاہان احمد پھر دھیرے سے مسکرا دیئے۔

"کریم۔ تم ایک بار قبل بھی ماما کو اس کے کوارٹر کی دیوار پر سے جھانکے تھے۔" شاہان احمد کا لہجہ اب بھی بارغیب تھا۔  
 "میں نے کھینچ کر جوتی ماری تھی۔ اس کے منہ پر۔" وہ اس وقت بھی جوتی اتارنے لگیں۔

"ارے۔ بس۔ بس۔۔۔" کریم بابا ہاتھ سے اُن کا واروکتے ہوئے۔ "سوار دبا کے منہ سے بول پڑے۔" وہ تو چالیس سال پہلے کا واقعہ تھا۔

اور شاہان احمد کھڑکی کی طرف رُخ کرتے ہوئے آہستہ سے ہنس دیئے۔

یوں ہی نوک جھونک کرتے۔ محظوظ ہوتے یہ لوگ اپنی منزل کی طرف رداں رداں تھے۔



سادہ سا انتظام تھا۔ باہر سے کسی کو نہیں بلا یا گیا تھا۔ بات ہی تو پکی کر لی تھی۔ صرف شاہان احمد اور ماما آپسے تھے گاؤں سے۔ مگر اس کے باوجود۔  
 سکینہ بیگم بوکھلائی بوکھلائی سی تھیں۔ زرین اپنے کمرے میں تھی۔ اور ناصر۔  
 لائبریری میں چوڑی سی کھڑکی کے پاس آرام چئر پر بیٹھا کوئی کتاب دیکھنے میں  
 مگن تھا۔ تبھی ہارن کی آواز پردہ چونکا۔

نظریں اٹھا کر کھڑکی میں سے دیکھا۔ دور پکی سڑک پر سے شاہان احمد کی  
 کار حویلی آنے والی پتھریلی سڑک پر ہوئی تھی۔

کتاب چھوڑ چھاڑ دہ ان کی پیشوائی کے لئے پیکا۔ ڈیوڑھی کے پاس  
 پہلے شاہان احمد کی گاڑی اور پھر آکر رُکے۔ اور پھر شاہان احمد کو گاڑی سے  
 اتارتے ہوئے اُس کی نظر پچھلی سیٹ پر ماما اور کریم بابا پر پڑی۔

حلق سے اُبلتا ہتھہ بمشکل روکے۔ وہ تینوں کو اندر لے گیا ڈرائنگ روم  
 میں بٹھایا۔ پھر مٹھائی کے ٹوکے اتارے گئے۔ ملازمین کو بٹھایا گیا۔

دستور کے مطابق شہد علی شربت سے سبکی و افصح کی گئی۔ "جاؤ۔  
 ماما زرین بیٹی کو انگوٹھی پہنا دو۔" شاہان احمد بولے: "ماما اب۔۔۔ بھی  
 گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی تھیں۔ کریم بابا جو موجود تھے۔

نامر سنی بمثل قابو کئے ہوئے کہا تھا۔ ماموں کا ادب ملحوظ خاطر تھا ورنہ  
تمہارے لگا لگا کر درو دیوار ہلا دیتا۔

ماما بیبی ٹولتیں۔ انگوٹھی کی ڈبیہ نکالنے لگیں اور پھر سکینے بیگم کی  
ہمراہی میں زرین کے کمرے میں آگئیں۔ زرین ہلکے آسمانی رنگ کے سادے  
سوٹ میں ملبوس صوفے پر بیٹھی کوئی راستہ بھولی آسمان سے بھٹکی ہوئی  
حور لگ رہی تھی۔ اتنی اور ماما کو دیکھتے ہی سمیٹے سکرٹے ہوئے اُس نے  
سر جھکا لیا۔

”میں صدف جاؤں“ ماما برقعہ لپیٹ۔ ایک طرف رکھ اُس کے پاس  
ہی صوفے پر بیٹھ گئیں۔ ”میں بھی کہتی تھی بڑے صاحب غلط بات نہیں کرتے  
واقعی حور پسند کی ہے۔ اپنے شان بیٹے کے لئے۔“

چند لمحہ وہ اُسے یک ٹک دیکھے گئیں۔ سکینے بیگم پاس ہی کھڑی تھیں۔  
”بیگم صاحب۔ مٹھائی منگوائیں“ ماما جیسے ہوش میں آکر بولیں۔  
مٹھائی آگئی۔ سکینے بیگم چپ سی بیٹھی ہوئی تھیں۔

پتہ نہیں کیوں۔ اچھی طرح معلوم ہونے کے باوجود بھی کہ بیٹی نے ایک  
ایک ہر درد دوسرے گھر جانا ہے۔ اس وقت جیسے کوئی ان کا دل ٹٹھی میں لئے  
ہوئے تھا۔ شاید اس لئے۔ کہ آج کے بعد وہ اُن کی نہ رہی تھی۔ قسمت میں  
خوشی ہوئی تو ٹھیک۔ ورنہ ماں کتنی بے بس ہو جاتی ہے۔ بیٹی کی زندگی  
کے اس موڑ پر آکر۔

”پروردگار! میری زرین کو سدا خوش رکھنا۔“ ماما بسم اللہ کہہ کر ڈبیہ کھولتے



ہوئے انگوٹھی نکالنے لگیں۔ تو سکیٹہ بیگم جلدی سے بول پڑیں۔ گویا یہی وقت تھا۔ یہی چند لمحے زرین کے مزید ان کے اپنے تھے۔ انگوٹھی پہن لینے کے بعد وہ کسی اور کی ہو جاتی تھی۔

ماما نے زرین کا دایاں ہاتھ تھاما۔ نرم سا نازک خوبصورت ہاتھ۔ اور سکیٹہ بیگم اُس کی خوشیوں کے لئے دعاؤں کا ورد کرنے لگیں۔  
 ماما نے بھی اُس کی خوشیوں اور شان کے ساتھ پھلتے پھولنے کی دعاؤں کے ساتھ شان کی والدہ کی پیروں جڑی انگوٹھی اُس کی انگلی میں پہنا دی۔  
 ”مبارک ہو بیگم صاحبہ۔ مبارک ہو بیٹیا“ ساتھ ہی پلیٹ میں سے لڈو اٹھا کر انہوں نے زرین کے منہ کی طرف بڑھایا۔ ”منہ میٹھا کر بیٹیا“  
 زرین نے تھوڑا سا لیا۔ تو وہی لڈو ماما نے سکیٹہ بیگم کی طرف بڑھایا اور اٹھوڑے بھی لے لیا۔ تو باقی کا لڈو ماما نے اپنے منہ میں ڈال لیا۔  
 ”اللہ جوڑی سلامت رکھے“

اور ماما۔ صوفے سے اٹھ کر وہیں چھا چھمنا چنے لگیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی زرین کو ان کے سبز جھلملاتے جوڑے۔ گوٹ لگے دوپٹے۔ چمکیلے زیورات اور قص کے انداز پر ہنسی آگئی۔ فوراً امر گھنٹوں میں دسے کر مسکرا دی۔ اور سکیٹہ بیگم۔ اپنی بھر آئی آنکھیں دوپٹے کے پلو سے پوچھتی مسکرا دیں۔  
 اور پھر ناہر نہ آکر۔ ماما کے دونوں ہاتھ تھام کر خوبصورت STEPS لینے شروع کئے تو سکیٹہ بیگم ہنسے بغیر نہ رہ سکیں۔

”یہ بتائیں ماما۔ آج کریم بابا کے ساتھ کیسے آنا ہوا۔؟“ رک کر ناہر بڑی



دیر کی رو کی بات زبان پر لے ہی آیا۔

”اے موابڈھا۔ میں بھلا اُس کے ساتھ کیوں آنے لگی۔ میں تو اپنے بڑے صاحب کے ساتھ آئی ہوں۔“ وہ زرین کے ساتھ صوفے پر بیٹھتیں پھولی سالنوں کے درمیان بولیں۔

”یہ جوڑا۔ یہ لشکارے۔ بڑے صاحب بچارے کس لئے کون پہنتا ہے۔“ وہیں کھڑے کھڑے ناہرنے کہا۔

”اے ہرٹ ساروں کی۔ یہ تو شان بیٹے کی منگنی کے لئے بڑے صفا نے بنوائے ہیں خاص طور سے۔“

”آنکھ تو نہیں ماردی تھی راستہ میں بابا نے۔ ماعول جان کی نظر بچا کر۔“ ناہر شرارت پر آمادہ تھا۔

”آنکھ نہ پھوڑ دوں۔“ وہ جلال میں آگئیں۔  
”اور ابھی جو گھونگھٹ نکال کر بیٹھی تھیں ڈرائنگ روم میں۔“ ناہرنے ہاتھوں کا گھونگھٹ بنایا۔

”پردہ کرتی ہوں میں۔“

”ناظم۔ مجید اور نذیر سے تو کبھی نہیں کرتیں گئیں ہانکتی رہتی ہیں۔“  
”اے لو۔ اب میں اُن سے پردہ کروں گی۔ وہ سب اُن کے پوتوں کے برابر تو تھے۔“

”ہاں۔ نا ایک کریم بابا ہی تو رستم زماں ہیں۔ جن سے آپ پر پردہ لازم ہو گیا ہے۔ صاف صاف کہتی کیوں نہیں کہ مرتے ہیں آپ پر۔“ ناہر کہتے کہتے



باہر کی طرف پکا۔ اور ماما چیں بچیں ہو کر رہ گئیں۔

"اے لوناصر میاں نے تو اوسان ہی خطا کر دئے۔ وہ جلدی سے اٹھتے ہوئے بولیں۔" جا کر بڑے صاحب کو مبارکباد تو دے آؤ گی۔"

سکینہ بیگم بھی آہستہ آہستہ چلتی ڈرائنگ میں آ گئیں۔

شاہان احمد نے اٹھ کر ایک ہزار روپیہ ماما کو دیا۔

کریم بابا آگے بڑھے۔ "مبارک ہو صاحب۔" ہمتیں بھی مبارک ہو۔

کریم۔ "ایک ہزار روپیہ اکھنیں بھی کھاتے ہوئے۔ شاہان احمد نے

اپنیں گلے لگا لیا۔ کریم بابا نے ناصر کو بھی گلے لگا کر مبارکباد دی۔

اور پھر باہر نکل کر سب ملازموں میں سوٹھائی بانٹ بانٹ کر۔

مبارکباد دیتے اور لیتے رہے۔

دوپہر کے کھانے کا اعلان ہوا۔ ماما اور زرین کا کھانا۔ زرین کے

کمرے میں گیا۔ کریم بابا اور باقی ملازمین کو باہر بٹھایا گیا۔

شاہان احمد۔ سکینہ بیگم اور ناصر کمرے میں لگے پر تکلف کھانوں کے

گرد جمع ہو گئے۔

شاہان احمد بہت خوش تھے۔ سکینہ بیگم بھی چپ چپ۔ مگر

مطمئن تھیں۔ ناصر بھی خوش لگ رہا تھا۔

خوشگوار باتوں کے دوران کھانا کھایا جا رہا تھا۔

یکبارگی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

"شاید ماجد انکل ہوں۔" ناصر اٹھتے ہوئے بولا۔

سکینہ بیگم کچھ پریشان سی لگنے لگیں۔

مقہوری ہی دیر بعد ناصر مکرراتے ہوئے آ رہا تھا۔

”کون تھا۔؟“ سکینہ بیگم نے پوچھا۔

”انکل ماجد کی بیٹی فرزانہ تھیں۔ زرین سے بات کرنے کو کہتی تھیں۔  
بھیج دیا میں نے زرین کو۔“

”اچھا ہے یہ لوگ خفا نہیں ہوئے۔“ ناصر بیٹھ چکا تو سکینہ بیگم

زیر لب بولیں۔

”آپ ناحق فکر کرتی ہیں اتنی۔ میں انکل اور آنٹی کی اچھی تسلی کر چکا ہوں۔  
کیوں خفا ہوں گے وہ لوگ۔ یہ تو قسمت کی بات ہوتی ہے۔“

”ماں بیٹے میں کوئی پرائیویٹ بات ہو رہی ہے شاید“ شاہان احمد  
اُن کے دھیمے دھیمے لہجے پر مکرراتے ہوئے بولے۔

”پرائیویٹ نہیں ہے ماماں جان۔ دراصل میرے امریکہ جانے

سے پہلے انکل ماجد اپنے چھوٹے بیٹے ساجد کے لئے زرین کا رشتہ

مانگنے آئے تھے۔ میں نے امریکہ سے واپسی تک کے لئے بات ملتوی

کر دی تھی۔ کہ سوچ کر جواب دوں گا۔ پھر اتنی کا خط امریکہ آیا۔

شان کے بارے میں۔ ظاہر ہے کہ شان مجھے ساجد سے زیادہ عزیز

ہے۔ پرسوں رات جب آپ کا فون آیا تھا۔ میں انکل ماجد کے

یہاں ہی گیا ہوا تھا۔ زرین کی بات شان سے پکٹی ہونے کے بارے

میں بتانے کے لئے۔ انہیں اُن کی خواہش پوری نہ ہونے کا افسوس



ہونا قدرتی تھا۔ مگر انہوں نے ظاہر نہ ہونے دیا۔ بوسے بہ قسمت کی بات  
 ہوتی ہے۔ میرے لئے جیسے ساجد ویسے نشان....“  
 ”گڈ۔ واقعی یہ قسمت کی بات ہوتی ہے۔ انھیں اتنی باتیں ہونا بھی نہیں  
 چاہئے۔ حق یہ مقدار رسید۔ یا سر میرا بھائی بھی تو تھا۔“  
 ”ہاں۔ یہ باتیں تو قسموں کی ہی ہوتی ہیں۔ سیکینہ بیگم آہستہ  
 سے بولیں۔“

”جی بھی کچھ غصہ قبل ہم نے زرین کو ان کے یہاں دیکھا تھا۔ تو اس کے  
 متعلق بتاتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ ہم نے بہن کو بات بتائی ہے ساری۔  
 ہمیں تو یہ بھی ایسا ہی محسوس ہوا تھا کہ وہ زرین کو اپنے کسی لڑکے کے لئے  
 پسند کرتے ہوئے ہیں۔“

”شاید ایسا ہی ہو۔“ ناصر بولا۔ ”مگر اتنی نے بھی انہیں منع کیا ہوا  
 تھا کہ زرین یا اتنی کے متعلق وہ انھی کچھ نہ بتائیں۔“  
 ”یہ بھی ہو سکتا ہے۔“ شاہان احمد بولے۔

شام ہونے قبل شاہان احمد نے اجازت طلب کی۔ اور پھر۔  
 یہ چھوٹا سا قافلہ۔ خوش خوش واپس روانہ ہوا۔



..... شان بیٹے زیادہ کیا تعریف کروں۔ تعریف اُس خدا کی جس نے  
 یہاں بنایا۔ بس جیسے تم ہو۔ ویسی ہی لڑکی ہے۔ چندے آفتاب چندے مہتاب ہے۔  
 ہستی ہے تو پھول جھڑتے ہیں منہ سے۔ بولتی ہے تو گھنگھریل جھنکے لگتے ہیں۔  
 بھول جاؤ پھولی ہر بات۔ اپنی دہن کو دیکھو گے تو بڑے صاحب کو داد دو گے  
 بڑے صاحب اور وہ مولا کریم بھی تھا۔ سب گئے تھے۔ ناہر میاں پہلے سے  
 موجود تھے وہاں۔ تمہاری مادا تمہارے عہد قے چلے۔ اب ذرا فکر نہ کرنا۔  
 اپنی صحت کا خیال رکھنا۔ اتنا سامنے نکل آیا تھا دشمنوں کا۔ جب بکھلی  
 بار آئے تھے تو۔ کریم صفت خور سے کو ذرا تمہارا خیال نہیں۔ بیماری کا بہانہ  
 کہہ کے تمہارے ساتھ تو گیا نہیں۔ دو ہی دن بعد یہ لمبی اشگی باندھ کر اور نئی  
 واسکوٹ کس کر۔ گز بھر لمبی تازہ خضاب لگی مکھن سے چپکانی مو پھول کو  
 تاؤ دیتا ہٹا کٹا چل دیا۔ منگنی پر۔ تذیر سے کہہ کر میں نے تو اُسکی خضاب  
 والی پڑیا ہی اڑ والی تھی۔ مگر جانے کہاں سے عین منگنی سے پہلے اور  
 پیدا کر کی۔ کالک ملنے کی اس کی عمر ہے یہ۔ لعنت ہے۔ تم اس کی اچھی طرح  
 خبر لینا اور اپنی خدمت پر دھیان دیتے پر تاکید کرنا۔ اچھا اب بند کرتی  
 ہوں۔ مولا دروازہ پیٹے جا رہا ہے۔ مجید بیہ چار سے کو لکھتے ہی نہیں دے



رہا۔ ہمیں معلوم ہے۔ ہتھاری ماما خود لکھ سکتی ہیں۔

فقط دعا گو ہتھاری ماما

بقلم خود۔

خط پڑھ کر اُسے حسب معمول ہنسی بھی نہیں آئی۔ اور حسب عادت ماما پر پیار بھی نہیں آیا۔ پچھلے ہفتے کا ڈن گیا تھا۔ وہاں کوئی آثار تو نہ تھے سنگی وغیرہ کئے۔

بہر حال۔ جس دن وہ واپس آ رہا تھا۔ اُس دن ناصر امریکہ سے آ رہا تھا اور بابا جان اُسے ریسو کرنے ایر پورٹ جا رہے تھے۔ اُسے بھی ساتھ چلنے کو کہا تھا۔ مگر اس نے کام نہ کیا نہ کوکے ٹال دیا تھا۔ پھر چند روز بعد جمعہ تھا۔ سنگی کی رسم ادا کی گئی ہوگی۔

کریم بابا ابھی ابھی پہنچے تھے۔ ساتھ ہی ماما کا خط بھی لائے تھے۔ اُس نے خط پڑھا سائیڈ ٹیبل پر اُٹھا لیا دیا۔ اور خود سامنے وادی کی طرف کھلتی بالکون کی طرف آ گیا۔

مطلع آج بھی صاف تھا۔ دن بھر کا تھا سورج سامنے سرخی بہاڑ کے پیچھے آرام کرنے کی غرض سے پناہ لینے کے لئے سرگرداں تھا۔

سدا بہار پائینٹر پرانا میلارنگ جھٹک کر نیا تازہ بنر باندھ ادرے تھے۔ نرم خرام ہوا بلی بی گھاس میں سرگوشیاں کرتی۔ اٹھکیکیاں کھیلتی سر سر رہی تھی۔ بھولا بھٹکا ایک عقاب دُور آسمان کی دسعتوں میں رشاہانہ شان سے تیر رہا تھا۔ کتنا مشکون تھا پوری وادی میں۔

دور۔ احیر۔ پہاڑی کی چوٹی کے پاس بنے چھوٹے سے مکان سے  
اچانک دھواں اٹھا۔ تو شان کو لگا۔ دھواں وہاں سے نہیں۔ اُس کے  
دل سے اٹھا تھا۔

گہری اُداس سانس لے کر وہ پلٹا۔ اور وہیں رکھے آرام چیر پر ڈھیر ہوتے  
ہوئے۔ بازو سے آنکھیں ڈھک لیں۔ اور پھر اُسے محسوس ہوا۔ وہ تو پورے  
کا پورا بُلگ رہا تھا۔ اندر ہی اندر۔ دھیرے دھیرے۔ چپ چاپ۔ گھٹ  
گھٹ کر ختم ہو رہا تھا۔ من ہی من میں۔ ہوئے ہوئے۔ چپکے چپکے۔  
زائر سے اُس نے کوئی رابطہ اُس کے بعد نہیں رکھا تھا۔  
زرین؟۔ اس کے متعلق اُس نے ہر بار ہر سوچ ذہن سے جھٹکنے کی  
کوشش کی تھی۔ یہ الگ بات تھی۔ کہ ہر بار ذہن سے جھٹکنے کے بعد بھی۔  
اُس کی یاد سانس بن بن کر۔ اُس کے سینے میں در آئی تھی۔  
اُس کی دانست میں وہ اُس سے شدید نفرت کرتا تھا۔ مگر ٹھنڈے  
دل سے سوچتا تو۔ اس اس ہوتا کہ۔ محبت اور نفرت۔!

BOTH ARE SAME BECAUSE BOTH SAME INTENSITIES

اُس کا خیال تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ اُس کی یاد مدھم پر جائے گی۔  
مگر۔ اس وقت تک تو۔ اُس نے اُسے کون سے ایک سانس بھی نہیں  
لینے دیا تھا۔ کاش! وہ اُسے بھول جائے۔

اُد۔ پھر وہ چونکا۔ اب تو اُسے یاد کرنے کا اُسے حق بھی نہیں رہا تھا۔  
بابا جان نے آخری کیل جو ٹھونک دی تھی۔ اور اُسے لگا۔



اُس کا دل گھٹا رہا ہے۔ آنکھوں سے بازو ہٹا کر اُس نے دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیا۔ پھر اُسے آنکھوں کے آگے اندھیرا سا محوس ہوا۔ اور پھر وہ چند لمحوں کے لئے غافل ہو گیا۔

”شان۔۔۔ شان۔“ اور ناصر بالکنی میں نکل آیا۔  
 ”شان۔!“ وہیں اُس کے پہلو میں ٹکے آرام چیر پر ٹکتے ہوئے۔ اُس نے اُس کا ماتھا ہلاتے ہوئے پکارا۔  
 ”ہوں۔“ شان نے آہستہ سے آنکھیں کھول دیں۔ شام کے سائے سلجے ہو رہے تھے۔ مگر اتنے بھی نہیں کہ وہ شان کی بھاری سُرخ آنکھیں۔ پیلاشت چہرہ نہ دیکھ سکے۔

”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔“ ناصر نے گہرا کر اُس کی نبض تھام لی۔  
 ”ٹھیک ہوں۔“ لہجے میں تلخی اور بے نیازی کے باوجود اس کی آواز بہت کمزور ہو رہی تھی۔ ناصر کو اچانک اپنا آپ جرم سالگنے لگا۔  
 ”اٹھو۔ اندر چلیں۔ شام خنک ہو رہی ہے۔“ اُس نے اُسے بازو سے تھامتے ہوئے اپنا بیت سے کہا۔

”ہیں ٹھیک ہے۔“ ہاتھ چھڑا کر وہ سختی سے بولا۔ گو آواز بخشل سا تھا مگر وہی تھی۔

اور ناصر کو لگا۔ وہ ہی اُس کا جرم ہے۔ اُس کی خوشیوں کا قاتل ہے۔  
 ”اٹھو شان!“ زبردستی اُس کا بازو اپنی گردن کے گرد لپیٹتے ہوئے۔  
 اُس نے اُسے کھڑے ہونے میں مدد دی۔

”میں ٹھیک ہے۔“ اُس کی گردن میں بازو ڈالے وہ ساتھ چلتے ہوئے بولا۔  
 ”میں چلا جاؤں گا۔“  
 ”یہاں لیٹ جاؤ۔“ بستر تک لا کر اُس نے اُسے لٹا دیا۔ اور آگے بڑھ کر  
 گھنٹی کر دی۔ شان لیٹے لیٹے صحت کو گھورنے لگا۔ گویا اُسے ناصر کی طرف  
 دیکھنا بھی گوارا نہ تھا۔

”بابا گرم دودھ اور اوٹینین۔ جلدی لائیں۔“ کریم بابا کے اندر داخل ہوتے  
 ہی ناصر نے انہیں کہا۔ اور ایک نظر شان کے سفید پڑتے چہرے پر ڈالتے  
 ہوئے پریشان سے بابا کچھ پوچھے بنا اُلٹے قدموں واپس چلے گئے۔  
 ناصر اس کے بستر پر اُس کے قریب بیٹھ گیا۔ بجلی کی روشنی میں اُس کے  
 چہرے کو بغور دیکھا۔ اس تھوڑے عرصہ میں شان وہ شان ہی نہ رہا تھا۔  
 کھلتے گندمی رنگ پر جھلکتی صحت مند سُرخ کا نشان تک نہ تھا۔ چہرہ  
 پہلے سے چھوٹا اور کم ہلا کر رہ گیا تھا۔ اندر ہی اندر غم جیسے اُسے کھائے جا رہا تھا۔  
 اور ناصر کو لگا۔ وہ آج اس راز کو مزید راز نہ رکھ سکے گا۔

وہ شان کو بتا کر رہے گا سب کچھ۔ شان کچھ نہیں کہے گا۔ اگر دل میں کوئی  
 کمزورتا آئی بھی۔ تو زین سے بے پناہ پیار اُسے دھو ڈالے گا۔ بھلا پیار بھی  
 کبھی کوئی اونچے نیچے دیکھتا ہے۔ ایسا ہوتا تو بادشاہ کی کھٹکارتی پر اور بھکاری  
 کی نفرت کی شہزادی پر نہ پڑتی۔ یہ ہما تو ایک جذبہ ہے۔ جہاں آکر ہر اونچے نیچے  
 ہموار ہو جاتی ہے۔

”آجائیں بابا۔“ دستک پر ناصر بولا۔ اور بابا ٹرے لئے اندر داخل ہو گئے۔



"میز ادھر ہی اٹھالائیں۔" بابا نے سوئے کے پاس سے میز لا کر شانک کے بستر کے پاس رکھ دی۔ برتن اُس پر رکھے۔ اور خالی بڑے ہاتھ میں پکڑ لی۔

"چھوٹے سرکار کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" بابا ہجہ تشویش لئے ہوئے تھا۔

"جی بابا ٹھیک ہو جائیں گے۔ آپ فکر مت کریں۔"

"اچھا ہے۔ ناصر بیٹا آپ آگئے۔ چھوٹے صاحب کی بس یہی حالت ہے کچھ غصہ سے۔"

"رب ٹھیک ہو جائے گا بابا۔" ناصر نے اود لیٹین اور شکر دودھ میں ڈال کر چمچ ہلاتے ہوئے کہا۔

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" وہ جانے لگے۔ پھر جیسے جلتے جاتے انہیں یاد آیا۔ "آپ کوئی اسپیشل چیز کھانے پر پسند کریں گے ناصر بیٹا۔" وہ رُک کر پوچھنے لگے۔

"ہنیں۔ جو شان کھائیں گے وہی ٹھیک ہے۔"

"مگر شان بیٹا تو کئی راتوں سے کھانا کھاتے ہی نہیں۔"

اور ناصر شان پر ایک تشویش بھری نظر ڈال کر رہ گیا۔

"چلن کورن سوپ بنوائیں۔ سٹیک اور چاول کے ساتھ سیخ تک۔"

اور جینی۔ "اُس نے ہر چیز شان کی پسند کی بتائی۔" ہم دونوں کھائیں گے اور اس وقت ایک کپ کافی میرے لئے۔

"ٹھیک ہے صاحب۔" اور بابا کچھ مطمئن ہو کر کمرے سے چل دیئے۔

ناصر اٹھا۔ شان کے سر کو سہارا دیتے ہوئے تکیے نکال کر مسہری کی  
پشت سے لگلے اور اُسے قدرے ادبہ کھینچتے ہوئے آرام سے تکیوں سے  
لگا دیا۔ شان مسکرا دیا۔

لیکن اس کی مسکراہٹ میں تلخی، اُداسی۔ دکھاوے بی تھی۔  
”لو۔ یہ دودھ پی لو۔“ وہیں اُس کے سر پر ہاتھ بیٹھتے ہوئے۔ ناصر نے گلاس  
اُس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ شان سارا دودھ پی گیا چپ چاپ۔  
ناصر نے گلاس واپس میز پر رکھ دیا۔ پیر نیپکن اُٹھایا۔ شان کا منہ  
صاف کیا۔ اور استعمال شدہ نیپکن واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔  
شان چپ چاپ اس کی تعمیل کرتا اور کرتا گیا۔ ناصر ہمیشہ سے ایسا  
تھا۔ شان پر جان چھڑکتا تھا۔ اُس کی ذرا سی تکلیف پر بے چین ہوا اُٹھتا  
تھا۔ شان بھی اُسے کم نہ چاہتا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ اُس نے بہت  
مشفق قسم کی طبیعت پائی تھی۔

سال بھر کافرق ہوتے ہوئے۔ وہ ناصر کو اپنے سے بہت چھوٹا سمجھتا۔

اور ٹریٹ کرتا تھا۔

مگر۔ ایک آہ سی شان کے لبوں پر آکر دم توڑ گئی۔



”شان“ ناھر، شان کے ماتھے پر سے بال ہٹائے ہوئے اپنا نیت سے بولا۔

”کیا ہے۔؟“ شان نے نظریں اٹھا کر اُسے دیکھا۔ گستاخ دکھ تھا۔ اس کی آنکھوں میں۔ خداوند!۔ ناھر کا تپ سا گیا۔ اوند پھر۔

”زرین، ابو کی دوسری بیوی کی بیٹی ہے۔“ اُس نے براہِ راست کہا۔

شان اُسے لمبی تمہید کا متحمل نظر نہیں آ رہا تھا۔ ”میری بہن ہے وہ۔“

شان کی نظریں اُس کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ گو نہ بات ابھی اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

”ہاں شان۔ تقریباً بیس سال پہلے الیکٹرک کے سلسلے میں ابو کا جانا۔ یہاں سے دور ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہوا تھا۔ وہیں انھوں نے.....“

ناھر کہتا گیا۔ اور شان ایک ٹک۔ پلک جھپکاتے بغیر۔ اُس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے اُس کی داستان سُنتا گیا۔

”میں نے اتنی اور زرین کو گولف کلب کے نزدیک اُس انیکسی میں منتقل کروایا تھا۔ تم نے شاید میرا مریکہ جانے سے قبل مجھے نیچے شہر میں دیکھا ہوگا۔ میں ملنے گیا تھا اتنی اور زرین سے۔ ماہانہ خرچ دینا تھا۔ تقریباً ایک ماہ سے جا نہیں رکھا تھا۔ کئی کام تھے اُن کے میرے کرنے والے ہمارے سدا ہاں آنے جانے کا وہ ادگ مجھ سے ذکر کر چکی تھیں۔ میں خوش تھا۔ یہ سب جان کر۔ پھر۔ بواپسی رات بٹھرتے ہمارے پاس آیا۔ تو تم نے میری دہاں پر موجودگی کا اشارہ بھی دیا۔



تم مجھ سے ناراض تھے کہ میں نے ماموں جان سے زرین کے لئے تمہاری بات کیوں نہیں کی۔ مگر میں مجبور تھا۔ میں خود سے اپنی بہن کی بات کیسے کرنا کیسے کہتا.....؟ کہ تم اُسے..... پسند کرتے ہو..... یادہ تم سے.....

اور پھر تب۔ ماموں جان کو یہ علم بھی نہیں تھا کہ انی اور زرین درحقیقت کون ہیں۔ میں کسی طرح تمہاری بات کر بھی لیتا اور بعد میں انھیں معلوم ہو جاتا کہ زرین میری بہن ہے تو اُسے وہ میری خود غرضی سمجھتے۔ اور پھر یہ کہ میں نے بھی اُن سے راز کیوں چھپائے رکھا۔۔۔۔۔

”بابا جان کو اب پتہ ہو گیا کیا۔؟“ شان نے پہلی بار لب کھولے۔  
 ”ہاں۔“ ناصر نے کہا۔

”کیسا؟ کس نے بتایا۔؟“ تم کہتا ہے ناکہ زرین کی اتنی۔۔۔۔۔  
 ”میری اتنی۔“ ناصر نے مسکراتے ہوئے تصحیح کی۔

”ادہ لیں۔ تمہارا اتنی نے تم کو منع کیا تھا کہ بابا جان کو فی الحال پتہ نہ لگے۔“  
 ”ہاں۔ کسی کو کبھی نہیں۔ یہ تو خود ماموں جان نے زرین کو انکل ماجد کے گھر دیکھا تو بات گریڈی۔ اور جب تک ہاتھ نہ پہنچے بات چھوڑی نہیں۔“  
 ناصر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ادہ گوڑ۔ کیسا کیسا سیکرٹ نکلا ہے آج۔“ شان دھیرے دھیرے جیسے خود سے بولا۔ اس کی روح پر سے ایک بھاری بوجھ سمٹ گیا تھا۔  
 اُسے کتنی شدید غلط فہمی ہوئی تھی ناصر کو وہ کتنا غلط سمجھا تھا۔ اُسے اپنے آپ سے نفرت سی ہونے لگی۔



”ناھر“ اُس نے دونوں بازو پھیلا کر ناھر کے گرد پیٹ لئے۔ مجھے  
معاف کر دو۔ پلینر فور گیو می“

ناھر کے دل سے بھی ایک اذیت ناک وزن اُتر گیا تھا۔  
”اب بھٹیکا ہو جاؤ شان پلینر۔ دیکھو سب کتنے فکر مند ہیں“ اور۔  
شان کی گرفت اچانک ڈھیلی پڑ گئی۔

ناھر زرین کا بھائی تھا۔ دوسرے لفظوں میں زرین اب بھی شان کو اپنا  
ہی سمجھتی تھی۔ تو وہ۔ جو خود زرین کا بہنیں رہا تھا۔ اُس نے خود ہی تو بابا جان  
کو خط لکھ کر اُن کی مرضی کے مطابق لڑکی کے لئے منظوری دے دی تھی۔  
اور۔ شان کا دل چاہا کہ۔ کپڑے بھاڑ کر کہیں نکل جائے۔ یہ اُس نے  
کیا کر دیا تھا۔ اپنے پاؤں پر خود ہی کھلاڑی مار دی تھی۔  
لیکن اگر وہ منظوری نہ لکھتا۔ تو کیا بابا جان بھی رُک جلتے۔ یہ  
کام تو ہر صورت! انہیں کرنا تھا۔

”کسی لڑکی سے شادی کا وعدہ کرنے سے پہلے تمہنے یہ کیوں نہیں سوچا۔  
کہ تمہارے لئے لڑکی پسند کرنا تمہارا کام ہے۔ تمہارا نہیں“ اُسے بابا جان کے  
خط کے الفاظ یاد آ گئے۔ خط کے اگلے ہی دن وہ زری کی طرف چل پڑا تھا۔  
کتنا اُداس تھا۔ ادھورا ادھورا سا۔

بابا جان نے زری سے متعلق ہر امید بھی توڑ دی تھی۔ اور وہ ملنے بھی جا  
رہا تھا اُسے۔ ایک چیز منتی بھی نہیں تھی۔ اور اس کے بغیر رہا بھی نہیں جلتا تھا۔  
اور پھر۔ اُس کے ساتھ ناھر کو دیکھ کر۔ وہ شکوک و حد میں مبتلا ہو کر

واپس چل پڑا تھا۔ تو۔ کتنا ٹوٹا ہوا۔ کتنا بکھرا ہوا تھا۔

پھر اُس نے اُسے بھلانے کی کوشش کی تھی۔ اُس کی یادوں سے فرار کا سوچا تھا۔ اور۔ پھر۔ کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ تو اُسے غصہ نے آلیا تھا۔

اور تھی۔ اُس نے اس کا توڑ سوچا تھا۔ مردانہ وار توڑ۔ اور بابا جان کو اُن کی پسند سے متعلق اپنی منظوری لکھ دی تھی۔ مگر۔ وہ چونکا۔

تب تو اُس نے زی سے مایوس ہو کر ایسا کیا تھا۔ اور اب۔ اس وقت۔ اُس کی امید پھر بندھ گئی۔ زی کسی اور کی نہیں تھی۔ شان کی تھی۔ اب بھی۔

”ادھ ہدایا۔ ازی نے اُس کا انتظار کیا ہوگا وہ نہیں گیا ہوگا۔ تو سوچا ہوگا۔ بھول گیا ہے اُسے۔ اور پھر۔ اب ناصر نے اُسے شان کی سنگنی کا بتایا ہوگا تو سوچ رہی ہوگی۔“ بے وفا تھا۔

”ہم جاتے ہی اپنے بابا جان سے بات کرے گا۔ تم میرا انتظار کرو۔ بہت جلدی تم کو یہاں سے لے جائے گا۔“ اُسے یاد آیا۔ اُس نے زرین سے کہا تھا۔ ناصر کو چھوڑ کر اُس نے اپنا چہرہ دونوں بازوؤں سے ڈھک لیا۔ وہ واقعی بے وفا تھا۔ اُس نے سوچا۔

اُس نے پھر بازو چہرے پر سے ہٹا دیئے۔ ہذیانی انداز میں تکیوں پر ادھر سے ادھر جھول گیا۔ ”بے وفا۔“ دل نے ملامت کی۔ ”اگر بابا جان سے ملکر نہیں لے سکتے تھے تو اُس معصوم کو کیوں پیار سے آشنا کرایا۔ اور پھر جب اُسے پیار کرنا سکھا ہی دیا۔ تو ڈٹ کر رہتے اپنی جگہ پر۔ ایک دن۔“



ایک ماہ۔ ایک سال۔ بابا جان کو ہمارے پیار کی قوت کا صحیح اندازہ ہو جاتا تو خود بھی سپردال دیتے۔

”ناھر۔“ سر اٹھا کر اُس نے پاس بیٹھے ناھر کی گود میں رکھ دیا۔ ہم زری کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہہ دو بابا جان کو۔ میں اس سنگنی کا پابند نہیں ہے۔ میں زری کے لئے ہر شکل سے لڑے گا۔

اور ناھر نے بے تحاشہ آئی ہنسی بمشکل روک لی۔ اور پھر۔ یکدم ہی اُسے شرارت سوچھی۔

”کہہ دوں گا۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔ ماموں جان۔“ اُس کی شکل بہت سنجیدہ تھی۔

”ایسا مت کہو ناھر۔ میں جان لڑا دے گا۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔“

”ماموں جان نے مجھے بتایا ہے کہ تم اپنی پسند کی کسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ مگر انہوں نے سختی سے روک دیا۔ اور۔۔۔۔۔“

”اور کیا۔؟“ وہیں اُس کی گود میں سر رکھے اُس نے ناھر کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

”کہ۔ ایسا کرتے ہوئے انہیں افسوس بھی ہوا تھا۔“

”کیا مطلب؟ سنگنی کرتے ہوئے۔؟“ شان کی آواز میں امید کی کرن تھی۔

”نہیں۔“ ناھر نے کہا۔

”پھر۔؟“ لفظ ”پھر“ پر دوبارہ مایوسی میں ڈوبا گیا۔

”تمہیں۔ ہمتاری پسند کی لڑکی سے روکتے ہوئے انہیں افسوس ہوا تھا۔“

”تو پھر ایسا کونسا مجبوری تھا۔ کہ وہ اپنا پسند کرنے پر مجبور ہو گیا۔“



اور ناصر دھیرے سے مسکرا دیا۔ ”کوئی مجبوری ہوگی۔ اُن کے اُن کی  
اُن کے اصول کی۔ میں یا تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے۔“

”کچھ بھی ہو۔ اُن کو کہہ دو۔ شان یہاں شادی نہیں کرے گا۔ اگر وہ  
میری بات نہیں مانے گا۔ تو میں خود اُس گھر میں انکار بھیج دوں گا۔۔۔۔۔  
ویسے۔ BY THE WAY یہ ہے کون لوگ؟“

”ہے ایک اُن کے معیار کا۔ اچھا گھرانہ۔ بقول ماموں جان“ ناصر  
نے مسکراتے ہوئے مزید کہا۔

”تم جانے۔ تمہارا ماموں جان جانے۔ میرا پیغام کل ہی ان کو دیدو“  
”ویسے تمہاری اطلاع کے لئے غرض ہے کہ میں وہاں نہیں جا رہا  
ہوں۔ اپنے گاؤں جا رہا ہے۔ نہر کی طرف والی زمین پر تنازعہ اٹھایا  
ہے۔ کسانوں نے۔ پٹواری نے وقت دیا ہے۔ نہ پہنچا تو اگلے سال  
تک ہاتھ نہیں آنے کا۔“

”ٹیلیفون پر۔؟“ وہ بے تابی سے بولا۔

”لائن خراب ہے۔ چیک کر لو۔“

”اوہ۔“ اُسے یاد آیا۔ لائن واقعی خراب تھی۔

”اور پھر۔۔۔۔۔“ ناصر ایک بار پھر سنجیدہ نظر آنے لگا۔

”کیا۔؟“ شان چونکا۔

”میرے امریکہ جانے سے قبل۔ انکل ماجد نے اپنے ڈاکٹر بیٹے ساجد

کے لئے زرین کار شتمہ مانگا تھا۔



”تو کیا ہوا۔؟“ وہ لاپرواہی سے بولا۔

”دہی جو ہوتا ہے۔“ ناہر بھی اطمینان سے بولا۔ اور شان چونکا۔  
 ”زی مان گئی۔؟“ شان نے ایک دم ہی اپنے تکیوں پر ہوتے ہوئے  
 اُس کا کندھا پکڑ کر تیزی سے پوچھا۔

”لڑکی بچاری سے کون پوچھتا ہے۔“ ناہر اُداس سا بولا۔  
 ”بتاؤ کیا ہوا پھر۔؟“  
 ”وہ.... اتنی.... نے....“

”یس کہہ دیا ہنگامہ...“ وہ بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ”مگر میں بھی دیکھتا ہے  
 وہ ڈاکٹر کا بچہ کیے آتا ہے۔ سینہ غار کر دوں گا۔ ایک دار میں۔ خود  
 پیمانی چڑھ جائے گا۔ پرواہ نہیں۔ اور پھر اُس نے فیصلہ کر لیا۔  
 وہ بابا جہان سے صاف صاف بات کرے گا۔ نکاح تو نہیں ہوا  
 تھا ابھی۔ یہی وقت تھا دو ٹوک فیصلہ کر لیتے گا۔ دیکھ لیا تھا اُس نے  
 خاموش رہ کر۔ کر لی تھی اُس نے کوشش حالات سے سمجھوتہ کرنے کی۔  
 مگر۔ اُس کی خاموشی ایک تڑپتی فریاد تھی۔ اُس کا سمجھوتہ ایک  
 مستقل درد تھا۔ اور یہ۔ تڑپ۔ یہ درد سہتے سہتے اُس کی روح بلایا  
 اُٹھی تھی۔ وہ بات کرے گا۔ ضرور۔ اُس کا فیصلہ اٹل تھا۔

پہلے بابا جہان سے بات کرے گا۔ وہ نہ مانے تو سیدھا لڑکی کے یہاں  
 معذرت بھجوا دے گا۔ اور پھر ادھر سے فارغ ہو کر۔ ڈاکٹر سے دو  
 دو ہاتھ کرے گا۔ ”ہو نہیں چوزہ کہیں کا“ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اپنا لیوا اور

ہاتھ میں لے کر اُلٹ پلٹ کرتے ہوئے وہ بڑ بڑایا۔

ناصر اُسے دیکھ دیکھ کر بے طرح آئی ہنسی روکنے کی کوشش میں۔ دانت  
انگلی کے ناخن سے بجاتا۔ شان کی ہڑبونگ سے محفوظ ہوتا رہا۔

اوپر رات ڈنر پر۔ شان چاول کے اوپر سیخوں میں پروئے تکیوں  
والی اپنی پسندیدہ ڈش پر پل پڑا تو۔ پاس کھڑے کریم بابا نے سوچا۔  
ناصر بیٹا ٹھیک ہی تو کہتے تھے۔ ”سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بابا“

شاہان احمد ناصر کے کمرے میں ایک سرے سے دوسرے تک ٹہلتے بار  
بار گھڑی دیکھ رہے تھے۔ ہاتھوں کی مٹھیاں کھینچی ہوئی تھیں۔ اور چہرے سے  
بے پناہ غیظ و غضب عیاں تھا۔

اور ناصر۔ اُن کی اچانک اور غیر متوقع آمد پر کی اطلاع پلٹے ہی میں  
میں کھانا چھوڑ چھاڑ پکٹا چلا آیا تھا۔ ”آپ۔ ماماں جان۔ آپ نے کیے  
زحمت کی۔ اندر آتے ہی اُس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”کیسے ہو بر خور دار“ وہ ٹہلتے ٹہلتے رک گئے۔ غیظ و غضب بھی قدرے  
کم پڑا۔ ”ٹھیک ہوں ماماں جان۔ آپ تشریف رکھئے نا“ اُس نے



آگے بڑھ کر انہیں صوفہ پر بیٹھنے میں مدد دی۔ ”آپ... آپ...؟“ وہ ان کے بے وقت آنے کی وجہ پوچھنا چاہتا تھا۔

”یہ... یہ پڑھو...“ جیب سے ایک خط نکال کر اُسے تھماتے ہوئے وہ ہنسنے لگا۔  
 .... میں اس جگہ کسی صورت شادی نہیں کر سکتا۔ میں نے بہت کوشش کی۔ بہت سوچا کہ آپ کی بات رکھ سکوں۔ مگر اب ایسا ممکن نظر نہیں آتا۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں ساری زندگی دکھی رہوں۔؟... بایا جان پلٹر آپ اُس گھر میں کہلاوا دیں۔ ایسا ممکن نہیں۔ میں بہت مجبور ہوں۔ میں اُس لڑکی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں اُسی سے شادی کروں گا۔..... کچھ اسی نوعیت کی باتیں تھیں پورے خط میں۔

”کون ہے یہ لڑکی۔؟“ شاہان احمد گرج کر بولے۔ غیظ و غضب پھر لوٹنے لگا تھا۔ ناصر سہم کر رہ گیا۔ ”تمہیں معلوم ہونا چاہیے۔“ غصہ خیز نظر میں ناصر کے آ رہے ہی تھیں۔

”میں معلوم کروں گا ماموں جان بابا“  
 ”گویا کہ تمہیں معلوم نہیں ہے۔“ اُن کا لہجہ مشکوک تھا۔  
 ”کچھ کہتا تو تھا۔ مگر یہ نہیں بتایا کہ کون ہے۔؟“

”SEE!“ ہاتھ بڑھا کر انہوں نے خط ناصر سے لے کر دوبارہ جیب میں ڈال لیا۔ ”بیٹھو۔“ اُسے ہنوز کھڑا یا کر وہ قدرے مدھم پڑتے ہوئے بولے۔ اور ناصر سر جھکائے مودب طریق سے اُن کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔  
 ”پڑھا خط تمہنے۔؟“ اُن کے غصے کی جگہ پریشانی نے لے لی تھی۔

”جی۔“ ناصرنے کہا۔

”ہم ہمارے پاس اس لئے آئے ہیں کہ تم آج ہی اُس کے پاس جاؤ۔ اور اُسے بتا دو۔ کہ جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب ہم اپنے کئے گئے فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔“ ناصرنے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا اُن کا سرخ چہرہ اُن کے دلی جذبات کا آئینہ دار تھا۔

”ادھر صرف بتانا ہی نہیں سمجھانا بھی۔“ وہ کچھ سوچتے سوچتے بولے۔ ”وہ ہماری اکلوتی اولاد ہے۔ اُس کی ہر خواہش کا ہم نے ہمیشہ احترام کیا ہے۔ وہ ہمیں بے حد عزیز ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کی شادی ہم اپنی مرضی سے کرنا چاہتے تھے۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ کم عمری اور نا تجربہ کاری کی بنا پر وہ اپنی زندگی کا اہم ترین فیصلہ خود کے ساری زندگی خیارہ بھگتے۔ صرف اسی خیال سے ہم نے یہ ذمہ داری اپنے سر لی تھی۔۔۔ کہتے کہتے وہ خاموش ہو گئے۔“ ناصرنے دیکھا وہ کسی سوج میں ڈوب گئے تھے۔

”رات ہمیں اس کا یہ خط ملا۔ تمام رات ہم جاگتے رہے۔ ایک طرف اولاد کی خواہش تھی تو دوسری طرف سکینہ بیگم کے آگے بے عہدی کا خیال۔“ انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ ”ساری رات سوچ کر ہی ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ شان کو وہی کرتا ہو گا۔ جو ہم چاہتے ہیں۔“

اُن کے لہجے میں عزم تھا جہاں وہ ہاں دے دے گا۔  
اُن کے فیصلے میں جہاں حکم تھا۔ وہاں پریشانی بھی تھی۔

”میں سمجھا دوں گا۔ مائوں جان۔“



” ہم سکیٹہ بیگم کو کیا منہ دکھائیں گے۔ کیا سوچیں گی وہ ہمارے بارے میں۔ کیا وہ یہ نہیں سمجھیں گی۔ کہ ہم نے اُن کا مذاق اڑایا ہے۔ یا پھر ہمارے من میں کھوٹ تھی۔ ہم نے اُن کی دل شکنی کر کے مسلمانی بیگم کا بدلہ لینے کی کوشش کی ہے۔ اور پھر سکیٹہ بیگم سے نہ سہی یا سر علی کا زرین سے تو خون کا رشتہ ہے۔ شان نے کیا ہمیں اتنا ہی بے غیرت سمجھ لیا ہے۔ نہیں۔ نہیں۔ تم ابھی جاؤ اور اُس کو ہمارا فیصلہ سنا دو۔ اُس کی شادی ہوگی تو یا سر علی کی بیٹی زرین سے۔ ورنہ۔ اُس کو کہہ دو۔۔۔ کفن میں بھی ہمارا منہ نہیں دیکھ پائے گا۔“ ایک بار پھر اُن کا غیظ و غضب لوٹ آیا تھا۔

” ماموں جان۔ آپ پلیر RELAX کریں۔“ ناصر اُٹھ کر اُن کے قریب آگیا۔  
 ”میں پوری کوشش کروں گا اُسے سمجھانے کی۔“

”سمجھانے کی نہیں۔“ وہ پھر گرجے۔ ”یہ بتانے کی کہ اُس کی شادی زرین سے ہو رہی ہے۔ صرف زرین سے۔“

ابھی کچھ دیر قبل ماموں جانتے اُسے سمجھانے کو ہی تو کہا تھا۔

”جی ایسا ہی ہو گا۔“ ناصر پھر بھی سہم کر بولا۔

تبھی سیراج جو س کے کلاس لے اندر آگیا۔ شاہن احمد پھر کسی سوچ میں پڑ گئے تھے۔ سیراژ سے رکھ کر واپس چلا گیا تھا۔

”آپ نے فون کیا ہوتا۔ میں حاضر ہو جاتا۔“ کلاس اُن کی طرف بڑھتے ہوئے

ناصر نے کہا۔ اُسے معلوم تھا۔ ماموں جان اپنی بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے اتنا وقت سال بھر میں بھی نہ نکال سکتے تھے۔

” رات کے وقت خون کر کے ہم تمہیں پریشان کرنا نہیں چاہتے تھے۔  
 اور پھر صبح ہوتی۔ تمہیں اطلاع کرتے۔۔۔ اور تم۔۔۔ آتے۔۔۔ اتنا انتظار ہم  
 کہہ نہیں سکتے تھے۔ یہ بچوں کے کھیل نہیں ہیں۔ بیٹا۔! تم ہماری ذہنی حالت کا  
 اندازہ نہیں کر سکتے۔ بہت سخت جان ہیں ہم کہ ہمارا ہیمرج نہیں ہوا۔۔۔“  
 ” آپ فکر نہ کریں ماموں جان۔“ میں سب ٹھیک کروں گا۔“  
 ” وہ راز جو ہم اُس پر خود عیاں کرنا چاہتے تھے۔ آج تم اُسے بتا دو۔  
 بتا دو کہ جس لڑکی سے ہم نے اُس کی سنگی کروائی ہے۔ وہ یا سرِ علی کی  
 بیٹی ہے۔ اُسے بتا دو کہ اُن ماں بیٹی نے اتنے دُکھ اٹھائے ہیں۔ اتنے  
 غم جھیلے ہیں کہ اب اُن میں مزید دُکھ سہنے کی تاب نہیں۔ اُن کی۔  
 آنکھوں میں مدت کے بعد خوشیوں کے جلتے ہوئے دیئے ہم ٹجھا نہیں سکتے۔  
 بخدا ہم میں اتنی ہمت نہیں ہے۔ بتا دو اس کو۔۔۔ سب بتا دو۔۔۔  
 کہ وہ کون لوگ ہیں۔۔۔ کہہ دو اس کو کہ زرین تمہاری بہن ہے۔۔۔  
 پھر۔۔۔ شان ہمارا خون ہے۔ ہمیں یقین ہے وہ ان لوگوں کو دُکھی اور  
 بے عزت ہوتے نہیں دیکھ سکے گا۔“ اچانک ہی اُن کے لب دلہجے میں  
 فخریہ انداز جھلک اُٹھا۔ ” اور پھر تم۔۔۔ تمہیں بھی تو وہ جان سے زیادہ  
 عزیز سمجھتا ہے۔“

” ماموں جان۔ آپ فکر نہیں کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“  
 شاہان احمد نے جوس کا گلاس اُٹھا کر منہ سے لگا لیا۔  
 ” ماما کیسی ہیں۔ ماموں جان۔“ ” ناھر کو پریشانی میں خیال ہی نہ رہا تھا



”ٹھیک ہے۔“ وہ جیب ٹوٹنے لگے۔ ”یہ خط دیا تھا ہمتا بے لئے۔  
یاد رہی ہتھیں رہا باتوں میں۔ خط نکال کر انہوں نے اُسے کھما دیا۔  
”اوہ۔“ ناہر کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔

”اوکے۔ بیٹا۔ اب چلتے ہیں۔ فلائیٹ کا وقت ہو رہا ہے۔  
وہ اٹھ کھڑے ہوئے تو ناہر بھی ماما کا خط ایک طرف رکھ کر  
جلد کلتے کھڑا ہو گیا۔

ناہر نے اہتیں گاڑی میں بٹھایا اور ایئر پورٹ چل دیا۔  
”نورا چلنے کی کرو۔ اور شان سے بات کر کے وہیں سے ہمیں  
فون کر دو۔ ہم انتظار کریں گے۔ اوکے۔ گڈ لک۔“ شاہان احمد  
بوسے۔ اور پھر بادقار انداز میں چلتے۔ رن وے پر کھڑے جہاز کی  
طرف بڑھنے لگے۔

میں واپس پہنچ کر اُس نے بے تابی سے ماما کا خط کھولا۔  
”..... زرین بی بی کا جوڑا لے کر گئی تھی۔ ساتھ ہی بڑے صاحب کا  
پیغام بھی تھا۔ بیگم صاحب کے لئے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ٹینہ بی بی کے لئے  
زیور کا آرڈر دینے سے پہلے بیگم صاحب اور زرین خود ہبا کر زیور پسند  
کر آئیں۔ پھر وہ ٹینہ بی بی اور زرین بی بی دونوں کے زیور کا آرڈر  
خود دیں گے۔ باقی بڑے صاحب فرماتے تھے کہ ٹینہ بی بی کا جوڑا لے کر  
اب کے میرے علاوہ زرین بی بی اور بیگم صاحب بھی اُن کے گھر جائیں گے۔  
اب بات یہ ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے آجانا۔ بیگم صاحب فرماتی تھیں کہ





اس طرح سے تو زرین اُسی کی تھی۔ اُس کی اپنی۔ مگر وہ خود ہی اس سے  
 اتنی دور چلا گیا تھا۔ کہ اُسے پانا مشکل لگ رہا تھا۔  
 بابا جان نے یہ کیسا ظلم کر دیا تھا اُس کے ساتھ۔ مانا کہ اُس نے بھی بابا جان  
 کو اُن کی مرضی کرنے کا اختیار کبھی بھیجا تھا۔ مگر۔ وہ کیا کرتا۔  
 اور پھر کیا وہ نہ لکھتا تو بابا جان اُس کی مان لیتے؟  
 "ہمیں۔ تمہاری پسند کی لڑکی سے روکتے ہوئے! ہمیں افسوس ہوا  
 تھا۔ اُسے ایک بار پھر ناھر کے الفاظ یاد آ گئے۔ اور ناھر کی اسی بات کو  
 سنے کا سہارا سمجھ کر ابھی کل ہی اُس نے ناظم کے ہاتھ ایک بار اور بابا جان کو  
 اپنی بھیدی لکھ بھیجی تھی۔ پتہ نہیں خط پا کر اُن کا کیا ردِ عمل ہو گا۔  
 ناظم بھی ابھی تک واپس نہ لوٹا تھا۔

"ٹھک۔ ٹھک۔ ٹھک" دروازے پر دستک ہوئی۔  
 "ناھر! اُس کے دل نے کہا۔ اُس کے دستک دینے کے انداز پر بھی وہ  
 دھوکہ کھا سکتا تھا۔

"COME IN" ہاتھ بڑھا کر لیمپ آن کرتے ہوئے بولا۔  
 "ہیلو شان! اندر آتے ہی وہ بستر میں ہی اُس سے جا پٹا۔  
 "ہیلو" شان نے اُسے ماتھے پر بوسہ دیا۔  
 "کیسے ہو یار۔! وہ اُس کے بستر میں گھس گیا۔  
 "خائین" اُس پر کبیل ٹھیک کرتے ہوئے وہ بستر سے نکل آیا۔  
 کرے کی باقی بتیاں بھی جلا دیں۔

”تم سناؤ اتنا رات کو کیسا خیال آیا۔“ سینک گاؤن پہنتے ہوئے  
 اُس نے پوچھا۔ اُس کی آمد پر وہ بے حد خوش لگ رہا تھا۔  
 ”بس بیٹا کچھ نہ پوچھو۔“ نوٹ کھول کر ادھر ادھر لڑھکاتا۔ وہ ابھی  
 طرح بستر میں گھس گیا۔ شان دھیرے سے سُکرا دیا۔  
 ”تھی۔ ناظم نافر کا بیگ لے آ گیا۔“ ناظم کھانا۔“ اُسے دیکھتے ہی نافر بولا۔  
 ”ادھر صاحب۔؟“ ناظم نے پوچھنا مناسب سمجھا۔  
 موسم میں فرق آچلا تھا۔ وہ چھینے والی سردی کا نہ رہی تھی۔ شدت کی  
 سردی کے دنوں کے علاوہ وہ شان کمرے میں کھانا پسند نہیں کرتا تھا۔  
 ”اور کہاں۔ آدھی رات کو میں کھانا کھانے ڈرائنگ روم میں جاؤں گا۔  
 پکایا کیا ہے۔؟“ نافر نے کہا۔

”نقش ہے سرکار۔ ابھی تیار کر داتا ہوں سباتی جو آپ حکم کریں۔“  
 ”تم بتا دو نا۔ جو کھانا ہے۔“ شان اُس کے سامنے ہونے پر بیٹھتے  
 ہوئے بولا۔ اُسے معلوم تھا کہ نافر کو مچھلی خاص پسند نہ تھی۔  
 ”بس اچھی سی کوئی چیز بنا دو۔ مزیدار اور کوئی بھی۔“  
 ”بہتر صاحب!“ ناظم چل دیا۔

”سناؤ اب کیسے ہو۔؟“ نافر کر دٹ اُس کی طرف لے کر کہنی کے بل  
 لیٹ گیا۔

”گزر رہا ہے۔ تم بتاؤ۔ اتنا دیر سے کیوں ابھیچا۔“  
 ”بس یونہی جی میں آیا۔ اپنے یار کو مل آؤں۔ کل فرائے ڈس ہے نا۔ چھٹی ہے۔“



”یہ تو بہت اچھا کیا۔ یار بھی تم کو بہت یاد کر رہا تھا۔“

”مگر تھک بہت گیا ہوں۔“ ناھر ٹانگیں سیدھی کرتے ہوئے بولا۔

”ظاہر ہے۔ ڈیوٹ کے بعد سیدھا چلا ہوگا۔“

”ارے یار کیا بتاؤں۔“ اُسے اچانک ہنسی آگئی۔ سر تکیوں میں دیدیا۔

”خیریت ہے۔ ہنستا کیوں ہے۔؟“

”اب ہنسی پر بھی ٹیکس لگا لو۔ تم باپ بیٹے بھی عجیب مخلوق ہو۔“

”یار تم واقعی LUCKY ہے۔“ اُسے ہشاش بشاش دیکھ کر شان

بھی آہستہ سے ہنس دیا۔

”اب لگا لو۔ نظر مجھے۔“ تیکے مسہری کی پشت سے لگاتے ہوئے وہ

سیدھا ہو بیٹھا۔

”اچھا چھوڑو۔ ٹھینہ کھا بی کا کیا حال چال ہے۔؟“

”حال تو ٹھیک ہے۔ چال البتہ....“ کپٹی کھجاتے ہوئے ناھر نے کچھ ایسی

شکل بنائی کہ شان بھی روز سے ہنس دیا۔ ”تم بھی کیا چیز ہے۔“

”بہت کام کی چیز ہوں۔“

”وہ تو ہے۔“ شان پھر سنجیدہ ہو گیا۔

”شان۔“ ناھر نے کہا۔ اور شان نے خوب صورت آنکھیں اس پر جمادیں۔

کتنا گھنا حال بنا ہوا تھا وہاں۔ مایوسیوں کا۔ ناامیدیوں کا۔ دکھوں کا۔

پریشانیوں کا۔

”شان۔“ پرکشش گری کر سٹلر اب بھی ناھر پر جمے ہوئے تھے۔

”شان۔“ ناصر نے پھر پکارا۔

”یس۔“ اسٹون گرے کر سٹلز پورے دا ہو گئے۔

بار بار ناصر کا پکارنا بھی اُسے اُس کی شرارت کا کوئی انداز لگا۔

وہ دھیرے سے ہنس دیا۔ اور۔ ناصر کو شان پر ترس آ گیا۔

کتنے خوبصورت دن تھے کچھ عرصہ قبل کے۔ شان اسی خوبصورتی سے  
ہنس دیا کرتا تھا اُس کی ادٹ پٹانگ باتوں پر۔

مخصوص ہنسی تھی۔ اُس کی۔ مدھر۔ دل موہ لینے والی۔ اب تو وہ  
اُس کی ہنسی، اُس کی مسکراہٹوں کو ترس گیا تھا اُس نے ایک گہری سانس لی۔  
”غم جاناں بھی کیا چیز ہے۔“

شان اب بھی اُسے دیکھ رہا تھا۔ مگر چہرے پر زردی کھنڈائی تھی۔  
”کلام کیسے ہو رہا ہے۔“ پچھتاتے ہوئے ناصر نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔  
”بس ہو رہا ہے۔“ شان مجھ گیا تھا۔ ناصر اٹھنے لگا۔

”کیوں۔؟“ شان نے معلوم کیا۔

”منہ ہاتھ دھوؤں ذرا۔“ ناصر نے کہا۔

”SURE۔“ شان مسکرا دیا۔ ادا کی اسے۔

آتے ہی تو وہ بستر میں گھس گیا تھا۔ اب چلا تھا منہ ہاتھ دھونے۔ کیا  
لاپرواہ قسم کا انسان تھا۔ تبھی کریم بابا کھانے کی ٹرے لئے اندر آ گئے۔

صوفے کے قریب رکھی میز پر برتن رکھ دئے۔ چکن روٹ تھا۔  
فرائی مچھلی تھی۔ سیخ کباب تھے۔ آملیٹ تھا۔ شان ہوئے سے مسکرا دیا۔



آملیٹ کے بغیر ناصر کو کھانا ادا ہو رالگتا تھا۔ بھی جانتے تھے۔ اور۔  
وہی ہوا۔ واپس آکر۔ ناصر سب سے پہلے آملیٹ پر ٹوٹ پڑا۔  
کھانے کے بعد دونوں نے کافی پی۔ اور کریم بابا برتن سمیٹ کر لے گئے۔  
”اوسکے شان“ ناصر اٹھ کھڑا ہوا۔ اب سوتا ہوں جا کر ایک بج چکا  
ہے۔“ اُس نے گھڑی پر نظر ڈال کر کہا۔

”ہاں سونا چاہئے“ شان بھی اٹھا۔

”صبح مجھے بھی سویرے چکا دینا۔ تھوڑی گپ شپ کریں گے۔ پھر....  
پھر.... کچھ ضروری کام کروں گا۔ اور واپس ڈیوٹی پر بھی جاؤں گا۔“  
”کیا ضروری کام ہے۔“ اُس کے ”پھر.... پھر“ پر اٹک جاتے پر شان  
مکرا کر بولا۔

”اپنی سسرال جانا ہے ذرا۔“ سر سے کیپ چہرے پر لا کر وہ آہستہ  
سے بولا۔

”ادہ“ شان پھر ہنس دیا۔ ”ٹھیک ہے جگادروں گا۔“  
”گڈ نائٹ“ ناصر دروازے سے نکلے نکلے بولا۔  
”گڈ نائٹ“ مسکراتے ہوئے شان نے دروازہ بند کر دیا۔ اور تھکا  
تھکا بستر پر پڑ رہا۔ اب کے اُسے جلدی ہی نیند آگئی۔  
صبح جب غلات پھر سویرے ہی سویرے آنکھ کھلی گئی۔  
کریم بابا بیڈ ٹیبلٹس منتظر تھے۔ ”گڈ رازنگ بابا۔“  
”صبح بخیر میا! چھوٹی سی خوبصورت لڑکی اہوں نے بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھ دی۔“

"بابا ناصر کو بھی جگادیں۔ اُس کا واسطے بھی چائے ادھر لائیں۔"

"اچھا سرکار۔ بابا چل دیئے۔"

وہ اٹھا۔ منہ ہاتھ دھویا سکرے میں واپس آیا۔ ناصر اس کے بستر میں گھسا بیٹھا۔ اُس کی چائے پینے میں مصروف تھا۔

"گڈ مارننگ۔" شان مسکراتے ہوئے قریب چلا آیا۔

"گڈ مارننگ۔" ناصر نے ایک بڑا سا گھونٹ بھرا۔ اور تھکی بابا۔ ناصر کو بھی چائے لے آئے۔ ناصر کو شان کے کپ میں پیتے دیکھ کر وہ دوسری

پیالی میں شان کے لئے بنانے لگے۔

"تھینک یو بابا۔ آپ چائے۔ میں خود بنائے گا۔"

اور بابا مکر سے باہر نکل گئے۔

شان کُرسی قریب کھینچ کر ناصر کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ "رات کیسا گزرا؟"

پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے اُس نے پوچھا۔

"فرسٹ کلاس۔ تم سناؤ کتنی کروٹیں بدلیں۔"

اور۔ شان ہولے سے مسکرا دیا۔

"کل ماحول جان آئے تھے۔" ناصر اچانک بول پڑا۔ رات اُس نے

بتانا مناسب نہ سمجھا تھا۔

"تمہارا پاس۔؟" شان بے یقینی سے پوچھنے لگا۔

"ہاں۔" ناصر نے کہا۔

"کیوں؟" وہ بے چینی سے بولا۔



”وہی ہمتارے خط کے بارے میں۔ تم نے انہیں لکھا تھا نا کچھ شادی نہ کرنے کے بارے میں۔“

”یس۔ کیا بولتا تھا۔؟“ وہ بے تابی سے بولا۔

”یہی کہ جو ہونا تھا سو چکا۔ اب وہ اپنا فیصلہ نہیں بدل سکتے۔“

”سچ کہتا ہے۔؟“

”بالکل سچ۔ یہ بھی کہتے تھے کہ تم نے انہیں اتنا بے غیرت کیسے سمجھ دیا ہے

کہ وہ اُس گھر میں انکار بھجوا کر بے عہدی کریں گے۔“ ہاتھ میں پکڑی پیالی شان سے واپس میز پر رکھ دی۔

”چلے تو تہ چھوڑ دیا۔ رات بھی تمہیں اس لئے نہیں بتایا تھا کہ تم سونا

بھی چھوڑ دیں گے۔“ پیالی اُس نے واپس اُسے تھما دی۔

”تم سیریس ہے۔ سچ کہتا ہے۔“ چلنے کیوں یہ سب بھی شان کو ناصرا کا

کوئی ڈرامہ لگا رہا تھا۔

”میں واقعی سیریس ہوں۔ ماماں جاننا یہ بھی کہتے تھے کہ اگر تم نے اُن کی بات

نہ مانی تو کفن میں بھی اپنا منہ نہیں دیکھنے دیں گے۔

شان گم قسم۔ اُس کا منہ تگڑا رہا تھا۔

”ویسے میں اُن کو سمجھا دوں گا۔“ تم فکر نہ کرو۔ وہ دوسری پیالی بھرنے

لگا۔ شان نے نظریں اٹھا کر اُسے دیکھا۔

ناصر نے دیکھا اُس کی نظروں میں مایوسیوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔

”یار یہ تو اُن کا پیغام تھا۔ جو میں نے تمہیں دیا۔ اب آگے کیا ہوتا ہے۔ یہ تو

اللہ ہی بہتر جانتا ہے نا۔ وہ اطمینان سے بول رہا تھا۔

شان اب بھی اُسے دیکھ رہا تھا۔

”کچھ نہ کچھ تو بندوبست ہو ہی جائے گا۔“ اُس نے کپ منہ سے لگا لیا۔

”بندوبست کیا ہو گا۔ بس میں لڑکی کے گھر اٹھا کر تلہ ہے۔“

”پھر بھی تمہیں کفن میں منہ نہیں دکھائیں گے۔“ اُس نے ایک لمبا

گھونٹ بھرا۔

”تو ہم کیا کرے پھر۔“ شان اُس کی بے نیازی پر جھنجھلا اٹھا۔

”کچھ سوچیں گے۔ فی الحال تم خاموش رہو۔“

”یعنی...“ اُس نے پوچھا۔

”سردست وہیں شادی کر لو۔ جہاں ماموں جان کہتے ہیں۔“

”کیا مطلب۔؟“

”ہاں۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔“

”مذاق چھوڑ دیار۔“

”مذاق کون کمبخت کر تلہ سمجھتم شادی کر تو لو۔“

”پھر۔ پھر کیا ہو گا۔؟“

”پھر دوسری شادی کر لو۔“

”یعنی تمہارا مطلب ہے...“

”ہاں۔ پھر دل چاہے تو تیسری کر لو۔ بلکہ کرتے جاؤ۔...“

”ناھر۔“ کپ میز پر رکھتے ہوئے شان چلا یا۔



"RELAX, RELAX" اُس نے آخری گھونٹ پیر کر پیالی میز پر رکھ دی۔ مجھے سوچنے دو۔ کوئی نہ کوئی حل نکال ہی لوں گا۔  
 "مجھے تمہارا یقین نہیں ہے۔" وہ مدھم پڑ گیا تھا۔ اور بے یقینی کے عالم میں ناصر کو دیکھ رہا تھا۔ اور ناصر دل کھول کر ہنس دیا۔  
 "اچھا سر۔ اب اجازت دیں۔ پھر حاضر ہوں گے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔  
 "No۔ پہلے مجھ کو ٹھیک کٹیک بات بتاؤ۔" شان نے اُسے ہاتھ سے پکڑ کر پھر وہیں بٹھا دیا۔

"یا اللہ! میں کہاں بچس گیا۔ ناصر نے سرد و نوں ہاتھوں میں تھام لیا۔  
 "بتاؤ۔" اُس نے پھر کہا۔  
 "کیا بتاؤں یا۔"

"بابا جان آیا تھا تمہارے پاس۔؟"  
 "ہاں۔" ناصر نے کہا۔  
 "کیا کیا بولا تھا۔؟"  
 "بتاؤ دیا سب۔"  
 "کیا۔" شان بولا۔

"یہی کہ تمہاری شادی دیر ہوگی۔ جہاں وہ چاہیں گے۔ یعنی جہاں وہ تمہاری منگنی کر دیا چکے ہیں۔ یہ ان کا آخری فیصلہ ہے۔"  
 "ہوں۔" شان کو جیسے یقین آ ہی گیا۔  
 "مجھے انداز نہ تم کو سمجھا کر بھیجا تھا۔"

”SEE, ا“ شان کی آنکھوں میں گہری مایوسی تھی۔

”مگر اب۔ تمہاری حالت دیکھ کر ہم نے سوچا ہے کہ جا کر انہیں ہی سمجھانا پڑے گا۔“ ناہر نے کہا۔

”پلیز ناہر۔ بابا جان کو سمجھاؤ۔ ہم یہ شادی واقعی نہیں کر سکتا۔“  
 ”اوسکے ابھی سمجھاتا ہوں۔“ اور آگے بڑھ کر اُس نے ٹیلیفون پر  
 شاہان احمد کے نمبر ڈائل کر دیے۔ بیل جانے لگی۔ چند لمحے رسیور کان سے  
 دگائے وہ منتظر رہا۔ اور پھر سلسلہ مل گیا۔

”جی ماموں جان۔ میں نے سمجھا دیا ہے۔ جی۔ جی۔ بالکل۔ وہی  
 کرے گا جو آپ کہیں گے۔ DON'T WORRY۔ بالکل آپ بے فکر ہو کر  
 تیاری کریں۔ جی ہاں۔ جی۔ او۔ کے۔ ٹھینک یو۔ خدا حافظ۔“  
 ”YOU BAS.....“ شان دھاڑا۔

”یار میں کیا کرتا۔ ماموں جان کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔“ کل تم  
 دیکھتے تو اندازہ کرتے۔ وہ.....“

”میرا حالت ٹھیک ہے۔؟ میرا اندازہ کوئی کرتا ہے۔؟“  
 ”شان سمجھنے کی کوشش کرو۔ انہوں نے تمہارے لئے بہت تکلفیں  
 اٹھائی ہیں۔ بڑی قربانیاں دی ہیں۔ ڈھیر سارے خواب دیکھے ہیں تمہاری  
 خوشیوں کے.....“

”میرا خوشی۔؟ ہو نہ۔“ اُس نے سر جھٹکا۔

”ہاں تمہاری خوشیوں کے۔ اس وقت تمہیں یہ سب غلط لگ رہا ہے۔“



مگر ٹھنڈے دل سے سوچو گے تو سمجھ جاؤ گے کہ وہ غلطی پر نہیں ہیں۔

”میں ٹھنڈے دل سے سوچ کر چکا ہے۔“

”ایک بار اور سوچ لو.... یہ نہ ہو کہ کل کو اس گھڑی کو بچھتاؤ۔“

شان نے ایک نظر اُسے دیکھا۔ اس کا مطلب ہے۔ تم بھی وہی

چاہتا ہے۔ جو بابا جان چاہتا ہے۔“

”ہوں۔ میرا خیال ہے وہ حق پر ہیں۔“

”اوہ۔“ اُس نے ہنسیاتی انداز میں کہا۔

ناصر نے اُسے بغور دیکھا۔ وہ کس قدر بے بس۔ پریشان لگ رہا تھا۔

”ہم ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔“

”کہ میں ماموں جان کی سائیڈ لوں گا۔“ شان اُسے دیکھنے لگا۔

”مجھ کو یقین تھا کہ تم میرا کام کر دے گا۔“

”میں.... مجھ سے اُن کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ شان یقین کر۔“

”میں....“ ناصر نے بے بسی ظاہر کی۔

”بس میں سمجھ گیا۔“

”شان پلینر۔! مجھے غلط مت سمجھو۔ میں مجبور ہو گیا ہوں۔“ شان نے

اُس کی طرف دیکھا۔ شان کی نظروں میں طنز تھا۔

”اب چلوں۔ دیر ہو رہی ہے۔“ ناصر دروازے سے نکلا۔ تو شان بھی

پیچھے چلا آیا۔ ایک نظر شان پر ڈالتا ناصر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ”گڈ بائے۔“ شان

کا ہجہ بھاری تھا۔ ”گڈ لک اینڈ گڈ بائے۔“ ناصر ہنس دیا۔ اور گاڑی چل پڑی۔

آج آفس میں بہت کام تھا۔ وہ سائٹ پر بھی نہیں جا سکا تھا۔ صبح سے وہیں بیٹھا۔ کئی کاغذات، کئی فائلوں سے نمٹ چکا تھا۔ ریمارکس لکھتے لکھتے دستخط کرتے کرتے اُس کی انگلیاں تھک گئی تھیں۔

بین ایک طرف رکھ کر مٹھی بند اور کھولنے لگا۔ توا حس ہوا۔ ذہن اس سے کہیں زیادہ۔ کئی گنا تھکا ہوا۔ اور لامتناہی دزنوں تلے دبا ہوا تھا۔ نڈھال ہو کر اُس نے سر کرکی کی پشت سے ٹیک آنکھیں موند لیں۔  
 ”بابا جان“ ایک خاموش کراہ اُس کے لبوں پر مچلی۔  
 ”کس امتحان میں ڈال ہے آپ نے بابا جان۔؟“

ناصر کو گئے آج تیسرا دن تھا۔ اس دوران وہ برابر سوچتا رہا ناصر اُسے بہر حال بے قصور نظر آیا۔

بابا جان!۔ وہ بھی حق پر تھے۔

قصور دار۔! شاید وہ خود تھا۔! غرارادی طور پردہ ہاتھ سے مارتا تھا سہلانے لگا۔ پھر آنکھیں کھول دیں۔ دوبارہ میٹر پر جھک آیا۔  
 ابھی تھوڑی دیر قبل اُس کا پی سائے ڈاک لایا تھا۔ کام میں مصروف



ہونے کی وجہ سے وہ دیکھ نہ سکا تھا۔ دُھیر سارے لفافے تھے۔ ہاتھ بڑھا کر اُس نے قریب کھینچ لئے۔ ایک ایک کر کے دیکھنے لگا۔ کئی کاروباری تھے اور چند غیر کاروباری خطوط تھے۔ دعوت نامے تھے۔ سب نمٹ کر وہ دعوت نامے دیکھنے لگا۔

ایک تو ٹھیکیدار جانِ عالم کی بیٹی کی شادی کا تھا۔ ایک آرچی کلب کی طرف سے تھا۔ ایک سیٹھ حامد علی کے یہاں سے ڈنر کا۔ ایک آرٹ گیلری والوں کی طرف سے ایک فنکشن پر بحیثیت گیٹ آف آئر۔ سب ایک طرف رکھ کر۔ اُس نے ایک خالی خالی نظر اُن پر ڈالی۔ جانِ عالم صاحب کے یہاں بابا جان شاید جاسکیں۔ پھلی یار اُن کے بیٹے کی شادی پر کبھی نہ جاسکے تھے۔

آرچی کلب۔ وہ معذرت کھینچ دے گا۔

سیٹھ حامد علی۔ ایک پل کو ٹینا اُس کے تصور میں ابھری۔ ان انویٹیشنز کا سبب زیادہ تر وہی تھی۔ ایک بے جان سی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر ابھری۔ کیا کرے گا۔ وہاں جا کر۔

آرٹ گیلری۔ وہاں جانا اُس نے ایک قسم کی ذمہ داری سمجھا۔ کارڈ اٹھایا۔ تاریخ دیکھی۔ چند دن تھے ابھی۔ بیل دیا۔ پی اے آیا۔ فنکشن کی تاریخ نوٹ کر والی۔

گھڑی دیکھی۔ تین بج رہے تھے۔

اُٹھ کر وہ آفس سے باہر نکل آیا۔

فلکشن ختم ہو چکا تھا کافی دیر دیر سے گزرا تھا۔

کئی ہزار سال میں نام نہ بھی تھا۔ اور اس کے ساتھ زین بھی۔

وہ جانتے کہ "بالا سے باہر نکلا تھا۔ تو ناصر زین کو ایک طرف

بکھڑا کر کے اُسے ملنے آیا تھا۔ اُس نے اُسے اپنا آپ کتنا غیر لگا تھا۔ !

جانتے کیوں۔ کوئی حق نہ پاتے ہوئے ہیں۔

اُس نے نظریں اُٹھا کر فی سب سے پر کھڑی زین کو دیکھا تھا۔

ناصر بڑی میں تھا۔ شام ہونے کو تھی اور زین کو چھوڑ کر اُس نے

واپس بھی جانا تھا۔ دو چار باتیں کر کے وہ چل دیا۔

پتہ نہیں کیوں۔ وہ دو قدم ساتھ تو پیش نہ دے سکا۔ وہیں بکھڑا

اُسے زین کی جانب بڑھتے دیکھتا رہا۔

اور پھر۔ اُسے اپنا آپ پہلے سے کہیں بڑھ کر۔ ٹوٹا ہوا۔ بکھرا ہوا۔

رینہ رینہ۔ چرچور لگا۔ اُس نے رخ واپس پھیر لیا۔

"ہیلو ذیشان ! " مینا اُس کی جانب بڑھ رہی تھی۔

وہی شوخ رنگوں میں لپٹی بیٹا رہا۔



”ہیلو“ وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

”آپ ڈنر پر نہیں آئے“ ٹینا نے کہا۔

”ہم نے فون کر کے سیٹھ صاحب کو بتا دیا تھا کہ ہم نہیں آ سکتا۔“

وہ معذرت کے لہجے میں بولا۔

”I KNOW THAT“۔ لیکن پھر بھی آپ کو آنا چاہئے تھا۔“

وہ اُس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔

”I AM SORRY, I WAS REALLY VERY BUSY“

وہ متانت سے بولا۔

”اور اس وقت۔؟“ بیبا کی کہ سنا تھا ساتھ اُس کی آنکھوں میں التجا تھی۔

”انٹرکون میں ڈنرے گا۔“ اس کے بعد گاؤں جلے گا۔“

”اوہ۔ ونڈرفل۔ پو تو ہم بھی ساتھ دیں گے۔“

”AS YOU WISH“۔ وہ کوئی بہانہ نہ کر سکا۔

”آپ جلیے۔ I WOULD GET RID OF THAT CHAP.“

وہ ایک آنکھ میچ کر بولی۔

”ایکسکیوز می“ وہ لوگ میرا انتظار کر رہا ہے۔ ڈنر پر ملاقات ہو گا۔“

اُسے فاصلے پر کھڑے اُس کے منتظر آرٹ گیلری کے عملے کا خیال آیا۔

”OH I SEE“۔ ٹینا بولی۔ اور واپس مڑ کر اپنے بوسے فرینڈ سے

جاملی۔ غیر ادا دی طور پر شان کی نظریں اس طرف اٹھیں۔

ایک پھیکا سا بٹم لبوں پر اُبھرا۔

اور نپے تلے قدم لیتا۔ وہ عملے سے جا ملا۔

زرین اور ناصر کو نے دالی میز پر بیٹھے تھے۔ ناصر کھانے کا آرڈر دے چکا تھا۔ مگر بیراہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔  
ٹیسل پہنچے جب آدھ بڑی بے تالی سے کھانے کا منتظر تھا۔  
معاذہ چونکا۔ شان اندر داخل ہوا تھا۔  
ایک پل کو اُس کے دل میں آیا۔ اُسے وہیں بلالے۔ مگر پھر زرین کا خیال آ گیا۔ عجیب سے پوزیشن ہو جاتی تھی دونوں کی۔  
خاموشی سے بیٹھا دیکھتا رہا۔ زرین کی نظریں بھی اُس کی اٹھ گئیں۔  
شان وقار سے چلتا ایک ٹیسل کی طرف بڑھا۔ ناصر اور زرین کی نظریں نے تعاقب کیا۔

ناصر چونکا۔ وہاں پہلے سے ٹینا حامد علی بیٹھی تھی۔

”میں پورے پندرہ منٹ سے ویٹ کر رہی ہوں ڈیر“

ناصر نے ایک نظر زرین کو دیکھا۔ اور زرین کا دل بیٹھ سا گیا۔

ابھی کچھ دیر پہلے آرٹ گیلری میں بھی جب ناصر شان سے رخصت ہو کر اُس کی طرف بڑھا تھا۔ تو ٹینا شان سے آکر ملی تھی۔

تب اُس نے اُسے صرف اتفاق سمجھا تھا۔ ناصر ہنس دیا۔

”یہ ٹینا حامد علی ہے“ زرین کو بخوردیکھتے ہوئے وہ گویا ہوا۔

”میں جانتی ہوں اسے۔“ زرین کا چہرہ تاریک سایلوں کی پیٹ میں تھا۔



بیر آکر کھانا لگانے لگا۔

پھر لٹھوں میں ہی خالی ٹرے لئے واپس چل دیا۔

”ارے رہنے بھی دو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ ناصر مزید بولا۔

”کیا ٹھیک ہو جائے گا۔؟“ زرین قدرے سنبھل کر بولی۔

”یہی۔“ یسنا حامد علی سے میل جول۔“ اُس نے چاول اپنی پیٹ میں

ڈالے۔“ شادی کے بعد خود ہی ختم ہو جائے گا سب۔“ وہ بہت اطمینان سے بول رہا تھا۔

”کیا مطلب۔؟“ زرین کے شہرے کو تقویت ملی۔

”تمہیں کچھ معلوم نہیں۔؟“ چچ منہ کی طرف لے جلتے جلتے وہ

ہاتھ روک کر اُسے دیکھنے لگا۔

”کیا۔؟“ زرین نے حیرت سے پوچھا۔

”اچھا چھوڑ دو۔ کھانا کھا لو۔ پھر بتاؤں گا۔“

زرین زیادہ تر پوچھ سکی۔ چپ چاپ کھانا نکلنے لگی۔ تھوڑا سا

کھایا بھی۔ مگر ذہن و دل میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔

”چلے ناصر بھائی۔“ ناصر کے کھانا ختم کرتے ہی وہ بولی۔

ناصر نے بل ادا کیا۔ اور دونوں خاموشی سے باہر نکل آئے۔

”یسنا حامد علی کے ساتھ آئیے چل رہا ہے آج کل جناب کا۔“

گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی ناصر بولا۔

زرین کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

”ماسوں جان کو لکھ بھیجا ہے کہ وہ سنگی کا پابند نہیں رہ سکتا۔ سنگی  
 ترطادی جائے۔“ زرین کو اچانک اپنی بے پناہ توہین کا احساس ہوا۔  
 ”ماما آئی تھیں کچھ دنوں انی کے پاس۔؟“ وہ سڑک نظریں جمائے  
 پھر بولا۔ ”ہاں۔“ زرین نے جواب دیا۔

”انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔؟“

”نہیں۔!“ زرین بولی۔

”بے چاری کہہ نہ پائی ہوں گی۔“ ناصر نے کہا۔

زرین کی کنپٹیاں سلگ رہی تھیں۔

”تم اتنی سے کوئی ذکر نہ کرنا۔ میں خود سنبھالوں گا۔“

”کیا سنبھال لیں گے۔؟“ اُس کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔

”شان کو سمجھاؤں گا۔“ ناصر اُداس سا بولا۔

”کیا سمجھائیں گے؟“ طنز کے ساتھ ساتھ لہجے میں تلخی گھل گئی تھی۔

سنبھال کر قدرے بیٹھتے ہوئے وہ ناصر کی طرف دیکھنے لگی۔

”یہی کہ پورے خاندان کی عزت کا سوال... ہے...“

”ناصر بھائی۔ آپ ایک لفظ بھی نہیں بولیں گے۔ وہ سختی سے بولی۔

”پھر۔ کیا تماشا دیکھوں گا۔“

”سنگی توڑنا چاہتا ہے نا۔“ ناصر رخ موڑ کر اُس کی طرف دیکھا۔

”تو یہ لیجئے۔“ اُس نے سنگی کی انگوٹھی اُتار کر اُسے تھما دی۔ ”میں

زبردستی کی قائل نہیں ہوں۔“ ناصر نے آنکھیں پچائیں۔ انگوٹھی جیب میں



ڈالی۔ اور خوبصورت سی دھون گنگنا تا سامنے دیکھنے لگا۔

زرین نے ایک نظر اُسے دیکھا۔ ہر بات۔ ہر موقع پر راضی خوشی یہی تو ناصر کی خوبی تھی۔ گہری سانس لے کر وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

”ہاں۔ تو تم کہہ رہی تھیں کہ ہماری شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ماموں جان زیور کا...“

”ہاں آپ کے ماموں جان زیور کا آرڈر دیں گے۔ پسند تو آج ہم نے کر ہی لئے ہیں۔“ لہجے کی تلخی ہنور برقرار تھی۔

”اور باقی کی شوپنگ تمینہ کو ساتھ لے کر کر دو گی۔“

”جی نہیں۔ وہ کہتی تھیں کہ وہ میری امدادی کی پسند کی ہونی چاہئے۔“ وہ اب بھی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

”سب کتنے اچھے ہیں۔ تمہیں امدادی کو کتنا چاہتے ہیں۔“

زرین رُخ پھیر کر ناسر کو دیکھنے لگی۔

”یہ شان کا بچہ بھی....“ ناصر بڑبڑایا۔

”ناصر بھائی۔ آج یہ نام آپ میرے سامنے آخری بار لے رہے ہیں۔ آئندہ

میں کسی قسم کا ذکر سننا پسند نہیں کر دوں گی۔“

”اوکے۔ اوکے۔ میں جلد ہی یہ انگوٹھی اُس کو پہچا دوں گا۔ آگے وہ جلنے۔“

”اُس کا کام۔ اور تم اتنی سے کسی قسم کا ذکر نہ کرنا۔ میں سب ٹھیک کروں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ اُس نے کہا۔ مگر رات کو۔ وہ سونے کے لئے بستر پر

لگی۔ تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔





لٹ گیا تھا میرا۔ بس گیا ماموں جان کے پاس بیدھا کہ بیٹے کی زندگی چاہتے  
ہیں تو یہ سنگنی ختم کر دیں۔ رہ گئی آپ کی بے عہدی کی بات۔ تو وہ آپ  
کہیں اور بھی عہد کر سکتے ہیں۔ بیٹے کی زندگی۔ وہ بھی اکلوتے بیٹے کی۔ تو  
واپس نہیں آ سکتی تات۔ اُس نے دو مال نکال کر فرنی آنسو پونچھے۔

”بس کرو FOR GOD SAKE۔“ شان کو ہنسی آگئی۔ ”پتہ نہیں اب  
یہ سچ بھی ہے یا ڈرامہ کر رہا ہے۔“

”ڈرامے تو بہت کر لئے۔ اب تو یہ کر لی ہے۔ یہ بالکل سچ ہے۔“  
”اچھا پورا بات تو سناؤ۔“

”پوری بات سنائی ہے۔ میں ہر کا ٹھیکہ اور اختصار سے کرتا ہوں۔  
پہلے بیدھا گیا ماموں جان کے پاس۔ ہتھار اہالت زار کا نقشہ کھینچا۔ رو  
پڑے سن کر۔۔۔۔۔“

شان بے اختیار قہقہہ لگا اٹھا۔

ناہرنے بھی قہقہہ لگایا۔ ”اُس کے بعد زکا نہیں۔ بھاگا بھاگا گیا۔ اور  
رہی کو وہ پٹی پڑھائی۔ وہ پٹی پڑھائی۔۔۔۔۔“

”پٹی باندھا۔ پٹی پڑھائی نہ۔“ شان کا انداز فخر یہ تھا۔

ناہرنے ایک نظر اُسے دیکھا۔ پھر ایک گہری سانس لی۔

”ہاں تو میرا مطلب ہے۔ میں نے اُسے سمجھایا۔ فون پر کہ۔ شان اس

سنگنی سے خوش نہیں ہے۔ اور ایک عقلمند اور تعلیم یافتہ لڑکی ہو کر اُسے  
شان پر زبردستی مسلط نہیں ہونا چاہئے۔ بس پھر کیا تھا۔ اگلے ہی دن انگوٹھی



مانوں جان کے پاس پہنچ چکی تھی۔ انھوں نے مجھے فون کر کے بلایا، انگوٹھی تھائی۔  
 اور بولے کہ شکریہ ہے۔ میرا بیٹا جان سے نہیں گیا۔  
 ”سچ کہتے ہو۔“

”ہمہماری قسم۔“ اُس نے انگلی شان کی ناک پر دھری۔  
 شان نے ہاتھ مارا۔ تو لڑکھڑا کرناھر اُس سے جا پٹا۔  
 ”ایکڑ ہے پورا۔“ شان نے اُس کا سر اوپر اٹھایا۔ ”یہ سب سچ بھی کہا  
 ہے۔“ اتنی آسانی سے یہ سب ہو جاتا۔ اُسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔  
 ”یار سچ ہے نا۔ اگر نہیں مانتے تو دیدوانگوٹھی۔ واپس کر آؤں گا۔  
 لڑکی کو۔۔۔۔۔“

”نہیں۔“ شان نے کہا۔

”اچھا اس طرح یقین نہیں آتا۔ تو دیکھ تو لو یہ انگوٹھی۔ ممانی جان  
 مرحومہ کی ہے یا نہیں۔ یاد ہے ایک بار سیف میں چیزیں رکھتے ہوئے ماملے  
 مانوں جان کی موجودگی میں ہمیں یہ انگوٹھی دکھاتے ہوئے کہا تھا۔ نہ ممانی  
 جان کی یہ انگوٹھی شان کی دلہن کے لئے بڑے صاحب نے رکھی ہے۔  
 اور شان نے مٹھی کھول کر ایک نظر انگوٹھی کو دیکھا۔ کچھ کچھ اُسے بات  
 میں صداقت نظر آئی۔“ تو اس کا مطلب ہے۔ اب ہم آزاد ہے۔“  
 ”بالکل۔“ ناصر نے کہا۔ شان پھر انگوٹھی دیکھنے لگا۔  
 چہرہ دلی مسرت کا آئینہ دار تھا۔ ”تو اب باقی کا کام بھی کر دے نا۔“  
 ”گولنا۔؟“ ناھر نے شرارت سے پوچھا۔



”یہ اُس کو بہتا دے جا کر۔ وہ معصومیت سے بولا۔  
”کس کو۔“

”زی کو۔“

”تمہیں شاید یاد نہیں رہا۔ اُس کی بھی بات پکی ہو چکی ہے۔“  
”کیا۔ اوہ۔ وہ ڈاکٹر کا بچہ کے ساتھ۔“

”ہاں۔“

”وہ کیا چیز ہے۔“

”I DON'T KNOW۔ بس اب اپنے گاؤں جاؤں گا۔ میں نے

اتنا ہی کہنا تھا۔“

”تھوڑا ٹھہرو۔ ہم بھی جانے والا تھا۔“ وہ کپڑے بدلنے ڈرلنگ روم  
کی طرف بڑھا۔

”میں تو اپنے گاؤں جا رہا ہوں۔ پٹواری کو وقت دیلے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں بھی چلا جائے گا ساتھ۔ پھر داپسی پردات بابا جان کے پاس  
آجائے گا دونوں۔ بابا جان گاؤں میں ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“

”تم اپنی دیر میں ان کو رنگ کر دو۔ ہم دونوں رات کو پہنچے گا۔“  
”اچھا جلدی تیار ہو جاؤ۔ آگے بڑھتے ہوئے ناصر ٹیلیفون پر سید لیدر اٹھالیا

ادر پھر تھوڑی ہی دیر میں دونوں پہاڑ کا پریچ راستہ اُتر رہے تھے۔

”گھاؤں میں کوئی کام تھا کیا۔؟“ ناصر ڈرائیو کرتے ہوئے بولا۔  
 ”بابا جان سے تھوڑا سا پوائنٹ ڈسکس کرنے تھے۔“  
 ”پھر واپس....“

”بابا جان کا ڈرائیور لائے گا۔“  
 ”ہنیں۔ میرا مطلب ہے پھر واپس کب آؤ گے۔“  
 ”کل ہی۔ کیوں۔؟“

”یوں ہی۔!“ ناصر سوچوں میں گم ہو گیا۔  
 شان بھی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

”ادھر کاکنڈو نمٹ گزرنے کے بعد تمہارا گاؤں تیس میل رہ جاتا ہے۔“  
 ”میلوں سفر کرنے کے بعد ناصر کو شہر میں داخل ہوتے دیکھ کر شان نے کہا۔“  
 ”ہاں۔“ وہ اب بھی سوچوں میں گم تھا۔

”دیکھو ناصر جلدی فارغ ہونا۔ رات تک ہم کو ضرور بابا جان کا  
 پاس پہنچ جاتا ہے۔ بابا جان کو اطلاع ہو چکا ہے۔ تم کو معلوم ہے تاخیر  
 وہ برداشت نہیں کر سکتا۔“

”اوکے۔ سر۔ پٹواری سے بات ہی تو کرنی ہے۔“ سوچوں سے ابھرتے ہوئے  
 اچانک ایک نظر شان کو دیکھا۔ ”تم تہ انگ جانا وہاں.... میرا کیا ہے۔“  
 ”میرا انگنا کا کیا سوال ہے۔“ شان کے لہجے میں اچانک ادا سی  
 سمٹ آئی۔ برسوں پہلے جب بھوپتی اور بھوپا جان زندہ تھے۔ وہ  
 یہاں آیا کرتا تھا۔ کتنی رونق ہو ا کرتی تھی۔



اُن کے ختم ہونے کے بعد تو۔ جیسے اس کے لئے یہ گاؤں ہی ختم ہو گیا تھا۔  
 تاہر کو بابا جان لے گئے تھے۔ حویلی کو تالا پڑ گیا تھا اور تمام گاؤں جیسے سونا  
 ہو کر رہ گیا تھا۔ چند نوکر حویلی کی دیکھ بھال کے لئے باہر حجرے میں مقیم تھے۔  
 اور جائیداد کی دیکھ بھال۔ بابا جان نے خود ہی سمجھال لی تھی۔ شاذ ہی تاہر  
 آیا ہو گا پھر ادھر۔

پھر کچھ غصہ قبل تاہر کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے بعد بابا جان نے  
 اُس کی جائیداد اُس کے سپرد کر دی تھی۔ تب سے ہی وہ اکثر و بیشتر موقع پاتے  
 ہی اپنے گاؤں کا چکر لگاتا۔ مگر زیادہ دیر کبھی نہ رکتا۔

”دوپہر وہیں گزار لینی تھی۔ سخت گرمی پڑ رہی ہے۔“ ایسے میں سفر کرنا  
 مناسب نہ تھا۔ بابا جان نے ایک بار اُسے تنبیہ کی تھی۔

”بند کمرے کھولتے ہوئے میرا دل بیٹھنے لگتا ہے۔“ تاہر نے بعد میں  
 شان کو اُدا سی سے بتایا تھا۔

تاہر بائیں جانب مڑا۔ آبادی کے آثار شروع ہو گئے تھے۔  
 ”پٹواری کو کیا وقت دیا ہے۔؟“ سوچوں سے اُس نے اُکھرتے ہوئے  
 گھڑی پر نظر ڈالی۔

”شام پانچ بجے کا۔“ تاہر نے جواب دیا۔

”اور پانچ بجنے میں صرف دس منٹ ہیں۔“

”کوئی بات نہیں۔ بس پہونچتے ہی بات کروں گا۔ مجھے خود بھی جلدی ہے۔“

ماہوں جان سے گردن تو نہیں دلوانی ویسے ایک بات ہے شان۔ کسی

دن ہم دونوں میں سے کسی سے بھی کسی قسم کی کوئی ایسی کوتاہی ہو گئی جو ماموں  
 جان کو ناگوار گذرے۔ ہمیں ہماری بیویوں کے سامنے بھی ایک ایک ہاتھ رسی  
 کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔" ناہرنے مسکراتے ہوئے کہا۔ گو کہ اُس کی اس  
 بات میں بھی ماموں کے لئے احترام اور مخبر کے جذبات نمایاں تھے۔  
 "اسی لئے تو بیوی آنے سے پہلے آج اُن کا ساتھ بات کرے گا۔" شان  
 مسکراتے ہوئے بولا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ کیا عجب آج جوتیاں بھی پڑ جائیں۔ بیوی تو نہ  
 دیکھ سکے گی نا۔" ناہرنے ناصحانہ انداز میں کہا۔ اور شان خوبصورتی سے  
 ہنسنے لگا۔

ناہرنے دیکھا آج بہت دنوں بعد اُس کے چہرے پر رونق آئی تھی۔  
 چونک کر ناہرنے بریک لگائی۔ آگے زبیر اکرا سنگ تھی۔ ایک الٹرا  
 موڈرن لڑکی گاڑی کے سامنے سے ارد گرد سے بے نیاز مست خراچی سے چلی  
 جا رہی تھی۔ ناہرنے۔ آنکھ دبا کر شان کو دیکھا۔  
 "باز آجاؤ۔ بڑھا ہو گیا ہے اب۔"

"تو یہ کرو۔ میں تو تمہاری بیوی کو بھی نہیں چھوڑاں گی۔" ہنوز  
 آنکھ دبائے وہ حسبِ عادت بولا۔

"اسی لئے تو ہم تمہارا بہن سے شادی کر رہا ہے۔"  
 اور ناہر بغلیں جھانکنے لگا۔ بہن تمہیں ملے بھی نا۔" ناہرنے گاڑی

چلا دی۔



”دیکھتا ہے کس طرح نہیں ملتا۔“ بتلی سی سرک کے دونوں طرف کیر  
 حفہ اور اب ہلہلاتے کھیت تھے۔  
 گاؤں قریب آگیا تھا۔ وہ سوچوں سے اکبر۔  
 ناہر بائیں جانب پتھر لی سرک پر ہولیا تھا۔  
 ”ہنو اترو۔“ ڈروڑھی کے آگے گاڑی روک کر ناہر نے کہا۔  
 ”بات تو باہر جھڑے میں ہونا ہو گانا۔“  
 ”آج ذرا اندر بھی ہو آؤں۔“ کھلی بار بھی آیا تھا تو باہر ہی کاردار  
 سے ملا تھا۔ اندر نہیں جاسکا تھا۔  
 ”اور کے چلو۔“ ا” شان آگے بڑھے۔  
 اور وہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔

شام کے چھ بجنے والے تھے سامنے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ دور  
 کنوئیں کے قریب البتہ ایک ملازمہ بیٹھی کپڑے دھونے میں مصروف تھی۔  
 وہ آگے بڑھ گئے۔ تب ہی باورچی خانہ سے ادھیڑ عمر کی ملازمہ برآمد

ہوئی۔ وہ ناصر کو دیکھتے ہی لپک کر پاس آگئی۔

"اتنی کہاں ہیں۔؟" ناصر نے پوچھا۔

"وہ تو شہر گئی ہیں۔"

"خیریت تو تھی۔؟"

"خیریت ہی ہے۔ مادا آئی تھیں۔ اُن کے ساتھ گئی ہیں۔

"زرین کہاں ہے؟" ناصر نے پوچھا۔

"اپنے کمرے میں لیٹی ہیں طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

"اوہ۔" ناصر پریشان سا برآمدے کی طرف بڑھا۔

"آنٹی اور زرین یہاں ہے۔؟" ناصر کے ساتھ ساتھ چلتا مشان

پہلی بار بولا۔

"ہاں۔ اُن کو یہاں شفٹ کر دیا ہے۔ مجھے شاید تمہیں بتانا یاد نہیں

رہا۔ وہ جلدی سے اندر کی طرف بڑھا۔ شان وہیں رک گیا۔

اور وہیں زرین سے ناصر کو معلوم ہوا۔ ماما کے آنے پر انی اور ماما

دونوں ضروری خریداری کرنے شہر گئی تھیں۔ زرین کچھ سستی محسوس کر رہی تھی۔

اس لئے ہتھیں جاسکی تھی۔

"میں تو پریشان ہو گیا تھا۔" ناصر کے حواس کچھ بجا ہوئے تو اس نے

کہا۔ "تم نے کوئی دوائی لی۔" اُس نے زرین کی نبض تھام لی۔

"بس یونہی سر میں درد ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"تمہیں تو بخار ہے اچھا خانا۔ بھڑو! میں دوا دیتا ہوں۔ شان ہے



میرے ساتھ۔ اُسے بٹھالوں ذرا۔“ اور وہ یاہر نکل آیا۔

شان کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ ملازمہ سے چلے بنانے کو کہا اور واپس زی کے کمرے میں چلا آیا۔

”دوائیاں کہاں رکھی ہیں۔“ وہ الماری کی طرف بڑھا۔

”اسی الماری میں ہیں اوپر۔“

اور وہ الماری کھول کر دوا ڈھونڈنے لگا۔ ”سواری تو نہیں آیا تھا۔“

گوئی ہاتھ میں لئے وہ اُس کے سر ہانے آگیا۔

”آیا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے۔ آپ نہیں پہنچے تھے کہنے لگا ایک گھنٹہ

بعد ہکر لگا لوں گا۔ آتا ہی ہو گا اب تو۔“ زرین نے مسہری کی پشت سے ٹیک

لگائی۔ ”یہ لے لو۔“ ناصر نے اُسے پانی کا گلاس اور گوئی تھما دی۔ پھر

اُس کا ماتھا سہلانے لگا۔

”اچھا فاما بخار ہے۔ تم کہتی ہو صرف سر میں درد ہے۔“ اُس نے تشویش

سے اُسے دیکھا۔ کیسی مر جھا کر رہ گئی تھی۔ چند دنوں میں۔

”آپ ناحق پریشان ہو رہے ہیں۔ ٹھیک ہو جائے گا۔ زرین نے گلاس

سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

”تم لیٹو۔ میں شان نے پاس جاتا ہوں۔“

”اجی بھی بس آتی ہی ہوں گی۔ آپ کی وجہ سے وہ تو جانا بھی نہیں چاہتی

کھتی۔ مگر ماما کیلی تو کچھ کر نہیں سکتیں۔ میں نے خود اتنی کو بھیج دیا۔ ماما

واپس بھی جانا تھا۔



” اچھا کیا چلی گئیں۔ خدا کرے میرے ہوتے ہوئے آجائیں۔۔۔۔۔“  
 ” صاحب پٹواری آگیا ہے۔ ملازمہ نے دواؤں کے پاس آکر بتایا۔  
 ” اوہ گڈ۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ شان ڈرائنگ روم میں ہے۔ چلے  
 کے لئے میں نے ملازمہ سے کہہ دیا ہے۔

وہ لمبے لمبے ڈگ بھر تا باہر چل دیا۔ اور زی کو ناصر پر غصہ آگیا۔  
 وہ تو پورے خاندان کی بے عزتی کرنے پر ٹٹلا ہوا تھا۔ اور ایک ناصر  
 بھائی تھے کہ کچھ جارہے تھے۔

یہ دن جس کرب میں گزرے تھے۔ کچھ اُسے ہی معلوم تھا۔ ہر وقت ہر لمحہ  
 اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے۔ سوتے جاگتے۔ بیتے دن۔ پھر منگنی۔ اُس کے بعد کے  
 حین پینے۔ اور پھر چند دن قبل۔ آرٹ گیلری کا فنکشن۔ ناصر کا شان اور  
 ٹینا کے متعلق انکشاف۔!

سب۔ ایک ایک کر کے کسی متحرک فلم کی طرح اُس کی نظروں کے سامنے  
 آتے اور جاتے رہے۔ وہ یہ سب باتیں انی کو بھی نہیں بتا سکتی تھی۔  
 اکیلے ہی اکیلے، من ہی من میں۔ گھٹ گھٹ کر ہلکان ہو رہی تھی۔  
 انی بھی دیکھ رہی تھیں۔ اُسے اُداس اُداس اور کھویا کھویا۔ مگر  
 سمجھ کچھ نہیں پا رہی تھیں۔

” زنا بیٹے۔ چپ چپ کیوں رہتی ہو۔“ کل ہی وہ پوچھ رہی تھیں۔  
 ” ہوں۔۔۔ نہیں تو اتنی۔۔۔“ وہ گھبرا سی گئی تھی۔

” میں دیکھ رہی ہوں۔ ہوٹل سے آئیں تھیں تو ٹھیک ٹھاک تھیں۔ چند



دن سے ہی چپ چپ ہو۔ کھانا بھی برائے نام رہ گیا ہے۔  
تو اتنی باقاعدہ نوٹ کر رہی تھیں۔

”نہیں اتنی۔ آپ کا وہم ہے۔ پڑھتی رہتی ہوں نا ہر وقت۔ اس لئے  
شاید آپ کو مڑ جھانسی لگتی ہوں۔

اُسے امتحان کی تیاری کے لئے پٹھیاں ملی تھیں۔ آج کل واقعی ہر وقت  
کتاب آنکھوں کے سامنے رہتی تھی۔ مگر پھر بھی۔ اتنی اُسے خاموش۔ خاموش  
نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ ”بیٹے۔ خوش، خوش رہا کرو۔ اپنی ساری پریشانی  
اپنی اتنی کو دے دو۔ اتنی بولی تھیں۔

اور اس وقت بھی۔ آنسو اڑھک کر اُس کے تکیے پر آ رہے۔  
”ٹھک۔ ٹھک۔ ٹھک۔“ دروازے کا پٹ بج اٹھا۔

جلدی سے اُس نے یا زور آنکھوں پر رکھ لیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُسے  
کوئی موتا دیکھے۔ تبھی بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔  
”ہیلوزی۔!“ نشان ہی تھا۔

یہی آواز کہہ چلتے ہوئے بھی اُس کے ذہنِ ددل میں محفوظ ہو چکی تھی۔  
”زی۔!“ وہ قریب چلا آیا۔

آنکھوں پر یا زور رکھ رکھے اُس نے دیوار کی طرف کروٹ لے لی۔  
”زی۔ ہیلز۔۔۔“ کتنے قاصدے کھنکھنے پرچ میں۔ وہ کتنا اجنبی  
اجنبی محسوس کر رہا تھا اپنے آپ کو۔

”زی۔ خفا ہے مجھ سے۔“ وہیں اُس کے سر پہلے کھڑا وہ اُس کے

تکیوں میں دئے سر کو گھور رہا تھا۔

اور جانے کیوں۔ زی کو اور بھی رونا آ گیا۔ کہاں کہ اُس کے خلاف دل میں اتنا غصہ بھرا تھا۔ کہاں کہ اُس نے سوچا تھا کہ اُس کی مڈ بھڑا اُس سے کہیں ہوئی تھی تو وہ اُسے یوں IGNORE کر دے گی جیسے جانتی تک نہ ہو۔ مگر اُس وقت تو اُس کی پوزیشن ہی کچھ اور تھی۔

بخار میں پڑے پڑے۔ پھلی باتوں کو سوچ سوچ کر۔ پہلے ہی پیمانہ بریز تھا۔ اوپر سے خود چلا آیا تھا۔ چھلکنا تو تھا ہی۔

”زی میرا بات سنو۔ پھر میرا غلطی ہو تو مرادے دو۔ ہم کو۔“ وہ احتیاط سے اُس کی مسہری کی پٹی پر بیٹھ گیا۔

”آپ پلینر چلے جائیں۔ یہاں سے۔“ وہ روتے روتے بمشکل بولی۔

”اوہ۔“ وہ پریشان ہو گیا۔

وہ رو رہی تھی۔ ایسا تو اُس نے کبھی نہیں چاہا تھا۔

”زی پلینر۔ سنو تو۔“ غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ اُس کے بالوں پر گیا۔

زی کو جیسے بجلی چھو گئی۔ تڑپ کر اُس کا ہاتھ دور جھٹک دیا۔

”اوہ۔“ وہ خوب صورتی سے ہنسا۔ ”بہت خفا ہے۔“

”چلے جائیں یہاں سے۔“ وہ چلائی۔

”NON SENSE۔“ آہستہ بولو۔ اُس نے ادھر اُدھر دیکھا۔

”اتنے زور سے چلائی تھی۔ کوئی دیکھ لیتا تو۔ وہ قدرے پیچھے ہٹ گیا۔“

زی نے آنسو پونچھے۔ سیدھی ہوتے ہوئے مسہری کی پشت سے



ٹیک لگائی۔ شان اُس کے جھکے سر۔ سرخ چہرے۔ بھگی پلکوں کو دیکھ رہا تھا۔

”مراؤں جان کو لکھ بھیجا ہے کہ وہ سنگنی کا پا بند نہیں رہ سکتا۔ سنگنی تر وادی جائے۔“ جانے کہاں سے ناھر کے کہے ہوئے الفاظ زی کے کانوں میں گونجے۔ اُس نے ستورم آنکھیں اٹھا کر شان کو دیکھا۔ کس اطمینان سے بیٹھا تھا۔ جیسے وہ کوئی کھلونا تھی اور آج پھر وہ اُس سے کھیلنے چلا آیا تھا۔

وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

زی کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔

”آپ آئے کیوں ہیں یہاں؟“ اچانک ہی وہ تلخ، طنزیہ، بیگانہ

لہجے میں بولی۔ جانے کیوں خفیف سا ہو گیا۔

”تم کو ہمارا آنا اچھا نہیں لگا۔“ اُس نے سمجھنے کی کوشش کی۔

”میں آپ کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔“ زی نے کہا۔ اُس کے

لہجے میں حقارت تھی۔

شان کا رنگ بدل سا گیا۔

”ہم اتنا بُرا نہیں ہے۔“ وہ بڑے ضبط سے مسکرایا۔

”آپ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں۔؟“

اور شان کو پہلی بار اپنی توہین کا احساس ہوا۔

”JUST NOTHING۔“ وہ کھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

” چلے جائیں یہاں سے۔ “ وہ پھر چلائی۔

اور آگے بڑھ کر اُس نے سختی سے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

” SHUT - UP “ وہ تیزی سے بولا۔ بڑی دیر سے ضبط کئے

بیٹھا تھا۔ برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ ایک تو وہ اُس کی بات

نہیں سن رہی تھی۔ اوپر سے چلا بھی رہی تھی۔

مانا کہ اُسے دکھ پہنچا تھا۔ پریشان رہی تھی۔ مگر دوسرے کو صفائی

دینے کا موقع تو دینا چاہئے۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد سے جلد اُس کی غلط

فہمی دور کرے۔ مختصر الفاظ میں — ناہر باہر گیا تھا۔ یہی موقع تھا

اُس سے کچھ کہنے سننے کا۔ مگر وہ تھی کہ کسی طرح بات آگے بڑھنے ہی

نہیں دے رہی تھی۔

” I DON'T LIKE VIOLENCE “ دیکھو میرا بات سوجپ چاپ۔

اُس نے سختی سے کہا۔

” چھوڑ دیں مجھے “ وہ تڑپتی۔ بمشکل بولی۔ مگر اُس کی گرفت بہت مضبوط تھی

” I SAY SHUT UP “ زرین سہم سی گئی۔

” NOW LISTEN “ ہاتھ اب بھی اُس کے منہ پر تھا۔ اب کے زرین

نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ چپ چاپ اس کی طرف دیکھتی رہی۔

” جب تک دونوں طرف کا بات پورا نہ معلوم ہو۔ کوئی نتیجہ نہیں قائم

کرنا چاہئے۔ “ اُس کا ہجہ قدرے نرم پڑ گیا تھا۔ مگر اس کا ایک ہاتھ اس

کے منہ پر اور دوسرا اب بھی اُس کی گردن کے گرد پٹا تھا۔



”تم شاید خفا ہے۔ کہ میرا منگنی کسی اور سے کیوں ہوا۔ مگر یہ ہمارا حرفی سے نہیں ہوا۔ ہم نے بابا جہان کو بولا تھا کہ ہم اُن کی پسند پر منگنی نہیں کر سکتا۔ ہم نے لڑکی پسند کر لیا ہے۔ اُنکی سے ہمارا شادی کر دیں۔“ اُس کی گرفت اُس کے منہ پر ڈھیلی ہو رہی تھی۔ ”مگر تم کو معلوم نہیں وہ بہت سخت قسم کا انسان ہے۔ بالکل نہیں سنا ہمارا۔ اور اپنا حرفی سے ہمارا منگنی کر دیا۔“

زی نہ چاہتے ہوئے بھی سنتی رہی۔ کچھ سمجھے بغیر ہی۔ شان نے گردن موڑی۔ دُور دُور اُٹھی کی طرف نظر ڈال کر اطمینان کیا۔ اور پھر اُس کے منہ پر سے ہاتھ ہٹا دیا۔ پھر دھیرے سے دوسرا ہاتھ بھی اُس کی گردن کے نیچے سے نکال لیا۔

”منگنی کے بعد ہم نے پھر اُن کو لکھا۔ کہ اُس گھر میں کہہ دو کہ ہم اس منگنی پر قائم نہیں رہ سکتا۔ ہم اپنا پسند کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس پر بابا جہان بہت غصہ ہوا۔ فوراً ناھر کے پاس بھینچا۔ اور ناھر کو میرا پاس بھیجا کہ وہ اب اپنا فیصلہ ہمیں بدل سکتا۔ لڑکی والوں کے ساتھ وعدہ خلاقی نہیں کر سکتا۔

ناھر نے ہم کو سمجھایا۔ لیکن پھر ہم پر ترس آگیا۔ بابا جہان کو بھی سمجھایا۔ اور اُس لڑکی کو کوئی ایسا پٹی کرایا۔۔۔“ اُس نے ناھر کی بات دہرانے کی کوشش کی۔ تو اُس پریشانی میں بھی ہنسی آگئی۔

اب تو وہ با محاذ رہ اُردو بولنے کی کوشش بھی کرنے لگا تھا۔ آہستہ سے اُس نے سرگھٹنوں پر ٹیک دیا۔ ویسے وہ پریشانی کے ساتھ ساتھ حیران بھی تھی۔ پورے واقعہ میں زرین کے ساتھ منگنی ہو جانے کا ذکر ہی نہیں تھا۔



”پھر رطکی والوں نے منگنی کا انگوٹھی بابا جان کو واپس کر دیا۔ وہ انگوٹھی آج صبح ہم کو ناہرنے لاکر دیا۔ یہ دیکھو۔۔۔“ شان نے ایک ہاتھ سے اُس کا سراونچا کیا۔ دوسرے ہاتھ کی پھیلی میں رکھی انگوٹھی اُسے دکھائی۔

اور زرین گرہ بات کی تہہ کو نہ پہنچ پائی تھی اب تک۔ پھر بھی اس سارے ہیر پھیر کا ذمہ دار سوائے ناہر کے کسی اور کو نہ ٹھہرا سکی۔

انگوٹھی کو ایک نظر دیکھا۔ اور سرواپس گھٹنوں پر واپس رکھ دیا۔ کچھ بخار۔ کچھ پریشانی۔ اور پھر یہ ہیرا پھری۔ مارتھ دماغ ہلکا کر رہ گیا۔

”اب بتاؤ۔ اب بھی خفا ہے مجھ سے۔؟“ اُس نے اُس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھا۔

زی خاموش رہی۔ تانوں باتوں میں الجھی ہوئی تھی۔ کہتی تھی کیا۔

”دیکھو۔ اب میں آزاد ہے۔ جہاں میں چاہے گا وہاں شادی کرے گا۔ اور تم کو معلوم ہے وہ تمہارے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔ انگوٹھی اب بھی اسکے ہاتھ میں تھی۔

زی چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اور پھر شان کو ہیے اچانک یاد آیا۔

”زی تم نے اُس ڈاکٹر کے ساتھ بات کر لیا۔ میرا بالکل بھی خیال نہیں کیا۔“

اُس کی آواز میں شکوہ تھا۔

”کیا۔؟“ جھکا سر اٹھا کر زی حیرانگی سے پوچھنے لگی۔ کون ڈاکٹر۔؟“

”ماجد صاحب کا لڑکا۔“

”آپ پتہ نہیں کیا الٹا سیدھا لول رہے ہیں اتنی دیر سے۔ میری سمجھ میں تو کچھ آہٹیں رہا۔“ وہ اُکھٹی الجھی سی بولی۔

”تمہارا بات اُس ڈاکٹر سے پکا نہیں ہوا۔؟“



”اوہ خدایا۔“ وہ جیسے تھک کر بولی۔ ”کس نے بتایا آپ کو۔؟“  
 ”ناھر کہتا تھا۔ تمہارا بات ہو گیا ہے اُس ڈاکٹر سے۔“ وہ امید و بیم کی  
 حالت میں اُسے دیکھ رہا تھا۔

”اوہ۔ ناھر بھائی۔“ سر ہلاتے ہوئے اُس نے ایک گہری سانس لی۔ ادرا اب سے  
 پورا یقین ہو گیا کہ سب کچھ تو ناھر بھائی کے ہی تھے۔ ادرا اب تک جو شان کو یہ  
 معلوم نہیں تھا کہ اُس کی سنگی زی سے ہوا ہوئی ہے۔ یہ بھی یقیناً ناھر بھائی کے  
 ڈرامے کا کوئی اہم حصہ تھا۔ مگر وہ پتہ کرتی بھی تو کیسے۔؟ کیسے شان سے  
 براہِ راست کہہ سکتی تھی کہ اُس کی سنگی اُسی سے ہوئی ہے۔

”زی پلیر۔ مجھ کو بتاؤ۔“ اُس نے اُس کا گھٹنہ ہلایا۔ ڈاکٹر سے تمہارا بات ہوا  
 ہے یا نہیں۔؟“ اُس کی نظروں میں اُس کے دیئے جل اُٹھے تھے۔ وہ ملتتی  
 نظروں سے زی کی نظروں میں دیکھ رہا تھا۔

”نہیں۔“ دھیرے سے کہتے ہوئے اُس نے سر جھکا۔

”اوہ زی۔ میں یا گل ہو جائے گا خوشی سے۔“ غیر ارادی طور پر اس کا  
 سر زی کے گھٹنے پر ٹک گیا۔

زی نے مجھکی نظریں اٹھا کر اُسے دیکھا۔ کتنا معصوم تھا وہ۔ مگر زی کا  
 خوبصورت چہرہ ایک بار پھر تاریک سالیوں کی پیٹ میں آ گیا۔  
 اب تو آپ خری ہیں۔ ٹینا حامد علی کے پاس جاسکتے ہیں۔ اچانک  
 وہ شاکی لہجے میں بولی۔

ٹینا کے ساتھ افسر کی بات تو ہر حال اپنی جگہ تھی۔

”ٹینا حامد علی؟“ سر اٹھا کدہ اُسے جیرانگی سے دیکھنے لگا۔  
 ”باقی سب جو ہوا۔ اُسے تو نامہ بھائی کے ڈرائے کا حقہ کہا جاسکتا ہے۔  
 مگر ٹینا کے ساتھ کچھلے دنوں انٹرکون میں ڈنر پر.....“  
 ”تم کو کیا معلوم ہوا۔“

”چور پکڑا گیا نا۔“

”ہم چور ہے نہیں تو پکڑا کیسا ہے۔“

”میں پکڑنے والی کون ہوں۔ ٹھیک کرتے ہیں۔ آپ جو بھی کرتے ہیں۔“

”تم پکڑنے والا کوئی نہیں ہے؟ ہم تمہارا کچھ نہیں ہے۔؟“ وہ اُس کی

آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ کتنا دکھ سمٹ آیا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں۔

مگر زی بھی کچھ کم تو دکھائی نہ ہوئی تھی اُسے دیکھ کر۔!

”بولو نازی۔ ہم تمہارا کچھ نہیں ہے۔؟“ اُس نے اپنا سوال دہرایا۔

وہ اب بھی اُس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

اور اس کی آنکھوں کا دکھ بڑھتا گیا۔ اور یہی دکھ جانچتے جانچتے زی کی

آنکھیں نم ہو گئیں۔ اُس نے پلکیں چھبکیں۔ آنسو لڑھک کر گالوں پر آ رہے۔

اُس نے سر دوبارہ گھٹنوں پر ٹیک دیا۔

چند روز قبل تک یہی انگوٹھی میرے ہاتھ میں تھی۔ مگر جب ٹینا کو آپ کے

ساتھ دیکھا۔ اور بعد میں نامہ بھائی کے آپ دونوں کے افیئر کی تصدیق بھی کر دی

اور یہ بھی کہ آپ..... اس شہنی کو تر وانا چاہتے ہیں۔ تو میں نے یہ اتار کر.....

نامہ بھائی کو..... مارے بھکیوں کے وہ آگے کچھ کہہ ہی نہ سکی۔



” چند روز قبل تک یہ نگوٹھی تمہارا ہاتھ میں... کیسا۔؟“ چونک کر اُس نے کہا  
 زی کوئی جواب نہ دے سکی۔ چپ چاپ روتی رہی۔  
 ”ناصر کہتا تھا۔ ہمارا افسر ہے ٹینا ہمد کے ساتھ۔؟“ زی نے سر اثبات میں <sup>بلادیا</sup>  
 ”اوہ!“ اُس نے اُس کے جھکے ہوئے سر پر پیار کر لیا۔ ”کیسا کیسا دکھ پہنچا  
 ہے میری جان کو۔!“

”میں نے بھی دیکھا تھا آپ دولہا کو“ وہ روتے روتے بولی۔  
 ”ٹھیک ہے دیکھا تھا۔ مگر افسر نہیں ہے۔ ناصربگو اس کرتا ہے۔ یقین کر لو  
 ٹینا نے فتن کش کے بعد ہم سے ہمارا پروگرام پوچھا تو ہم نے کہا کہ انٹر کون میں  
 ڈنر کے واپس کاؤں جائے گا۔ اس پر وہ بولا کہ وہ بھی آجائے گا۔ ہم کیا کہتا۔  
 بابا جان کا دوست کا۔ بیٹی ہے۔ یہ سب کرسی تھا ڈیر۔ صرف کرسی۔ اُس  
 نے اُس کے سر پر کئی پیار کر ڈالے۔

اور جاننے کیسے؟ اُس کی عدم موجودگی میں جو شکوک و شبہات، غصہ اور  
 حقارت، اُس کے دل میں اُس کے خلاف اٹھے ہوئے تھے۔ اس وقت اس کی  
 موجودگی میں اس کی باتوں حرکات و سکنات کو دیکھتے ہی خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔  
 ”اچھا اب تم لیٹ جاؤ۔ تمہارا طبیعت ویسے بھی ٹھیک نہیں ہے۔“ اُس نے  
 سہارا دیکر تکیے ٹھیک کرتے ہوئے اُس نے اُسے لیٹنے میں مدد دی۔

اور۔ اب پھر۔ وہ شان کا سامنا نہیں کر پاتا تھا۔  
 گو کہ شان اب بھی یہ نہیں سمجھ پایا تھا کہ اُس کی سنگینی ذی سے ہی ہوتی  
 ہے۔ مگر حیا پھر بھی اُسے آری تھی اُس نے پھر آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

شان کھڑے کھڑے اُس پر جھک آیا۔ اُس کا بازو ہٹا دیا۔ باری باری  
دونوں آنکھوں پر پیار کیا۔ "اب چلتا ہے۔ ناصر کا ذرا خبر لیتا ہے۔  
لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ ڈرائنگ روم کی طرف چلا۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہوا ہی تھا کہ ناصر آ پہنچا۔  
"تھکا دیا ہے۔ کمبخت نندہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔" ہم باقی کس کبھی نکال  
دے گا۔" شان نے ایک زوردار گھوٹہ رید کر دیا۔  
"آپ تو بول پڑے ہیں سرکار۔ کب زندہ ہوئے۔؟" ذرا بھی اٹھنے بغیر  
ناصر نے کہا۔ "تم نے زی کو بتایا ہے کہ ہمارا آفیسر چل رہا ہے مینا حامد علی کے  
ساتھ میں۔"

"ادہ سمجھا۔ تو سازش ہو چکی ہے۔ میری غیر موجودگی میں۔"  
"ہاں۔ ہم نے اُس کو سب بتا دیا۔ وہ تو ہم سے خفا تھا۔ ہم نے بتا دیا کہ  
کس طرح بابا جان نے ہمارا مرضی کے خلاف ہمارا منگنی کی اور سے کیا تھا۔ پھر کس  
طرح تم نے چکر چلایا۔ لڑکی کو سمجھا کر انگوٹھی واپس لیا۔ اور ہم کو دیا۔ مگر یار۔ اُسے  
جیسے اچانک خیال آیا۔ زی تو کہتا ہے یہ انگوٹھی چند روز قبل تک اُس کے  
ہاتھ میں تھا۔" وہ اُلجھا اُلجھا سا بولا۔ اور ناصر زور سے ہنس دیا۔



یعنی اتنی ساری باتیں ہوئیں۔ اور تمہیں یہ بھی پتہ نہ چل سکے زلیخا مردھنی  
یا عورت؟“ ناہرنے کہا۔ ”کیا مطلب۔؟“ شان نے چونکا۔  
”کیا تمہیں واقعی اتنی ساری باتیں کر لینے کے بعد بھی یہ معلوم نہ ہو سکا کہ تمہاری  
منگنی درحقیقت زلی سے ہی ہوئی ہے۔ وہ واقعی حیران ہو رہا تھا۔  
”میرا منگنی زلی سے ہوا ہے۔؟“

”ہاں۔“ ناہرنے کہا۔ ”اوہ نو۔“ شان نے کہا۔

”یہی تو بات ہے ساری۔ تم اس قابل ہی نہیں ہو۔ جی بھی تو اُس نے انگوٹھی  
واپس کر دی۔“ ناہرنے کہا۔

”تھوڑا خیال ہم کو بھی آیا تھا۔ جب اُس نے کہا تھا کہ انگوٹھی اُس کے ہاتھ میں  
تھا۔ مگر پھر سوچا۔ ہم کب اتنا خوش قسمت ہے۔ مگر...“

”چائے پیو۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ پھر تفصیل بتاؤں گا۔“

”پہلے یہ بتاؤ۔ تم تو کہتا تھا کہ ذی کا اُس ڈاکٹر سے بات ہو گیا ہے۔“

”تو کیا ہوا۔ ڈاکٹر سے تو ہر انسان کا بات ہو سکتا ہے۔“ وہ اُسی کے لہجے میں بولا۔

”نہیں۔ اب مذاق ختم کرو۔ بات کا مطلب منگنی یا شادی وغیرہ ہے۔“

”ہنے کہا تھا بات چکا ہو گیا ہے۔“

”چائے پیو۔ بات ساری پتہ چل گئی ہے۔ اب میرا دماغ مت کھاؤ ہائے۔“

ہائے سوچا تھا ڈراپ سین مانوں جان کے سامنے ہو گا۔ تم ان کو انگوٹھی دے کر

کہو گے کہ یہ بے جا کر زین کو پہنا دیں۔ انہیں تمہاری دماغی حالت پر شبہ ہو گا

ہلے ہائے کیا کیا بدحواسیاں دکھاتے تم۔ اور کتنے خوش ہوتے ہم۔ مگر۔“

”بس کرو۔ چائے پیو۔“

”میں پٹواری کے ساتھ پی چکا۔ کاش نہ پیتا۔ اندر سازش تو نہ ہوتی

میرے خلاف۔!“

”اچھا اب بتاؤ ساری بات۔“

”سنو شان۔“ نامہ پہلی بار سنجیدہ نظر آنے لگا۔ ”در اصل جس دن ماموں جان نے زرین کو انکل ماجد کے گھر دیکھا تھا۔ دل ہی دل میں ہمارے لئے پسند کر لیا تھا پھر انکل ماجد سے کرید کرید کر زرین کے متعلق سب معلوم کیا۔ پھر تم سے کہا کہ انہیں ہمارے لئے لڑکی پسند آگئی ہے۔ یہ انہی دنوں کی بات ہے۔ جب تم بھی زرین کو مل چکے تھے۔ تم نے ماموں جان سے اپنی پسند کا ذکر خط میں کیا۔ مگر وہ زرین کو زیادہ مناسب سمجھ کر اپنی مرضی پر اڑے رہے۔ نہ ماموں جان کو معلوم ہو سکا کہ ماموں جان جس لڑکی کو اپنی آن بان سمجھ بیٹھے تھے۔ وہ بھی زرین کے علاوہ اور کوئی نہیں۔

اس دوران میں امریکہ چلا گیا۔ ماموں جان سسائی اور زرین کا کوئی تذکرہ کئے بغیر ہی۔ کیونکہ اتنی چاہتی تھیں کہ جب تک یہ بات چھپی رہے بہتہ ہے۔ دراصل انہیں ماموں جان کا خوف تھا۔ کیا پتہ کیا رد عمل ہو ان کا۔ زیادہ اندیشہ انہیں زی کا لگا رہتا تھا۔ ”وہ سکرایا۔“ کہ کہیں ماموں جان یا۔ پھر میں۔ یعنی زی کے در شا کہیں زی کو ساتھ لے جاتے کا زور ڈالیں۔ بس انجانے سے خوف لگے رہتے تھے بے چاری کو

خیر۔ اس دوران ماموں جان آئے اور زرین کا ہاتھ ہمارے لئے



طلب کیا۔ اتنی نے مجھ احریکہ لکھا۔ میرے احریکہ جانے سے قبل انکل ماجد بھی اپنے بیٹے کے لئے زی کا رشتہ مانگے آئے تھے۔

بہر حال۔ میں واپس آیا تو ماموں جان اور میں نے ہماری سنگنی کی تاریخ مقرر کر دی۔

چلے چھوڑ چھاڑ۔ شان اس کو گھور رہا تھا۔ ”مگر جب بابا جان کو آنی اور زرین کا حال معلوم ہوا۔ میرا سنگنی بھی کرنے لگا۔ تو مجھ کو کیوں نہیں بتایا۔ وہ حیران سا بولا۔

”اول تو اس لئے کہ بقول ماموں جان تم خدا ڈکٹیوریل قسم کی چیز ہو جس پر ماموں جان کو اعتراض نہ ہوا۔ جس بات پر ماموں جان کو اعتراض نہ ہوا۔ یعنی اتنی کے سیکے وغیرہ پر۔ شاید اس پر تمہیں اعتراض ہو۔ اور پھر۔ بقول بان کے ہی۔ تم کسی اور لڑکی کو شادی کے لئے بھی پسند کر چکے تھے۔ ظاہر ہے۔ ایسے حالات میں اول تو اُن کی پسند تمہیں نہ بھاتی۔ اور پھر کچھ غور کرتے بھی تو لڑکی کی ماں کے خستہ حالات سن کر اور بھی مکر جاتے۔۔۔“ ناصر سنجیدگی سے کہتا گیا۔

”اوه DON'T TELL ME THAT - میں تو کبھی اس ڈیٹیل میں گیا

ہی نہیں۔“ وہ دھیرے سے سکرایا۔

پھر اس کی خوبصورت آنکھوں میں شرمی اُتر آئی۔

”بلکہ ڈیٹیل میں جانے کا موقع ہی نہیں ملا۔ دن رات ہر جگہ، ہر طرف زی ہی زی نظر آتا تھا۔ پھر سوچتا کس وقت کہ وہ کون ہے۔ اور اس کا

مال کون ہے۔

نامر ہوئے سے مکر ادیا۔

”اچھا اب جاننا ہے واپس یا نہیں۔“ نامر نے گفٹی دیکھی۔ ساڑھے سات ہو رہے تھے۔ شام کے سائے ملنے لگے۔ ہوتا شروع ہو گئے تھے۔

”وہ تو جانا ہے مگر۔“ اُس نے چلنے کا گھونٹ لیا۔ یہ باقی سارا کیا پکڑ چلایا تھا تم نے۔ مثلاً بابا جان کا پیغام ہم تک لایا۔ پھر اُن کو فون کیا۔ کہ ہم وہی کرے گا۔ جو وہ چاہیں گے۔ پھر کسی فرنی لڑکی سے انگوٹھی لایا۔۔۔  
ٹینا سے افسر وغیرہ۔۔۔“

”ڈرلر تھا سب ایک معمولی سا کھیل سمجھو۔ چھوٹا۔ PLAY. PLAY  
ہلکا پھلکا سا۔“ وہ ہاتھ سے مختلف مقداروں کے چھوٹے چھوٹے سائز بنا کر کہتا گیا۔

”NOW STOP IT۔“ شان کو ہنسی آ گئی۔

”ماموں جان آئے میرے پاس تو میں نے اُن کا حکم مارا۔ تمہیں سمجھانے کے بہانے تم سے ملنے آیا۔ تم سمجھتے سمجھتے میں نے انہیں تمہارے سامنے رنگ کر دیے کہ تم وہی کرو گے۔ جو وہ چاہتے ہیں۔ پھر میں اور زی انٹرکون میں ڈنر کے لئے بیٹھے تھے کہ تمہیں ٹینا کے ساتھ دیکھا۔ زی سے انگوٹھی لے کر تم تک پہنچانے کا اس سے بہتر موقعہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ سو بول دیا کہ افسر ہے دونوں کا۔ اور شان اسی لئے سنگی تر ورنے کا ماموں جان کو کہہ رہا ہے۔ انگوٹھی۔ آسانی سے مل گئی۔ ہم تمہیں دے آئے۔ آخر تو ہم تمہیں تر پتا۔ بلکتا بھی تو



نہیں دیکھ سکتے تھے۔" اُس کے لب و لہجہ پر شان بے اختیار سنس دیا۔

"اور یہاں زی جو پریشان رہا۔"

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ قدر آئی ہوگی تمہاری اور بھی جیسے تمہیں آئی تھی۔

یار کیا کیا تماخے دیکھے میں نے بھی۔ کیسا کیسا ترپے تھے تم۔ اور میں۔ ناھر زندہ باد۔

دل ہی دل میں مزے لے رہا تھا۔ اب اُٹھو۔ چلیں دیر ہو رہی ہے۔"

"اور کہہ دے دلی سے اُٹھنے لگا۔

"کیوں۔ دل نہیں چاہتا کیا۔؟"

"نہیں۔ خوبصورتی سے مسکراتے ہوئے شان نے سرنفی میں ہلا دیا۔

"میں نے کہا تھا نا کہ ایک جاؤ گے یہاں آکر۔

اور شان کے لبوں پر دلشیں مسکراہٹ بکھر گئی۔

"اُٹھو یا۔" شان اُٹھ کھڑا ہوا۔ "جانا تو ہے ہی۔ ورنہ بابا جان۔۔۔"

اس وقت واقعی شان کا جانے کو بالکل دل نہیں کر رہا تھا۔ اتنے خوب

صورت انکشاف کے بعد۔ زرین کے گھر میں نذرین کے اتنے نزدیک۔

مگر۔ بابا جان اُن کو وہ رات کے وقت انتظار کی زحمت دینے کا

سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

"دیے جب تم نے مجھے ماموں جان کو فون کرنے کا کہا اور خود کپڑے

بدلتے کمرے سے نکل گئے۔ تو میں نے ہاتھ میں اکٹھا لیسو واپس کریدل پر رکھ

دیا تھا۔" ناھر بڑے مزے سے دیکھ رہا تھا۔ شان حیران سا اُسے دیکھنے لگا۔

"کیا سمجھے" وہ مزید بولا۔ اور شان خلاف عادت زندگی میں پہلی بار۔

ناصر کی اس الٹی حرکت پر اس پر ناراض نہیں ہوا تھا۔

”اس کا مطلب ہے بابا جان کو ہمارے لئے متعلق کوئی اطلاع نہیں ہے۔“  
”ہرگز نہیں۔“

”ہوں؟“ شان کچھ سوچتے ہوئے دھیرے سے بولا۔ اور ابھی باہر ڈیوڑھی کے پاس گکاری رکھنے کی آواز آئی۔ ”اتنی آگئی ہیں شاید؟“ ناصر نے وہیں ہٹھا کر خود باہر نکل آیا۔ اور پھر تھوڑی سی دیر میں اسی کو لئے دوبارہ اندر آگیا۔

شان تعظیماً اُٹھ کھڑا ہوا۔ ”بیٹے اطلاع تو کی ہوئی شان کے آنے کی“  
سکینہ بیگم نے آگے بڑھ کر شان کا ماتھا چوم لیا۔

”شان کے کیا سینگ نکل آئے ہیں کہ میں اطلاع کرتا۔ اور سکینہ بیگم ناصر کی بات پر شفقت سے مسکرا دیں؟“ بیٹھو بیٹا۔ میں آتی ہوں۔“  
اور سکینہ بیگم پاس ولے کرے میں چلی گئیں۔

شان اور ناصر پھر بیٹھ گئے تھے۔ ناصر کا کہنا تھا کہ شان سکینہ بیگم کی موجودگی میں شرمارہا تھا اور شان یہ ثابت کرنے کی کوشش میں تھا کہ وہ شرما نہیں بلکہ CONFUSE ہو رہا ہے۔ دونوں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔  
ابھی سکینہ بیگم بڑی سے پلیٹ میں ڈھیر ساری مٹھائی لے آئیں۔

”لو بیٹا۔ مٹھائی کچھ لو پہلے۔“ ایک عمدہ سا گلاب جامن اس کے منہ کے پاس لاتے ہوئے پیار سے بولیں پہلی پہلی بار آیا تھا۔ منہ تو میٹھا کرانا ہی تھا۔

”ناصر نے کچھ ایسی نظر شان پر ڈالی۔ کہ وہ چاہتے ہوئے بھی وہ گڑ بڑا گیا۔“  
”دیکھو بیٹا۔ ساس کی بات دہرائیں کرتے؟“ منہ اس کے کان کے پاس لگا کر



وہ آہستہ سے بولا۔ ”ورنہ زی یوں۔“ اُس نے گلے پر انگلی پھیری۔ ”کر کے رکھ دے گی۔ اُس کی اتنی کی بات نہ عمارتی تو۔“ لود گھبرا کر شان نے منہ کھول دیا۔

”مبارک ہو بیٹا۔“ سکینہ بیگم نے کہا۔

ناہرنے ایک نظر پھر شان کو دیکھا۔ اور مارے بوکھلاہٹ کے شان۔

سکینہ بیگم کا شکر یہ بھی ادا نہ کر سکا۔

سکینہ بیگم پلیٹ میز پر رکھ کر۔ سامنے والے صوفہ پر بیٹھ گئیں۔

”دراصل ماما آئی تھیں ضروری خریداری کرنی تھی۔ زرین کی طبیعت کچھ سست تھی۔ وہ رک گئی اور میں ساتھ چلی گئی کہ وہ بچاری بھی ضعیف ہیں۔

اتنی دور سے آئی تھیں۔ کام بھی ضروری تھے۔ پھر اُن کو واپس بھی بھونچایا۔ اس لئے دیر ہو گئی۔ سکینہ بیگم نے کہا۔

”زی کو تو بخار ہے اچھا خاصا۔“ ناہرنے کہا۔

”کیا۔؟“ سکینہ بیگم فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”میں نے دوا دینا ہی ہے۔ آپ گھبراؤ نہیں۔ ٹھیک ہو جائے گی۔“

”میں دیکھ تو آؤں۔“ سکینہ بیگم چلنے لگیں۔

”ہم بھی آتے ہیں۔“ ناہرنے اٹھتے ہوئے شان کو بھی اٹھنے کا اشارہ کیا۔

”ارے نہیں بیٹا۔“ سکینہ بیگم چلتے چلتے رُک گئیں۔ ”وہ تو اب پردہ کرے

گی نابینے۔“ وہ شفقت سے بولیں۔

”کس سے۔ ناہرنے کہا۔

”وہ۔“ ذیشان سے۔ ”شگنی ہو جائے تو لڑکی پردہ کرنے لگتی ہے نا۔“

”ادہ۔“ ناصرتے شان کو۔ اور شان نے ناصر کو دیکھا۔

ناصر نے اتھی کی نظر بچا کر ایک آنکھ دبا دی۔

شان نے بھی چپکے سے جواباً ایک آنکھ میچ لی۔

اور سکنہ بیگم کمرے سے چل دیں۔

وہ دونوں پھر وہیں بیٹھ گئے۔

ناصر نے پیالی میں چائے ڈالی۔ اور شان سوچوں میں گم ہو گیا۔

”کچھ بولو نا۔“

”بس تم سے بہت بول لیا۔“ شان سوچوں سے ابھر کر بولا۔

ناصر نے مسکراتے ہوئے پیالی ہونٹوں سے لگالی۔

شان پھر کچھ سوچنے لگا۔

”یاد تم تو واقعی چپ ہو گئے ہو۔ بولو نا۔ کچھ۔“

”نہیں۔ اب باقی باتیں زی سے کرے گا۔“

”مگر تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ زی اب تم سے پردہ کرنے لگی ہے

اب وہ تم سے باتیں نہیں کر سکے گی۔“

”ابھی کچھ دیر پہلے تو کی تھیں۔“

”تیس سال ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کا تم سے پردہ ہے۔“

”ادہ۔“



اُس کا انداز بہت مدھر اور دل نشیں تھا۔

”چلو EAGLE HAS LANDED“ دیکھیں۔“ ناصر نے پریالی میز پر رکھ

دی۔ اور شان خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اُس کی خوب صورت آنکھیں کچھ سوچ رہی تھیں۔ کچھ تلاش کر رہی تھیں۔

”بس۔ اور نہیں دیکھتے۔“ بکچر دیکھتے دیکھتے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

شان اور ایسی بکچر نہ دیکھے۔ ناصر کو حیرت ہوئی۔

پھر دھیرے سے مسکرا دیا۔ شان بے قرار سا لگ رہا تھا۔

”پھر۔۔۔؟“

”زی کو سلوں گا۔“ وہ ناصر کو دیکھ رہا تھا۔

”یہ یورپ نہیں ہے۔“

”اوہ۔۔“

”چلو لائبریری چلتے ہیں۔“ ناصر نے کہا۔

اس نے خاموشی سے ناصر کو دیکھا۔ اور چپ چاپ ساتھ چل پڑا۔

ناصر اُسے امریکہ سے لائی ہوئی۔ چند نایاب کتابیں دکھانے لگا۔ شان نے

اُلٹ پلٹ کیں۔ پھر رکھ دیں۔

”نہیں دیکھے گا“ اُس نے سرفی میں ہلایا۔

شان۔ اور ایسی کتابوں کو نہ دیکھے؟ ناصر کو مزید حیرت ہوئی۔

پھر۔ ہوئے سے سُکرا دیا۔

شان بے چین سالگ رہا تھا۔

”پھر۔؟“ ناصر نے کہا۔

”زی سے ملوں گا“ اسٹون گریے کر سٹلز بڑی سنجیدگی سے ناصر پر جھپٹے۔

”اول ہوں“

”اوہ۔۔۔!“

”آؤ میرے بیڈ روم میں میوزک سُنیں گے۔“

اُس نے چپکے سے ناصر کو دیکھا اور ساتھ ہو لیا۔

صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے۔ آنکھیں موندے جانے دے کیا

سوچ رہا تھا۔

ناصر نے ایک نظر اُس پر ڈالی۔ وہ یکدم ہی چپ چپ سا نظر

آنے لگا تھا۔

مگر۔ زی کا پردہ تو اُس سے عارفی ہی تو تھا۔ تھوڑے ہی

غصے کی بات تو تھی۔

”بس ناصر! اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ انداز ملتتی تھا۔

”شان اور۔ BOB MORLEY کو نہ سُنے۔

ناصر کو اچنبھا ہوا۔ پھر لب مبتسم ہو گئے۔



شاہی بے گل سالک رہا تھا۔

”پھر۔۔!“

”زی۔“ اُسے ایک ہی دھن سوار تھی۔

”THIS, IS NOT POSSIBLE۔ یار۔“ ناصر جھنجھلا اٹھا۔

”اوہ۔“ جھنجھلا کر شان نے ہاتھ میں پکڑا ایکٹ پرے پھینک دیا۔

”آؤ۔ باہر بیٹھیں۔“ ناصر بولا۔

اُس نے ایک تیز نظر ناصر پر ڈالی۔ اور پاؤں پٹختا سا تھک ہوا۔

دونوں۔ باہر چمن میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

وہ خالی نظریں ادھر ادھر دوڑا رہا تھا۔

ناصر سمجھ رہا تھا۔ ایک عرصہ بعد اُسے زی ملی تھی۔ بالکل اُس کی اپنی

بن کر۔ وہ ابھی اس حقیقت سے اچھی طرح لطف اندوز بھی نہ ہو پایا تھا۔

کہ انی نے آکر زی کے پردے کا حکم صادر فرما دیا تھا۔

مگر۔ وہ کبھی کیا سکتا تھا۔ جوانی کا حکم تھا وہی ہونا تھا۔

”ناصر۔“ تھوڑی ہی دیر بعد اُس کی اُلتائی سی آواز آئی۔

”اب کیا ہے۔؟“

”یہاں اور نہیں بیٹھتے۔“

”پھر۔۔؟“

”زی۔!“ اُس کی وہی ایک رٹ تھی۔

”نان کسٹس۔ تم آئندہ یہاں نہیں آؤ گے“ ناصر نے میز پر مٹک مارا۔

”اوہ“ اُس نے ناصر سے بھی زیادہ زور سے میتر بجایا۔

تھی سکیںہ بیگم پاس چلی آئیں۔

”آؤ دونوں۔ کھانا تیار ہے۔“

اور۔ ناصر نے نجات کی لمبی سانس لی۔

”اٹھو اب۔ ناصر نے کہا۔

شان نے ایک خشمگین نظر ناصر پر ڈالی۔ سکیںہ بیگم آگے آگے چل

دیں۔ ناصر اور شان پیچھے پیچھے تھے۔

میتر پر تکلف کھانوں سے سجا ہوا تھا۔ تینوں بیٹھ گئے۔

شان اب بھی اُلجھا اُلجھا سا تھا۔

”یہ لو۔“ ناصر۔ شان کو کوفتوں کی دُش پیش کرتے ہوئے بولا۔

شان نے ایک نظر اُسے دیکھا۔

دُش اُس کے ہاتھ سے لٹی۔ اور دور اُتی کی طرف رکھ دی۔

”اوہ“ ناصر مسکرایا۔ شان کھانے میں مصروف ہو گیا۔

خاموشی سے کھاتا رہا۔ ناصر سے کوئی بات نہیں کی۔ سکیںہ بیگم کی باتوں کا

البتہ بہت موڈ پر طریقے سے جواب دیتا رہا۔

”یہ جناب اندڑوں کا ہلوہ۔ اُتی کے ہاتھ کا بنا ہوا“ ناصر نے اُسے

ہلوہ پیش کیا۔ شان نے ایک نظر سکیںہ بیگم کی طرف دیکھا۔ وہ ملازمہ

سے کچھ کہنے میں مصروف تھیں۔

پھر۔ ناصر کو دیکھا۔ چپ چاپ دُش اُس کے ہاتھ سے لے لی۔



اور ہاتھ بڑھا کر دُور اُسے بھی سکیٹہ بیگم کے قریب رکھ دیا۔

ناھر۔ پھر مسکرایا۔ تو گویا عتاب ناھر پر ہی تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد۔ خود ہی ہاتھ بڑھا کر شان نے وہی دُش اٹھالی۔

اور ناھر کو دیکھتے دیکھتے حلوہ اپنی پلیٹ میں ڈالنے لگا۔

ناھر اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔

انسان چاہے کتنا ہی سنجیدہ اور مدبر ہو۔ لاشعوری طور پر اپنے بچپن

میں کبھی کبھی لوٹتا ضرور ہے۔ شان اس وقت اُسے محض چار پانچ سال کا

بچہ معلوم ہوا۔ روٹھی روٹھی شکل لئے۔ وہ وہی سب کچھ وہیں سے اٹھا

اٹھا کر کھا رہا تھا۔ جہاں وہ ناھر کے ہاتھوں سے قبول نہ کرتے ہوئے تھوڑی

دیر پہلے رکھتا جا رہا تھا۔

گویا۔ سارا قصور ناھر کا تھا۔

سکیٹہ بیگم نے سبز چلنے کی پیالی اُس کی طرف بڑھائی۔ تو اُس نے خوشی

خوشی تمام لی۔ کھانے کے بعد بھی تھوڑی دیر باتیں ہوتی رہیں۔

”اتنی۔ اب ہمیں اجازت دیں۔ سوئیں گے جا کر۔“ بالآخر ناھر اٹھ کھڑا ہوا۔

”صبح سویرے جگا دیں۔ میں نے ڈیوٹی پر جاننا ہے۔ اور شان کو ماماؤں

جان کی خدمت میں حاضری دینی ہے۔“

شان بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

”اوہ ناھر بولا۔ اور دونوں ساتھ ساتھ نکلے۔ اور پھر باقی کردار

قد سے ہٹ کر ایک طرف بنے ناھر کے بیڈروم میں داخل ہو گئے۔

تھکے ہوئے تو تھے ہی۔ جلدی ہی دونوں سو گئے۔

صبح اذان کے وقت سکینہ بیگم نے دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر  
دونوں کو بیدار کیا۔ ناہرا ٹھکرائی کی طرف آگیا۔  
اودھان وہیں ہاتھ روم میں گھس گیا۔

صبح ہونے والی تھی۔ ہر طرف ہلکی ہلکی سپیدی نمودار ہو رہی تھی۔  
سینکڑوں پرندے ایک ساتھ چہچہا رہے تھے۔ وسیع چمن کے گرد گلابوں کی  
بار میں۔ ڈیوڑھی کی طرف جاتے راستے کے دونوں طرف لائے لائے۔  
قد آور درختوں میں۔

عجیب پاکیزگی تھی۔ پورے ماحول میں۔

برآمدے میں تخت پر بیٹھیں سکینہ بیگم نماز کے بعد صبح کے دانے پھر کر  
عقیدت سے ایک طرف رکھ رہی تھیں۔

تجھی ادھیڑ عمر ملازمہ چائے کی ٹرے لئے آگئی۔ سکینہ بیگم کو منہ اندھیر  
ہی چائے کی طلب ہونے لگی تھی۔ ٹرے کے کراہنوں سے وہیں تخت پر رکھ  
دی۔ منہ ہاتھ دھو کر ناہر بھی اُدھر ہی آکر بیٹھ گیا۔

”بیٹا تم بھی ایک پیالی پی لو۔ ناشتہ بعد میں کر لینا۔ اتنی سے پہلے اُس  
کے لئے پیالی بھری۔“

”ادھ گڑ۔ اتنی۔ شان کے لئے بھی...“ اور۔ اُس کی نظریں

دُور دائیں طرف اپنے بید روم کی جانب اُکھٹیں۔



زرین جائے نماز تہہ کرتی آہستہ آہستہ ناصر کے بیڈروم کے ساتھ ساتھ  
 چلتی اسی سمت آرہی تھی۔ اور غین اُسی لمحہ۔  
 بیڈروم کے اُسی رخ والی کھڑکی میں سے زرین کے بالکل آگے۔  
 شانِ نہایت اطمینان سے کودا تھا۔  
 چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھا تھا۔  
 جلدی جلدی کچھ بولا تھا۔  
 پھر جیب ٹٹولی تھی۔ کچھ نکالا تھا۔  
 زرین کا ہاتھ تھا ماما تھا۔ کچھ پہنایا تھا۔  
 یقیناً سنگنی کی انگوٹھی تھی۔  
 ادھر ناصر کو۔ لگا۔  
 کل شام۔ اُس کی شان کی رکھوالی۔  
 اور اُس سے منغز ماری۔  
 سب رائیگاں گئے تھے۔

ختم شد